بسم الله الرحمن الرحيم

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ

كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

وَهَٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ

قرآن کریم، سوره انعام، آیات ۱۲۵، ۱۲۶

اسلامی علوم ومعارف اور علمی وثقافتی افکار وعقائد کا ترجمان

شمارہ ۲۰۵، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷

رسول رحمت
حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

چیف ایڈیٹر

ڈاکٹر سید عبد الحمید ضیائی

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون : ۳۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲، فیکس : ۲۳۳۸۷۵۴۷

newdelhi@icro.ir

http://newdelhi.icro.ir

فہرست

پیغمبر اکرمؐ کی گرانقدر میراث	اداریہ	۷
فتح مکہ	پروفیسر سید احتشام حسین	۱۱
صلح حدیبیہ اور اس کے سیاسی اور اخلاقی پہلو	علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	۱۸
رسولؐ اسلام کے کردار کا سیاسی مطالعہ	مرزا جعفر حسین مرحوم	۲۶
اسلامی قومیت کی تشکیل کے لیے پیغمبرؐ اسلام کا آخری منشور	پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی	۳۹
معاہدۂ صلح حدیبیہ کا متن	آیت اللہ جعفر سبحانی	۴۵
مرسل اعظم قوم گری کی سنگلاخ وادی میں	مولانا سید غلام عسکری مرحوم	۵۷
رسول اسلامؐ کے اہم غزوات اور ان کے اسباب	علامہ سید محمد صادق مرحوم	۶۸
مکتوبات پیغمبر	مولوی محمد باقر	۷۴
پیغمبر عظیم الشان کی سیرت و شخصیت	پروفیسر شاہ محمد وسیم	۱۰۳
معجزات رسولؐ، جدید تصورات کی روشنی میں	ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی	۱۱۳
کاروان اخلاق کا پڑاؤ	سید کاظم رضا	۱۲۱
قرآن کریم معجزۂ نبوت ہے	مولانا سید حسن مہدی رضوی	۱۳۰
حجۃ الوداع	مولوی محمد باقر	۱۳۹
صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک	ڈاکٹر سید مجتبےٰ احسن کاموپوری	۱۴۶
رحمۃ اللعالمین حضرت رسول پاک کی انسانیت نوازی	مولانا سید محمد رابع حسن ندوی	۱۸۴
مبلغ اعظمؐ کی روش تبلیغ	مہدی باقر	۱۹۰

ثقافتی سرگرمیاں:

جشن مولود کعبہ	حیدرآباد	۱۹۶
امیر خسرو دہلوی کے ہندوی کلام پر خصوصی خطبہ	ایوان غالب، دہلی	۱۹۸
کشمیر یونیورسٹی میں نواں دورۂ دانش افزائی	کشمیر یونیورسٹی	۲۰۰

کتابوں کا تعارف: نقد وتبصرہ

Calendar of Dr. Zakir Husain's Corespondence	ڈاکٹر محمد سجاد	۲۰۴
منشآت برہمن	چندربھان برہمن	۲۰۹
مقالات عرفان	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۲۱۲

اداریہ

پیغمبر اکرمؐ کی گرانقدر میراث

پیغمبر اسلام نے ایسے ماحول و معاشرہ میں توحید کو اپنی دعوت اسلامی کی بنیاد قرار دیا تھا جہاں مختلف فرقوں اور مذہبی وفکری میلانوں کا دور دورہ تھا۔ اس دور کے لوگوں نے دنیا والوں کے لئے ایسے خداتراش لئے تھے جن میں عقل وخرد کا گزر ہی نہ تھا اور یہ خدا تفرقہ و اختلاف اور رسوائی و نادانی کے بھنور کا روپ اختیار کر چکے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی نجات بخش دعوت اسلامی کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں ایسے مصائب جھیلے کہ صبر و فداکاری کی آخری منزلوں پر فائز ہوتے ہوئے بھی ان کی زبان سے یہ کلمات جاری ہوگئے۔ ''دنیا میں جتنے مصائب میں نے جھیلے ہیں کسی دوسرے نبی نے اتنے مصائب نہیں جھیلے''۔[1]

انہوں نے شرک کی اعلانیہ تردید کرتے ہوئے بت پرستی کو فعل عبث قرار دیا اور اپنی رسالت کی جامع بنیاد یعنی توحید کو گہرائی اور گیرائی عطا کرنے کے لئے اپنے تبلیغی مشن کی شروعات کی۔ پیغمبر نے شرک کے خلاف اپنی معرکہ آرائی کے دوران اس کی ظاہری علامتوں کی نابودی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے حقیقی محاذوں یعنی انسانی نفس وقلب تک اپنی معرکہ آرائی کا سلسلہ جاری رکھا اور مؤمنوں کے قلوب کو ہر طرح کی پریشانیوں اور وسوسوں سے پاک کردیا۔ وہ شرک کی تعریف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''شرک اندھیری رات میں کالے پتھر پر رینگنے والی کالی چیونٹی سے بھی زیادہ پنہاں ہے''۔[2]

شرک کی پیروی اور اندھیری رات میں اس کے خفیہ اڈوں پر موجود شرک کی علامتوں کے خلاف معرکہ آرائی کے خطرے کے خیال سے زیادہ طاقتور خیال اور کیا ہوسکتا ہے؟ اور اس احساس سے بہتر دوسری کونسی طاقت ہوسکتی ہے کہ اسے اپنے دل کی کمین گاہ میں موجود اور نفس میں شامل مشرکانہ خطروں کا بھرپور مقابلہ کرنا ہے۔ اس فکر نے لوگوں کو فکری الوہیت سے نجات فراہم کردی اور تاریخ بشریت میں پہلی بار فکر و خیال کو حقیقی اور بہتر آزادی حاصل ہوگئی اور اس نے بتوں کے کھنڈر سے گزرتے ہوئے علم کی منزل تک جانے والے راستہ کو پوری طرح نمایاں کردیا۔ اب دریاؤں،

۱- بحارالانوار، ج ۳۹، ص ۵۵ ۲- بحارالانوار، ج ۱۸، ص ۱۵۸

پہاڑوں اور ستاروں کو ایسی اہم سرحدوں کی حیثیت حاصل نہ تھی کہ فکر فقط قدامت اور پاکیزگی کی بھاری بھرکم زنجیروں کے ساتھ ان سے قریب ہو سکے۔ پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو علم حاصل کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ علم کو لوگوں کی بھلائی کے لئے استعمال کریں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہیں فطرت کے قفل کو کھولنے کے لئے غور و فکر اور تجربہ سے استمداد کی تلقین بھی کی اور انہیں حکم دیا کہ "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ گہوارہ سے قبر تک علم کی جستجو میں صبر و ثبات قدم کے ساتھ اپنی کوشش جاری رکھو۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ نے بیہودہ اور خرافات سازی کی بھرپور روک تھام کی اور اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی کہ سادہ طبیعت لوگ خوف و تقدس کے پردہ میں پوشیدہ مبہم عقائد کو قبول کر لیں کیونکہ یورپ میں صورتحال بالکل ایسی ہی تھی۔ عہد وسطیٰ میں دانشمندوں اور آزادی طلب لوگوں کو سخت تنبیہات کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ گیلیلیو، کوپرنیکس اور ڈیکارٹ جیسے سیکڑوں دیگر فلسفیوں و دانشوروں کی داستان آج بھی لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہے۔ یہ فرہنگ و ثقافت اور تہذیب و تمدن زمین و آسمان کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے اور فرد و سماج کو پروردگار عالم کے ساتھ دائمہ اور متصل کر دیتی ہے۔ قدامت اور طاقت سے آمیختہ اس معرفت خداوندی کے ساتھ محکم اور اٹوٹ رشتہ انسان کے جملہ جذبات کا تسلی بخش جواب فراہم کرتا ہے۔

ان تمام مثالی صفات سے مالا مال اسلام اس بات کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہ انسان کی عقل سلیم پر پردہ نہ پڑنے پائے اور انسان کو اس کی اپنی تحقیق اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے حوادث کے سلسلے میں غور و فکر اور زندگی کے مختلف شعبوں اور مملکتوں کی شناخت کے لئے عقلی کوششوں سے بالکل نہیں روکتا ہے۔ یہ وہ فرہنگ و ثقافت ہے جو خدای واحد لاشریک پر اعتقاد و ایمان کی بنیاد پر قائم اور استوار ہے۔ وہ خدا جو دنیا کی کسی مخلوق یا کسی فرد واحد کے ساتھ خصوصی نسبت اور دوستی و قرابت داری کا حامل نہیں ہے، دنیا کی کسی بھی مخلوق کے ساتھ اس کا کوئی خصوصی رشتہ و رابطہ نہیں ہے اور پوری دنیا اپنی جملہ صفات و خصوصیات قانون علت و معلول اور مرضی معبود کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور جس کی مشیت دنیا کی تمام مخلوقات کو اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ فراہم کرتے ہوئے کبھی بھی مسببات کے ساتھ اسباب کے ارتباط اور معلول میں علت کی تاثیر کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتی ہے۔

۳۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران پیغمبر اکرمؐ کی شان میں غیر مہذب، بزدلانہ اور گستاخانہ حملات کا

مشاہدہ کیا جاچکا ہے۔ ڈنمارک اور ناروے کے اخباروں میں پیغمبر اسلام کے خلاف اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت سے فقط دنیا کے مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ تمام دینداروں کو بھی غیر معمولی تکلیف ہوئی ہے۔ ان تصویروں کی اشاعت اور اسلام و مسلمانوں کے مقدسات کی توہین پر مبنی دیگر اقدامات کا مقصد صرف مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا نہیں ہے بلکہ انہیں اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے ردعمل کا مظاہرہ بھی کریں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس قسم کے جاہلانہ اقدام ادیان و مذاہب اور ثقافتوں و تمدنوں کے درمیان گفتگو جیسے منصوبوں کی تقویت میں رکاوٹ پیدا کردیتے ہیں جس کے نتیجے میں ''مذاہب کے درمیان بات چیت'' پر مشتمل مذہبی مراکز کے فیصلوں کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا ہے۔

فصلنامہ ''راہ اسلام'' کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا موجودہ شمارہ پیغمبر اعظم کی زندگی اور ان کی سیرت پر مبنی مضامین و مقالات پر مشتمل ہے جس میں خداوند عالم کے اس آخری نبی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بارگاہ عالیہ الٰہی میں دعا ہے کہ ہم لوگ آنحضرت کی معنوی تائید وحمایت سے زیادہ سے زیادہ مالا مال رہیں۔

آخر کلام میں فصلنامہ ''راہ اسلام'' کی راہ و روش میں بعض تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس رسالہ کے سابق چیف ایڈیٹر جناب محمد حسین مظفری نے اس کی افادیت کو بڑھانے اور اس کے معیار کو بلند بنانے کی بھرپور کوشش کی اور اس سلسلے میں بڑی زحمتیں بھی برداشت کیں جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنا اور بارگاہ خداوندی میں ان کی سلامتی اور توفیقات میں اضافہ کے لئے دعا کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ اس فصلنامہ کے موجودہ چیف ایڈیٹر جناب ڈاکٹر سید عبدالحمید ضیائی کا ارادہ ہے کہ آئندہ شماروں میں ''الٰہیات کو ہنر وفن اور تمدن و ثقافت کے جھروکے'' سے دیکھا جائے اور الٰہیات کی فقہی اور کلامی راہ و روش کے ساتھ ہی ساتھ اس شاہد قدسی کی دوسری تجلیوں کا بھی مشاہدہ کیا جائے جو نہایت دلکش و خوبصورت ہے اور جس کی طرف سے ہم لوگ کسی حد تک غافل بھی رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اس ضمن میں ہم لوگوں نے ان عرفانی اور فلسفیانہ پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ہے جو الٰہیات کے سرسبز اور ثمرخیز باغات کی طرف کھلنے والی دلکش کھڑکیاں ہیں۔ بہرحال ''راہ اسلام'' کے آئندہ شماروں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کو ان پہلوؤں سے بھی دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

موجودہ شمارہ کے بعد منظر عام پر آنے والے دوسرے شمارہ میں مولانا جلال الدین محمد بلخی المعروف بہ مولانا روم کے دینی افکار وعقائد کا مطالعہ وتجزیہ کیا جائے گا۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اسلامی الٰہیاتی تجلّی کے مختلف پہلوؤں کو ان کی شعری و نثری تخلیقات میں تلاش کیا جائے۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ سے وابستہ عالمی ثقافتی تنظیم UNESCO نے سال رواں کو ''مولانا روم کا سال'' قرار دیا ہے اور اس موقع پر ساری دنیا میں عالمی کانفرنس، سیمنار، مذاکرات اور عالمی اجتماعات کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ بہرحال فصلنامہ کے آئندہ شماروں میں اسلامی فلسفہ وعرفان کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کا بھی تجزیہ کیا جائے گا۔ امید ہے کہ فصلنامہ ''راہ اسلام'' سے وابستہ مفکرین اور دانشور حضرات اپنے گرانقدر علمی وتنقیدی مقالات کے ذریعہ علمی تعاون کی روایت کو قائم رکھیں گے اور فصلنامہ ''راہ اسلام'' آئندہ بھی ترقی اور مقبولیت کی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

والسلام

فتح مکہ

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب (مرحوم)

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے پہلے مکہ کی تاریخ جو بھی رہی ہو، اس کے اصل عروج کا سلسلہ انھیں بزرگوں کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ خدا کے گھر کی تعمیر نے اسے جو شرف بخشا وہ تہذیب انسانی میں ایک زبردست موڑ کا پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ایسے ہاتھوں سے پڑی جس نے نہ صرف بت شکنی کی تھی بلکہ ستارہ پرستی کے تصور کو ٹھکرا کر وحدانیت کا راستہ دکھایا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ پرستی کے دورِ عروج میں شمس و قمر کی ربوبیت کا انکار کر کے قدیم افکار انسانی پر کاری ضرب لگائی اور مصر و عراق کے بہت سے علاقوں کی سیر کرنے کے بعد مکہ کی سرزمین کو دین حنیف کا مرکز بنانے کی آرزو کی۔ تاریخ کی بہت سی عجوبہ کاریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس مقدس عمارت کو اصنام پرستی کے خلاف ایک علامت بنا کر پیش کیا گیا تھا چند ہی صدیوں کے اندر وہ جاہلیت کے اندھیرے میں غرق ہوگئی اور بتوں کی ایسی آماجگاہ بن گئی جس نے وحدانیت کے ہر تصور کو خطرے میں ڈال دیا۔ اس دوران میں اگر اخلاقی اور روحانی حیثیت سے مکہ کا زوال ہوا تو مادی نقطۂ نظر سے اسے مخصوص عروج حاصل ہوا۔ عرب کا مرکزی مقام بن جانے کی وجہ سے اس کی تمدنی زندگی میں چہل پہل بڑھتی رہی، مخصوص تیوہاروں کے مواقع پر سارے عربی قبائل اکٹھا ہوتے، تجارت کی گرم بازاری ہوتی رہی معاہدوں اور مناقشوں کی تجدید ہوتی، ادبی اور شاعرانہ سرگرمیاں بڑھتیں اور شام و فلسطین، عراق و یمن سے تجارتی اور تمدنی رابطے استوار کیے جاتے، اس طرح مکہ کو ام القریٰ کی حیثیت ملتی جارہی تھی۔ یقیناً ایسے ہی مراکز تاریخ میں کوئی فیصلہ کن کردار بنتے ہیں اور اہم مقام حاصل کرتے ہیں۔

ابراہیمی خانوادے کی سرگرمیاں اس علاقہ میں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ بنی قریش کی ایک شاخ نے اپنی ذاتی خصوصیات، تجارتی سوجھ بوجھ، مہمان نوازی، شجاعت اور سخاوت کی وجہ سے مکہ کی سرداری حاصل کرلی اور مکہ تاجروں اور سیاحوں کے لئے ایک محفوظ اور نفع بخش مرکز بن گیا۔ اس

کی عظمت اور اہمیت کا دوسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب قیادت ہاشم کے ہاتھ میں آئی۔ خانۂ کعبہ پھر دارالامان بن گیا۔ گو بت پرستی کا استیصال نہ ہوسکا لیکن دین حنیف کے ماننے والے ابراہیم کی بشارت کا انتظار کرنے لگے۔

چھٹی صدی عیسوی نے ابھی اپنی سات دہائیاں پار کی تھیں کہ مکہ میں ایک نئی روشنی نمودار ہوئی صحرائے عرب کی قسمت جاگی اور مکہ کے سب سے مقتدر گھرانے میں عبدالمطلب کے مرحوم بیٹے عبداللہ کے یہاں رسولؐ اللہ نے آنکھ کھولی۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے بعد سے کعبہ اپنے حقیقی وارث کے انتظار میں تھا لیکن ابھی جدوجہد اور آزمائشوں کی بڑی سنگین گھڑیاں درمیان میں حائل تھیں اور کعبہ کو اپنی اولین منزلت حاصل کرنے میں ابھی تقریباً ساٹھ سال کا سفر طے کرنا تھا۔ مکہ میں پیدا ہونے والے کو گھر سے بے گھر ہونا تھا، خانہ کعبہ میں اپنے مذہبی فرائض انجام دینے کے لئے موحدین کو اختیار کرنا تھا اور اسے ہمیشہ کے لئے مرکز توحید وامن بنانے کے لئے ریاضتوں کے ایک طویل سلسلہ سے گزرنا تھا۔ اسی میں رسول اسلام محمدؐ عربی کی حیات قدسی کا بڑا حصہ صرف ہوا اور اس کے لئے انھیں بہت سے معرکے جھیلنے پڑے۔

یقیناً بدر ہو یا احد، خندق ہو یا خیبر، صلح حدیبیہ ہو یا بیعت رضوان، فتح مکہ ہو یا غزوۂ موتہ، سب کا بنیادی مقصد حقیقت اسلام کو عام کرنا تھا۔ رسول کی حیات طیبہ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اقدام کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہئے اور ہر واقعہ کو ایک دوسرے سے مربوط سمجھنا چاہئے۔ اس وقت صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ تاریخی اسباب وعلل کی کڑیاں نتائج سے کس طرح جڑی ہوئی ہیں اور رسولؐ کا ہر قدم کس طرح ایک ہی منزل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ فتح مکہ پر بھی انہیں حقائق کی روشنی میں نظر ڈالنا چاہئے۔ یہ سلسلۂ اقدامات اور واقعات کی ایک ایسی مضبوط کڑی ہے جس سے ۸ ہجری سے پہلے کی تاریخ اسلام، بعد کے واقعات سے ہم رشتہ ہوگئی ہے۔

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن فتح مکہ پر غور کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس سے پہلے اسلام تاریخ ارتقاء کی کس منزل میں تھا تاکہ اس فتح کا پس منظر واضح ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت کے بعد ہی سے قریش کے مظالم اور اسلام سے مخالفت کی نوعیت بالکل بدل گئی تھی۔ جب تک رسولؐ مکہ میں تھے اس وقت تک ان کے مخالفین کو یہ امید تھی کہ آخر کار اسلام کی ابتدائی قوت کا استحصال کرلیں گے۔ جاہلی اور قبائلی جذبات کو بھڑکا کر محمدؐ عربی کے دعوائے پیغمبری کو گمراہ کن

دلائل کا نشانہ بنالیں گے لیکن جب اسلام کو مدینہ میں پناہ مل گئی تو قریش کو اندازہ ہوا کہ اسلام کے لئے زمین ہموار ہورہی ہے۔ اس کی طاقت میں اضافہ ہورہا ہے۔ رسولؐ اسلام کی آواز کی گونج بڑھ رہی ہے اور اثر ونفوذ کا دائرہ وسیع ہورہا ہے۔ اس لئے مخالفت کا دائرہ بھی وسیع ہوگیا۔ مہاجرین مکہ نے بے گھر ہوکر ہمت نہیں ہاری اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر محنت اور مشقت، تجارت اور مزدوری کی مدد سے اپنی حالت سنبھال لی۔ انصار نے جس کشادہ دلی سے انھیں اپنے یہاں جگہ دی تھی اس نے پہلے ہی دلاسائی کی صورت پیدا کردی تھی۔ اب مادی حالات کے بہتر ہوجانے کی وجہ سے انھیں اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے مواقع بھی نظر آنے لگے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان آمدورفت کی وجہ سے قریش کو ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی خبر ملتی رہتی تھی اور مسلمانوں کا وجود ان کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ چنانچہ تصادم کی کھلی ہوئی صورتوں کا امکان زیادہ ہوگیا۔ رسول مقبول اس سے غافل نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مکہ کے قریش قبائل کسی نہ کسی وقت ان کے سکون میں خلل انداز ہوں گے۔ انھیں یہ خبریں بھی برابر ملتی رہتی تھیں کہ وہ لوگ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں جو مکہ اور نواح مکہ میں رہ گئے ہیں بلکہ جن کے عزیز و اقارب مدینہ میں ہیں انھیں بھی تکلیفیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود رسول مقبول نے قریش کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر کی صورت پیش آگئی یہ جنگ اگرچہ مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش کی جنگ تھی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے بہت سے سردار مارے گئے اوران کی قوت گھٹ گئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ابوسفیان اور اس کے حلیفوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقعہ مل گیا۔ قبل اس کے کہ مسلمان سنبھلیں، قریش نے پھر معرکہ آرائی شروع کردی اور مقتولین بدر کا انتقام لینے کے لئے مدینہ کا رخ کیا۔ اور احد کی جنگ پیش آئی۔ اس کا بھی نتیجہ اسلام کی فتح اور زیادہ قوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دوسرے الفاظ میں مدینہ کو نقصان پہنچائے بغیر قریش مکہ کی طاقت گھٹتی جارہی تھی اور وہ منزلیں قریب آتی جارہی تھیں جب مسلمانوں کا داخلہ مکہ میں فاتحانہ ہونے والا تھا۔

ایک لحاظ سے مکہ میں مخالفین اسلام شکستوں کے باوجود فائدہ میں رہتے تھے۔ حج کے زمانے میں اور بعض دوسرے اجتماعات میں قبائل عرب مکہ میں اکٹھا ہوتے تھے اور کفار قریش کو موقع ملتا تھا کہ وہ اسلام کے خلاف انھیں بھڑکائیں۔

اسلام کے محدود اثرات نے بھی عربوں کی جہالت کا خاتمہ نہیں کیا تھا اس لئے وہ بڑی آسانی

سے ابھارے جاسکتے تھے۔ چنانچہ احد کے بعد دو ڈھائی سال کے درمیان متعدد چھوٹے چھوٹے سرایا اور غزوات میں اسلام کو الجھایا گیا۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جن میں قریش اور یہود نے سازش سمجھوتے کرلئے تھے تاکہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر سے نجات حاصل کرسکیں ۔ اس کے سبب سے بھیانک شکل غزوۂ احزاب میں نمودار ہوئی جو ہجرت کے پانچویں سال پیش آئی۔ اس خوفناک لڑائی میں رسول اسلام نے غیر معمولی سیاسی اور عسکری سوجھ بوجھ سے کام لے کر فتح حاصل کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد مکہ کے قریش نے اپنے اوپر اعتماد کھودیا اور بہ ظاہر خاموش ہوگئے۔ رسولؐ مقبول نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ایک نفسیاتی جنگ چھیڑ دی۔ مسلمانوں کے ایک خاصے بڑے گروہ کو ساتھ لے کر آپ نے مکہ کا رخ کیا اور عمرہ کا احرام باندھا اپنے ساتھ نہ فوجی ساز و سامان کیا نہ جنگ و جہاد کی فضا پیدا ہونے دی۔ اس کا مقصد جہاں ایک طرف مذہبی فریضہ کی ادائیگی تھی وہاں دوسری طرف مکہ میں مخالفت کے طلسم کو توڑنا اور دشمن کی قوت کا اندازہ لگانا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریش جنگ کے لئے کوئی بہانہ نہ پیدا کرسکے اور صلح پر مجبور ہوئے۔ یہاں اس صلح کے مختلف پہلوؤں یا اس کے تعمیری انداز کا ذکر کرنا نہیں ہے صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کسی صلح کو (جسے کچھ لوگ دب کر صلح کرنا سمجھتے ہیں) فتح مبین کہا گیا ہے تو وہ یہی صلح ہے جس میں بہ ظاہر مسلمان مکہ میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ صلح حدیبیہ کے متعلق کسی کو کتنا ہی شک کیوں نہ ہو اس نے مستقبل کی کامیابی کے دروازے کھول دیے اور ایک ایسی قابل اطمینان فضا پیدا کردی کہ رسول مقبول کو اگلے دو برسوں میں اسلام کا پیغام دور دراز ملکوں میں پہنچانے کا موقع مل گیا اس صلح نے جنگ کے بغیر اگلے سال حج کی امید پیدا کردی اور بہت سے مہاجرین کے دل اس مسرت سے بھر دیئے کہ وہ آٹھ سال بعد اپنے وطن کی گلیوں میں پھرسکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صلح نے قریش کے ہاتھ کمزور کردیے۔

۷ ہجری میں خیبر کی مہم پیش آئی۔ اس کا تفصیلی ذکر کتب تواریخ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود ہے کہ فتح خیبر سے یہودیوں کی طاقت ختم ہوگئی اور اسلام اتنا مضبوط ہوگیا کہ اس کی شکست اور ناکامی کا خواب دیکھنے والے خوفزدہ ہوگئے اور یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ خوفزدہ لوگ گھبراہٹ میں جلد جارحانہ کارروائیوں پر اتر آتے ہیں چنانچہ پسپا ہوتے ہوئے قریش کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔ اور یہ بھی طے ہوگیا تھا کہ سارے قبائل آزاد ہوں گے۔ جن کا جی چاہے قریش کے ساتھ ہو جائیں اور جن کا جی چاہے اسلام کے ساتھ ہو جائیں۔

چنانچہ بنو بکر نے قریش سے معاہدہ کرلیا اور بنی خزاعہ نے مسلمانوں سے۔ یہ دونوں قبیلے پہلے سے ایک دوسرے کے مخالف چلے آرہے تھے۔ اور ان کے درمیان چھیڑ چھاڑ جاری تھی کہ بنو بکر نے سرداران قریش کی مدد سے بنی خزاعہ پر حملہ کردیا۔ یہاں تک کہ بنی خزاعہ کو حرم کے اندر بھی پناہ نہیں ملی اور ان کے متعدد افراد قتل کردیئے گئے۔ بنی خزاعہ نے اس حادثہ کی اطلاع رسولؐ اللہ کو دی اور مدد کے لئے استغاثہ کیا۔ رسولؐ نے چند شرائط پر معاملات کو ختم کرانا چاہا۔ لیکن قریش نے اپنے زعم میں ان شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ ابوسفیان کو اب اسلام کی قوت کا اندازہ ہو چکا تھا اور اس نے اپنی جانب سے مدینہ میں یہ اعلان کردیا کہ ہم صلح حدیبیہ کی تجدید چاہتے ہیں۔ چونکہ ان میں سردارانِ قریش شامل نہیں تھے اس لئے مسلمانوں نے اس اعلان تجدید کو اہمیت نہیں دی اور بنی خزاعہ کی اعانت کے خیال سے جنگی تیاریاں شروع کردیں۔ اس دفعہ محمدؐ عربی نے اسلام کے عسکری نظام میں تیاریوں کو دشمن سے خفیہ رکھنے کی اہمیت پر زور دے کر یہ واضح کیا کہ فوجی تیاریوں سے اعلیٰ دشمن میں نفسیاتی انتشار پیدا کرتی رہتی ہے۔

قریش مکہ اتنا خوفزدہ ہو چکے تھے کہ ممکن ہے بغیر کسی مدافعت کے ہمیں مکہ میں داخل ہونے کا موقع دے دیں۔ آپ نے اپنے ان اتحادی قبائل کو بھی اپنے ارادہ سے مطلع کردیا۔ جو اسلام کے حلیف بن چکے تھے۔ اس درمیان ایک صحابی نے کمزوری دکھائی اور تیاریوں کی اطلاع مکہ بھیجنے کی کوشش کی جسے حضرت علیؓ نے ناکام بنادیا۔ یہ صحابی حاطب تھا جس کی خطا بعد میں معاف کردی گئی۔

جب تیاری مکمل ہوگئی تو دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ رسولؐ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور جب مکہ صرف ایک منزل رہ گیا تو قیام کا حکم دیا۔ اب قریش چونکے۔ ابوسفیان نے پوری خبر لانے کا ذمہ خود لیا۔ اپنی آنکھوں سے اس نے افواج اسلام اور اللہ کے دین کا جو تزک و احتشام دیکھا اس نے اسے حیرت زدہ کردیا۔ یہ صرف ایک جلا وطن اپنے وطن میں نہیں آرہا تھا، ایک پیغام حیات، ایک نظام زندگی، ایک طوفان رحمت اس علاقہ میں داخل ہورہا تھا۔ جہاں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ابوسفیان نے گھبرا کر عباس سے پوچھا یہ کون ہے، انھوں نے جواب دیا یہ رسولؐ اپنے انصار و

مہاجرین کے ساتھ آرہے ہیں۔ علم لشکر سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا اور رسولؐ کے گرد جان نثاروں کا ہجوم تھا۔ ابوسفیان نے کہا۔ آج تو تمہارے بھتیجے کا جاہ جلال بہت بڑھ گیا ہے۔

در اصل یہ اعتراف شکست تھا کیونکہ قریش مکہ میں اس سیل نور ورحمت کو روکنے کی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ رسولؐ مکہ میں فاتحانہ لیکن پُر امن طریقہ سے داخل ہوگئے۔ حکم ہوگیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے، اپنے گھر کے دروازے بند کرلے، خانہ کعبہ میں یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اس کو امان ہے، اس دن محمدؐ مجسم رحمت اللعالمین بن کر داخل ہورہے تھے۔ اسی لئے جو ایک معمولی سی جھڑپ ہوگئی آپ کو وہ بھی پسند نہ آئی۔ اور جب ابوسفیان نے سعد ابن عبادہ کے ایک حملہ کا حوالہ دے کر یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید سعد کی نیت امن و امان اور رحم وکرم کی نہیں ہے تو آپ نے بقول خلدون علم لشکر سعد سے لے کر علی بن ابی طالب کو دے دیا تاکہ کفار وقریش کے دل سے ہر طرح کا خوف رفع ہوجائے۔

مکہ میں پرامن داخلہ حقانیت اسلام کی بڑی فتح تھی۔ کیونکہ یہی سارے عرب میں صنم پرستی کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے کعبہ میں مٹی اور پتھر کے تودوں کے سامنے انسانی وقار کی تذلیل ہورہی تھی، ہر طرف بت ہی بت تھے۔ طاقتوں پر، محراب میں، چھت پر، دیواروں پر تصویریں تھیں۔ رسولؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان بتوں اور تصویروں کا خاتمہ کیا، حضرت علیؑ تمام جہادوں کی طرح اس جہاد میں بھی پیش پیش رہے۔ پھر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں وحدانیت پر سب سے زیادہ زور تھا۔ اس وقت ان کے سامنے وہ جباران قریش کھڑے تھے جنھوں نے کل تک کسی نہ کسی شکل میں رسولؐ اللہ اور اسلام کی مخالفت کی تھی۔ فطری بات تھی کہ ان کے دل انجام کے خوف سے دھڑک رہے تھے۔ وہ مخالفت اور انتقام کا وہی مشرکانہ قبائلی تصور رکھتے تھے۔ اس لئے یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ رحمت مجسم انھیں معاف کردے گا۔ چنانچہ ذہنی الجھنوں کے اس نفسیاتی عمل کے درمیان ایک بار محمدؐ عربی ان کی طرف مخاطب ہوئے اور پوچھا تم کو معلوم ہے کہ میں اس معاملہ میں کیا کرنے والا ہوں؟ غرور کا سر جھک چکا تھا۔ لیکن عربی مزاج آڑے آیا، انھوں نے جواب دیا، آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے فرزند ارجمند۔ فرمایا، تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ سب کو معاف کیا۔ اصل فتح یہ تھی جو مکہ کی شاہراہوں، گلیوں، عمارتوں اور مکانوں کی فتح سے بہت بلند اور ارفع تھی کیونکہ اس فتح نے رسولؐ اسلام کے کردار کی وہ تصویر پیش کردی جسے ابوجہل، ابولہب،

ابوسفیان اور دوسرے رہنمایان قریش نے مکہ کے عوام کے سامنے بالکل غلط رنگ میں پیش کی تھی۔

نماز کا وقت آ گیا تھا، بلال حبشی نے اذان دی۔ صفیں قائم ہوگئیں اور بڑے اطمینان سے فریضۂ عبادت ادا کیا گیا۔ پھر رسولؐ کوہِ صفا پر چلے گئے اور لوگ جوق در جوق بیعت کے لئے آنے لگے۔

یہ ہے فتح مکہ! اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ تھا ایک عمر کی جدوجہد کا جس میں جہاد بالسیف سے زیادہ جہاد بالنفس نے کام کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فتح مکہ میں رسولؐ ایک فوجی فاتح نہیں، نبی خدا دکھائی دیتے ہیں جس کا اصل کام اخلاق کی تلقین اور حقانیت کی اشاعت ہوتا ہے۔ فتح تو ایک ضمنی چیز اور حصولؐ مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد خانۂ کعبہ کو بتوں، کاہنوں اور پروہتوں سے پاک کرنا تھا۔ جب یہ کام ہوگیا تو رسولؐ پھر مدینہ واپس گئے تاکہ کچھ دن آرام کر کے اپنی اس آخری صبح کی تیاری کریں جس میں دین اسلام کی تکمیل کا اعلان کرنا تھا۔

صلح حدیبیہ اور اس کے سیاسی اور اخلاقی پہلو

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی مرحوم

ذی قعدہ الحرام ۶ ہجری دوشنبہ کا دن تھا جب رسول اکرمؐ نے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کا رخ کیا، آپ کی سیاسی بصیرت یہ بتا رہی تھی کہ کفار قریش اس اہم عبادت میں مزاحم ہوں گے اور آپ کو مکہ معظمہ میں داخل نہ ہونے دیں گے اس لیے آپ نے اپنے اصحاب کرام کو بھی ساتھ لے لیا ۱۴۰۰ افراد کا یہ قافلہ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوا اور اسلام سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے ایک نئی مشکل کا شکار ہوگیا، خیال یہ ہے کہ اتنے افراد کا یہ قافلہ دیکھ کر مشرکین کو فوراً یہ تصور پیدا ہوا ہوگا کہ لشکر اسلام مکہ پر حملہ کرنے آرہا ہے چنانچہ حضرتؐ نے ان کے اس تصور کو غلط ثابت کرنے کے لئے مقام ذوالحلیفہ پر پہنچ کر تقلید کے ذریعہ احرام باندھ لیا اور اپنے اس عمل سے مشرکین پر یہ واضح کردیا کہ میرا ارادہ صرف عمرہ کا ہے اس میں کسی جنگ و جہاد کے تصور کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود خالد ابنِ ولید نے آپ سے مزاحمت کیلئے ایک لشکر مرتب کرکے عکرمہ ابن ابی جہل کو اس کا سردار بنادیا اس لشکر میں دوسو سوار بھی تھے۔ حضرت کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے بھی عبدہ ابنِ بشر کو چھوٹا سا لشکر دے کر آگے بڑھا دیا اور اپنے طرزِ عمل سے یہ واضح کردیا کہ اسلام امن و امان صلح و سلامتی ضرور چاہتا ہے لیکن دشمن کی بڑھتی ہوئی جسارتوں پر کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ اور اپنے اس طرزِ عمل سے اسلامی سیاست کے اس پہلو کو بھی واضح کردیا کہ اسلام کا دشمن پہلے تلوار کی طاقت آزماتا ہے اس کے بعد شکست خوردہ ہوکر صلح کی پیشکش کرتا ہے اور اسلام اس کے بالکل برعکس ہے وہ ابتدائی طور پر اپنی ساری کوششیں صلح کی راہ میں صرف کرتا ہے اور آخر کار صلح سے ناامید ہوکر طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ابھی طرفین کے لشکر صف آرا نہ ہوئے تھے کہ نمازِ ظہر کا ہنگام آ گیا۔ اصحاب رسول نے اطاعت خداوندی کے لئے مصلّے بچھادیئے۔ نماز ظہر تمام ہوئی اور خالد کی فوج نے رئیس لشکر کو یہ پیغام دیا کہ مسلمان بڑے اچھے موقع سے گرفت میں آ گئے تھے لیکن ہماری غفلت سے بچ گئے۔ خالد نے کہا کہ

ایسی کوئی بات نہیں ہے ابھی عصر کی نماز باقی ہے اس وقت ان کے خضوع وخشوع سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ فوج مخالف میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رسول پر وحی نازل ہوئی اور یہ حکم دیا گیا کہ ایسے موقعے پر مسلمانوں کے دو حصے کردیئے جائیں، ایک دشمن سے مقابلہ کے لئے تیار ہو اور دوسرا نماز جماعت ادا کرے۔ اس موقع پر اسلام کی سیاست کے چند پہلو نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

۱- اسلام کسی وقت بھی اپنے مقصد اور نصب العین کو فراموش نہیں کرسکتا۔ وہ فوج دشمن میں جنگ کی آخری تیاریاں دیکھ کر اطاعت کے مصلے بچھاتا ہے تاکہ دنیا یہ سمجھ سکے کہ جنگجو کون ہے اور مقصد کا پرستار کون؟

۲- نماز کی حالت میں حملہ کرنے کی سازش یہ بتارہی ہے کہ فوج مخالف مکار، حیلہ جو اور داخلی کمزوری کا شکار ہے اس لئے کھل کے میدان میں نہیں آنا چاہتی اور رسول ایسے وقت میں بھی نماز جماعت قائم کرکے یہ واضح کر رہے ہیں کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے اور اس کی اطاعت میں وقت گزارنے والے دشمن کی مسلح طاقتوں سے نہیں ڈرا کرتے۔

۳- فوج دشمن میں حالت نماز میں حملہ کی سازش ہورہی تھی۔ رسولؐ اسلام کو سازش کی اطلاع بھی ملتی ہے لیکن آپ وحی الٰہی کے مطابق نماز قائم کرکے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اتنی تیاریوں کو دیکھنے کے بعد بھی پہل نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا اصول صرف دفاعی ہے جس کے لئے ہم نے اصحاب کے ایک حصے کو مخصوص کرلیا ہے یہ اس وقت تک میدان میں نہ آئیں گے جب تک فوج مخالف حملہ آور نہ ہوجائے۔

مقام حدیبیہ پر پہنچ کر رسول اسلامؐ نے مشرکین کی طرف سے کافی مصائب بھی برداشت کیے لیکن اس کے باوجود لشکر کو حملہ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ نہایت ہی نرم لہجے میں یہ کلمات ارشاد فرمائے: ''تعجب ہے کہ قریش اتنے مصائب برداشت کرنے کے بعد بھی اس بات پر تیار نہیں ہیں کہ عرب سے میری معاملت براہِ راست ہوجائے وہ غالب آجائیں تو ان کا مقصد پورا ہوجائے اور مجھے غلبہ حاصل ہو تو وہ سب مسلمان ہوجائیں۔ یہ قریش اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ میں ان سے اس وقت تک مقابلہ کروں گا جب تک دین کو غلبہ نہ مل جائے یا میں قتل نہ ہوجاؤں''۔ حضرت کے ان فقرات میں ایک طرف جوش عمل، زور عقیدہ اور جرأت کردار کا مظاہرہ ہے تو دوسری طرف اسلامی سیاست کے صحیح خطوط نمایاں کیے گئے ہیں۔ آپ نے اپنے غلبہ کے بعد دشمن کے اسلام کا تذکرہ کیا

ہے اپنے اقتدار کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی سیاست میں جنگ و جہاد کا مقصد اپنا اقتدار نہیں ہوتا بلکہ فوج مخالف کو راہ راست پر لگا کر مذہبی تعلیمات سے آشنا کرنا ہوتا ہے۔ اسلامی سیاست کا مقصد واضح کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے اخلاق کا مظاہرہ شروع کیا اور ایک مرتبہ قریش سے خطاب کرکے فرمایا کہ: ''میں غلبہ پانے کے بعد قریش کے کسی بھی مطالبہ سے انکار نہ کروں گا''۔

آپ کے اس اعلان کا مقصد یہ تھا کہ قریش کی طماع طبیعت اور ان کے مزاج و دماغ کی پستی بھی منظر عام پر آ جائے اور اس کے بعد تمام دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو صحیح مسلمان نہ سمجھ لیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں وہ طماع طبیعت افراد بھی شامل ہیں جو سہولت پسندی، سہل انگاری اور مکاری کے جذبات کے تحت اسلام قبول کر رہے ہیں۔

سیاست و اخلاق کا یہ حسین امتزاج رسول اکرمؐ کی سیرت کے علاوہ کسی دوسری جگہ نہ مل سکے گا آپ نے اپنے ایک ہی فقرہ سے کفار کو زیر کیا، انہیں اسلام کی ترغیب دلائی، ان کی لالچی طبیعتوں کو واضح کیا، ان کے اسلام کی نوعیت ظاہر کی، ان کی صلح کی کیفیت کو آشکار کیا اور اس طرح کے نہ جانے کتنے موضوعات اسلام و اسلامیات پر ریسرچ کرنے والے محققین کے حوالے کر دیئے۔

اپنی سیاست اور اپنا نصب العین واضح کرنے کے بعد آپ نے اصحاب کی طرف رخ کیا ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' یہ سن کر اکثریت نے جنگ پر آمادگی ظاہر کی اور جناب مقداد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ '' ہم قوم موسیٰ نہیں ہیں جو آپ کو تنِ تنہا چھوڑ دیں ہم کفار سے آخر دم تک مقابلہ کرتے رہیں گے اور آپ کا حکم ہوگا تو ان کے آخری قلعہ کو بھی فتح کریں گے''۔ اس کے بعد آپ نے مسلمانوں سے موت کے لیے بیعت لی۔ یوں تو بیعت سب ہی نے کی لیکن اس میں ابن سلول جیسے منافقین بھی شامل تھے۔

یہاں بھی سیاست و اخلاق کا عجیب و غریب امتزاج نظر آتا ہے۔ اپنے مستقل فیصلے اور وحی الٰہی کے مکمل اشارات کے باوجود اصحاب سے مشورہ کرنا سیاسی اعتبار سے ان کے عزائم، کیفیت اور ارادوں کے اظہار پر مبنی تھا اور اخلاقی اعتبار سے ان کی تالیف قلب بھی مقصود تھی۔

اس مشورہ کے دو سیاسی پہلو اور بھی ہیں۔

۱۔ مشرکین کو اصحاب کے عزم محکم اور ارادۂ مستحکم کی خبر ملے گی تو ان کے دلوں پر دہشت چھا

جائے گی اور وہ اپنا طرزِ عمل بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے، جیسا کہ تاریخ نے ظاہر بھی کیا ہے۔

۲- موت پر بیعت کرنے والے اور آخری وقت تک ساتھ دینے کا وعدہ کرنے والے ساتھیوں کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ان میں کتنے رسول کے اشارے پر جان دینے والے ہیں اور کتنے ذاتی مقاصد یا سماجی دباؤ کی بنا پر ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ اس امتحان کا موقع اس وقت آئے گا جب جنگ کی اتنی عظیم تیاریوں کے بعد حضور کی سیاست کا نیا رخ سامنے آئے گا اور آپ یکبارگی غیر مشروط قسم کی صلح کرنے پر تیار ہو جائیں گے ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے آپ کے مقصد کے تحفظ اور آپ کے اشاروں پر چلنے کی بنیاد پر موت کا ارادہ کیا ہے وہ آپ کی طرح ارادہ بدل کر صلح میں پیش پیش نظر آئیں گے اور جن لوگوں نے اپنے ذاتی مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا ہے وہ اپنی جرأت کے اظہار کے لیے حضور سے اختلاف رائے کر کے جنگ ہی پر آمادگی ظاہر کریں گے۔

تاریخ عالم میں کوئی اتنا بڑا سیاستداں نہیں پیدا ہو سکتا جو اپنے ایک ہی اقدام سے اپنے اور پرائے دوست اور دشمن دونوں پر قابو پالے اور دونوں ہی کی حیثیتوں کو واضح کر دے۔ یہ معجزہ صرف سرکار دوعالمؐ کی سیرت میں ہی مل سکتا ہے اور بس!

مشرکین کو مسلمانوں کی اس جرأتمندانہ بیعت کی اطلاع ملی تو ان کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہوگئی اور انہوں نے کافرانہ سیاست کے پیش نظر مجبور ہو کر صلح کی پیشکش کر دی ان کا خیال تھا کہ اب لشکر اسلام سے بچ کر نکلنے کا کوئی راستہ اس کے علاوہ نہیں ہے۔ صلح کی اس پیشکش نے رسولؐ اسلام کو چند در چند مشکلات میں مبتلا کر دیا۔

اس پیشکش کو قبول کر لیں؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ موت پر بیعت کرنے والے بعض ناعاقبت اندیش مسلمان ہاتھ سے نکل جائیں گے انہیں خیال ہوگا کہ ہمارے ہوتے ہوئے صلح کی کیا ضرورت ہے ہم تو اک آن میں لشکر کفار کا صفایا کر سکتے ہیں۔

اچھا پھر اس پیشکش کو ٹھکرائے دیتے ہیں؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس طرح اسلام کے دامنِ اخلاق پر دھبہ آجائے گا میں ان کے مطالبات کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں، یہ اس بات کا بھی پروپیگنڈہ کریں گے کہ جب تک اسلام کے دست و بازو میں طاقت نہیں تھی وہ مسلم، سلام، صلح، امن و امان اور اس جیسے بے شمار نعرے بلند کیا کرتا تھا اور آج جب اسے ہمارے دیار تک پہنچنے کی ہمت ہوگئی ہے تو تیر و تلوار کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ صلح سے مشرکین

کے دل و دماغ پر ایک نفسیاتی اثر پڑنے والا ہے اور اس سے مذہب کو عظیم فائدہ کی توقع ہے۔ اب وہ بھی نہ حاصل ہو سکے گا۔

آخر کریں تو کیا کریں؟ مشرکین نے وہ سازش کی ہے جس کا توڑ غیر اخلاقی اور غیر آئینی سیاست میں تو ہے لیکن اخلاقی اور آئینی سیاست میں بہت مشکل ہے۔

حضرت ابھی اس مرحلے سے دو چار ہی ہوئے تھے کہ وحی الٰہی نے حسب دستور راہنمائی کی اور آپ نے صریح لہجہ میں کسی مخالفت، بغاوت، احتجاج، سرکشی، طغیانی کی پرواہ کیے بغیر سہل بن عمرو سے صلح کا وعدہ کر لیا صلح کا وعدہ ایک قیامت بن گیا۔

''صلح؟ صلح؟'' مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ارے یہ کیسے ہوگا؟ ہم کیونکر دبیں گے؟

کیا اسلام ہر طاقت سے مافوق نہیں ہے؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہم نے جان کی بازی نہیں لگائی ہے؟ کیا ہم سے مکہ میں داخل ہو جانے کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے؟ کیا یہ واقعاً رسول نہیں ہیں؟ کیا رسول ایسا ہی بزدل ہوتا ہے؟

یہی وہ آوازیں تھیں جو چاروں طرف سے حضورؐ کے کانوں میں آنے لگیں اور بعض ''جرأتمند'' مسلمانوں نے تو رسالت کی پرواہ کیے بغیر اسلامی مفاد اور اپنی عربی غیرت کی آڑ لے کر حضورؐ سے ٹکر لے لی۔ وہ تو کہیئے کہ کچھ دوسرے نیم سنجیدہ مسلمان آڑے آ گئے اور حضورؐ کی عزت و آبرو رہ گئی ورنہ صلح حدیبیہ کا وہی حال ہوتا جو صفین میں تلوار نہ روکنے پر حضرت علیؑ کا ہوا۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ مکالمے تفصیل کے ساتھ درج ہیں، ان کا بغور مطالعہ رسولؐ اسلام کی اخلاق آمیز سیاست سمجھنے میں بیحد مفید ہوگا، اس سیاست کے چند نمایاں خطوط یہ ہیں:

۱- رسالت کی آبرو برقرار رہے اور دامن تبلیغ و ہدایت پر دھبہ نہ آنے پائے۔

۲- اسلام کو دیار غیر پر حملہ آور نہ تصور کیا جائے۔

۳- مسلمانوں کے کردار کو بھی پہچان لیا جائے کہ کون اپنی مرضی کو رضائے رسولؐ میں فنا کر چکا ہے اور کون اکڑا ہوا ہے؟

۴- وہ تلواریں بھی سامنے آ جائیں جن کے اعتماد پر اسلامی لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔

۵- کافر کو یہ سمجھا دیا جائے کہ اسلام صلح کے پیغام کو کسی عالم میں بھی نہیں ٹھکرا سکتا۔

رسول اکرمؐ کے ''ہاں'' کہنے پر تو اتنا بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا اب ذرا اس منظر کی بھی سیر کر لیجئے جب

اس ہاں کے بعد صلحنامہ کی تکمیل کا سوال اٹھا اور حضرت علیؓ نے بحکم رسولؐ صلح نامہ مرتب کرنا شروع کیا۔ ''یہ رسول اللہ کا صلح نامہ ہے'' ابھی ایک ہی کلمہ لکھا گیا تھا کہ سہیل چیخ پڑا۔ یہ رسول اللہ کا کیا مطلب؟ اگر یہ رسول ہیں تو جھگڑا کیسا؟ یہ طریقہ غیر آئینی ہے ہم تو انہیں ''ابن عبداللہ'' سمجھتے ہیں لہٰذا وہی لکھا جائے۔ حضرتؐ نے بھی ''ابن عبداللہ'' لکھنے کا حکم دے دیا۔ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن پھر ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہوگیا ہم رسالت سے انکار نہیں کر سکتے ہم اس انداز کو نہیں تسلیم کریں گے۔

رسول اعظم پھر ایک کشمکش سے دوچار ہوگئے کہ لفظ رسول اللہ رکھیں تو صلح کے مقاصد فنا ہوتے ہیں۔ مٹادیں تو یہ جلد باز مسلمان خفا ہوتے ہیں، غیروں کو دیکھیں یا اپنوں کو سمجھائیں، آخر کریں تو کیا کریں؟

آپ نے ایک لمحہ توقف کر کے ساری آوازیں سنیں اور حضرت علیؓ کو کفار کی خواہش کے مطابق صلح نامہ مکمل کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ آپ کی سیاست کا بالکل نیا پہلو تھا آپ چاہتے تھے کہ جو لوگ میرے مقابلہ میں اپنی رائے اور میری نظر کے مقابلہ میں اپنے اجتہاد کو ابھارنا چاہتے ہیں ان کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا جائے اور آئندہ نسلوں کے واسطے ایک لائحہ عمل یہ مقرر کر دیا جائے کہ رسولؐ کی نص پر کسی کا اجتہاد اور وحی کے اشارے پر کسی کی رائے کو مقدم نہیں کیا جاسکتا، دشمن کے مقابلہ میں طوفان خیز ہنگامہ ایسے باریک نکات کی طرف اشارہ کر جانا حضور ہی کی سیاست کا کام تھا۔

لیجئے یہ منزل بھی طے ہوگئی اور صلحنامہ کے شرائط سامنے آگئے۔

۱- اس سال رسولؐ اسلام مع اصحاب کے واپس چلے جائیں گے اور اگلے سال جب آئیں گے تو تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیا جائے گا۔

۲- دس سال تک جنگ موقوف رہے گی جو جس دین کو اختیار کرنا چاہے گا آزادی سے اختیار کر لے گا۔

۳- اگر کوئی مشرک مسلمانوں کے پاس پہنچ جائے گا تو واپس کیا جائے گا اور اگر کوئی مسلمان مشرکین کی گرفت میں آجائے گا تو واپس نہ کیا جائے۔

عصر حاضر کے ماحول میں ان لفظوں کا سُن لینا آسان ہے لیکن جنگجو قوم کے بیچ میں رہ کر ایسے شرائط کا قبول کر لینا کسی قیامت سے کم نہیں ہے۔ رسولؐ نے شرائط کا استقبال کیا اور مسلمانوں میں ''طوفان محشر'' برپا ہوگیا۔

اس سال واپس جائیں تو فتح کا وعدہ کیا ہوا؟

دس سال جنگ نہ کریں تو یہ تلوار کس کام کی ہے؟

ہم گرفتاروں کو واپس کریں اور وہ واپس نہ کریں، یہ کیسی کمزور صلح ہے؟

رسول اسلامؐ نے یہ سب کچھ سنا لیکن اُف بھی نہ کی ادھر مزید قیامت یہ ہوئی کہ سہیل کا بیٹا ابوجندل جو مسلمان ہو کر بھی باپ کی گرفت میں تھا رسول اسلامؐ کی خبر سن کر کسی طرح حضرتؐ کے پاس پہنچ گیا اور امان طلب کی حضرتؐ نے سکوت اختیار فرمایا سہیل نے معاہدہ کا حوالہ دے کر مسلمانوں کے سامنے بیٹے کی ایسی مرمت کی کہ حضرت عمر کی غیرت قومی جوش میں آ گئی اور انہوں نے ابو جندل کی طرف تلوار بڑھا دی کہ اپنے باپ کا خاتمہ کردے۔اس نے کہا کہ میں رسول کے معاہدہ کا احترام کرتا ہوں ایسا کوئی اقدام نہیں کرسکتا حضور نے اسے دعائیں دے کر واپس کرادیا۔

اس واقعہ سے مسلمانوں میں ایک اور انتشار پیدا ہوگیا۔ ۱۹ دن کے بعد حضور اکرمؐ حدیبیہ سے چلے۔ راستہ میں سورۂ فتح نازل ہوئی اس نے اس صلح کو کھلی ہوئی فتح سے تعبیر کیا، مسلمانوں میں اور بھی ہلچل مچ گئی، یہ فتح ہے؟ کھلی ہوئی فتح؟ فتح مبین؟ نہ اپنے ساتھی کو بچا سکے نہ دشمن سے کوئی بات منوا سکے۔ اور فتح ہوگئی؟

یہاں تک پہنچنے کے بعد حضور نے سوچا کہ اب معاملہ ختم ہو چکا ہے اب خاموشی مناسب نہیں ہے اس لیے ایک مرتبہ غضبناک لہجہ میں کہنا شروع کیا ''یہ سب کیا بکواس ہے میں نے تمہاری احد کی دوڑ بھی دیکھی ہے، تمہارے سروں پر خندق کے طائر بھی دیکھے ہیں تمہارے بھروسے پر صلح سے انکار کرتا''۔

حضرت عمر نے چپکے سے عرض کی حضور بات ہماری شجاعت کی نہیں ہے آپ نے بھی تو مکہ میں داخلہ کی خبر دی تھی؟ اب حضرت نے فرمایا ہاں یہ صحیح ہے لیکن اس میں اس سال کا کوئی وعدہ نہیں تھا۔

صلح کا قصہ تمام ہوا اور اسلامی سیاست کے اعلیٰ نمونے سامنے آ گئے۔

''ہم امسال واپس جارہے ہیں اگلے سال آئیں گے تو مکہ خالی کرنا ہوگا''۔ ہماری واپسی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے تھے اور نہ عکرمہ کے لشکر کو پسپا کرنے کے بعد تمہارے شہر پر بہ آسانی قبضہ کرسکتے تھے تمہیں ایک سال تک کا موقع کبھی نہ دیتے۔

مکہ کو خالی کردینے کا مطالبہ اس بات کا اعلان ہے کہ حجاج پر حملہ کرنے اور نقص امن کا اندیشہ تمہاری ذات سے ہے ہماری ذات سے نہیں ہے ورنہ صلح نامہ میں ہماری آمد سے مطلق ممانعت ہوتی۔

''دس سال تک جنگ ملتوی رہے گی لیکن دین اختیار کرنے کی آزادی ہوگی''۔

جنگ کے التواء کو اس لیے منظور کیا ہے کہ مدینہ آنے کے بعد سے ہمیں صحیح تبلیغ کا موقع نہیں مل سکا ہمارے شام وسحر دفاعی جنگوں میں گزرے جارہے ہیں، اب ہم ذہنی اصلاح کے لیے وقت نکالنا چاہتے ہیں اور یہ کام آج کی جنگ سے ممکن نہیں تھا۔

دینی آزادی کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ ہماری تبلیغ کے نتائج کسی معاہدہ کی مخالفت کا سبب نہ بن سکیں اور ہمارے اوپر بدعہدی جیسا کوئی اخلاقی جرم عائد نہ ہو سکے، ہم صلح وسلامتی کے علمبردار تھے، اس لئے امن وامان سے ہدایت کا کام انجام دینا چاہتے ہیں۔

''مسلمان کو تمہارے درمیان اس لیے چھوڑا ہے کہ وہ اسی بہانے تمہارے عوام کو اپنے مذہب کے اصول سمجھا سکے اور اسے کسی آئین کی رو سے فوراً واپس نہ کیا جا سکے۔

تمہارے قیدی کو اس لیے واپس کرنا منظور کیا ہے کہ وہ تمہارے درمیان ہمارے طرزِ معاشرت، ہمارے آیات ہمارے اصول معاشیات، ہمارے قومی وسماجی نظریات کی تبلیغ کر سکے، تمہارے دل پسیج سکیں اور ہمارا خاموش مشن کامیاب ہو سکے۔

ہمارا صلح پسند اقدام فتح اس لیے ہے کہ ہم بنیادی طور پر زندگی بخشنا چاہتے ہیں موت ہمارا مقصد نہیں ہے ہم گردنیں نہیں جھکانا چاہتے ہم دلوں کو رام کرنا چاہتے ہیں، ہم کل تک گردن کاٹتے تھے تو مد مقابل پر تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا وہ خود ہی راہی ملک عدم ہو جاتا تھا اور آج ہم نے اخلاق کے بوجھ سے دشمنوں کی گردنیں جھکائی ہیں ان کے سر خم کیے ہیں اس لئے اب ہماری تبلیغ واقعی مقصد سے قریب تر آ گئی ہے۔

ہمارے اسی خاموش مشن کی تبلیغ تھی کہ ابتدائے ہجرت سے آج تک بدر، احد، خیبر، خندق، وغیرہ میں ہماری تلواریں چمکتی رہیں لیکن ہم اتنے افراد کو مسلمان نہ بنا سکے جتنے مسلمان ہم نے اس ایک صلح سے بنالیے ''ناعاقبت اندیش'' اور ''ناآشنائے رموز زندگی'' افراد ہمارے اگلے سال کے قافلے کو دیکھیں اور ہماری فتح بینی کا اندازہ کریں۔ ہم دو سال کے بعد اسی مکہ کو فتح کرنے آئیں گے تو ہمارے ساتھ دس ہزار کا لشکر ہوگا آج تو صرف ۱۴۰۰ آدمی ہیں کیا یہ ہماری سیاست کی اعلیٰ کامیابی نہ ہوگی کہ ہم دو سال کے اندر صلح سے وہ کام لے لیں گے جو ۶ سال کی جنگ سے ممکن نہ ہو سکا تھا؟

رسولؐ اسلام کے کردار کا سیاسی مطالعہ

مرزا جعفر حسین مرحوم

علم سیاست نے تیرہ صدیوں کے ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد جو نئے تصورات دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں اُن کے معیار سے عہدِ رسالت کے حالات کا جائزہ لینا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا اور نہ ایسا کرنا ہی ممکن ہے کیونکہ اس دور کے سارے معاشرے مائل بہ زوال تھے۔ عرب کے اردگرد کے ممالک اپنی عظمتوں سے دوری اختیار کرتے جارہے تھے۔ اور بنی نوع انسان شدید کشمکش میں مبتلا تھی۔ سلطنتوں پر شاہی تسلط تھا اور حکمرانی بادشاہوں کے فہم وفراست یا افتادطبیعت کے ماتحت ہوتی تھی۔ کسی ملک میں عدل و انصاف کارفرما تھا تو ظلم و جور کا بازار گرم رہنا بھی دوسرے ملکوں میں معمولی واقعہ ہوا کرتا تھا۔ اہل عرب، خاندانوں میں تقسیم تھے اور یہ خاندان ایک دوسرے پر اپنی روایات کے ماتحت اقتدار قائم کرنے کے لئے کوشاں رہا کرتے تھے۔ قبائل کی باہمی آمیزشیں رقابتوں کے حدود سے متجاوز ہوکر نفاق وعناد و عداوت تک بڑھ جاتی تھیں جن کا سلسلہ نسلاً بعد نسل چلا کرتا تھا۔ اسلام ان حالات کو سدھار نے آیا تھا اور حقیقت امر یہ ہے کہ رسولؐ اسلام نے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں جو شدید ذہنی، معاشی اور اخلاقی انقلاب کامیابی کے ساتھ پیدا کردیا اس کی مثال تاریخ عالم میں کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔

ماہرین سیاست اگر جدید طرزِ حکومت چلانے کے اصولوں کو اسلام میں تلاش کرنا چاہیں گے تو اُن کو یقیناً مایوسی ہوگی اس لئے کہ اسلام سلطنتیں مٹانے آیا تھا، اُس کا مقصد سلطنت قائم کرنا نہیں تھا۔ رسولؐ اسلام نے ساری توجہ اس کوشش پر مبذول کررکھی تھی کہ دنیا میں انسانی برداری کا ایسا نظام قائم ہو جس کی بنیاد صلح و آشتی، امن و امان، اخوت ومحبت اور صداقت و دیانت پر رکھی جائے۔ اُن کے پیش کردہ اور جاری کردہ اصولوں میں کوئی گنجائش فتوحات اور دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت کرنے کی نہیں تھی، انہوں نے ترویج اسلام میں بھی کبھی کسی قسم کے تشدد کو جائز نہیں رکھا۔ اُن لوگوں سے بھی جو اسلام قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے، رسولؐ اسلام کے فرستادہ ایلچی اتنا کہہ دینا کافی

سمجھتے تھے کہ اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو اس کے شاہد رہو کہ ہم مسلمان ہیں، ملک گیری کا خیال تک کبھی اُن کے دماغ میں نہیں آیا اور آ ہی کیسے سکتا تھا جب کہ وہ یہ تعلیم دے رہے تھے کہ تمام روئے زمین اللہ کی ملکیت ہے اور یہاں حکومت الٰہیہ قائم ہونا چاہیے۔ اسی حکومت الٰہیہ کے زرین اصول انہوں نے پیغمبرؐ اسلام کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے ماننے والوں کی بہت بڑی اکثریت ہوس جاہ و جلال میں گرفتار ہوکر اُن اصولوں سے منحرف ہوگئی اس تبدیلی کو ہم کسی طرح بھی سیاست الٰہیہ میں شامل نہیں کرسکتے اس لئے ہم کو صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے اپنے سیاسی جائزہ کو بھی رسولؐ اسلام کے ارشادات اور عمل تک محدود رکھنا چاہیے۔

رسولؐ اسلام کو اپنی عمر کے چالیس برس گزارنے کے بعد شرف بعثت حاصل ہوا اور انہوں نے ذات واجب الوجود پر ایمان لانے کی ایک بہت مختصر مجمع کو دعوت دی۔ اس سلسلے میں مولانا شبلیؒ اپنی تصنیف سیرۃ النبیؐ میں تحریر فرماتے ہیں:

سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُر خطر راز کس کے سامنے پیش کیا جائے؟اس غرض کے لئے وہ لوگ انتخاب کئے جاسکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و عادات اور ہر ایک حرکات وسکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بناء پر آپ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کرسکتے تھے۔ ان لوگوں میں آپ کی حرم محترم حضرت خدیجہ، آپ کی آغوش تربیت میں پروان چڑھنے والے حضرت علیؑ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید اور خلیفۂ اول شامل تھے۔

مولانا شبلیؒ نیز دوسرے تمام مورخین کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ مردوں میں حضرت علیؑ وہ بزرگ تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے۔ اس مقام پر جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علیؑ کے ایمان لانے کا سوال اٹھانا ہی بے محل ہے۔ کتب تاریخ وسیر میں کہیں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے علیؑ کا کفار قریش کے طور طریقوں کو اپنانا ثابت ہوتا ہو۔

اس لئے اُن کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ با ایمان پیدا ہوئے صاحب ایمان رہے اور رسولؐ کی آواز پر بلا تامل لبیک کہنا اسی چھپے ہوئے ایمان کا اعلان تھا۔ اس دلیل کو اُس واقعہ سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے جب رسولؐ اسلام نے دعوت ذوالعشیرہ میں چالیس

آدمیوں کو جمع فرمایا تھا اور یہاں بھی علیؓ ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی تھی ۔ بہرحال کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا مگر بہت بڑی تعداد جن میں ابوسفیان، ابولہب، ابوجہل وغیرہ جیسے با اثر لوگ اس نئے دین کی مخالفت پر کھل کر آمادہ ہوگئے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ لاالہ الااللہ کے ایسے مختصر مگر پُر مغز کلمے کے جوہر پرکھنے اور اس کی معنویت سمجھنے کے لئے اُن لوگوں کے پاس نہ چشم بینا تھی اور نہ فہم و فراست۔ اس کے علاوہ کہنہ روایت کو، خواہ وہ کتنی ہی بوسیدہ اور فرسودہ کیوں نہ ہوگئی ہو، ترک کردینا آسان نہیں ہوتا کیونکہ وہ سارے سماج میں اس طرح اثرانداز اور پیوست ہوچکی ہوتی ہیں کہ افراد اگر خیرباد کہنے پر آمادہ بھی ہوں تو اپنے کو بے بس اور مجبور پاتے ہیں اس لئے رسولؐ اسلام کی ذات ہی کے خلاف طوفان عظیم برپا کردیا گیا لیکن آج ہم مقام مفاخرت میں کہہ سکتے ہیں کہ کلمۂ طیبہ کی بے پناہ طاقت، اسلام کی افادیت اور رسولؐ اسلام کی سیاست اور ان کے تدبر کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ممکن ہے کہ جس کلمہ کو ابتداءً تلخ اور ناگوار قرار دیا گیا تھا وہ جانِ ایمان ہوگیا اور اسلام آج دنیا بھر میں ایک مستند اور مضبوط مذہب کی حیثیت کا مالک ہے۔

سیاسی طریقہ پر دورِ رسالت کو دو علیحدہ علیحدہ تاریخی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں بعثت کے بعد تیرہ برسوں پر مشتمل وہ پہلا حصہ ہے جو رسولؐ اسلام نے مکہ میں بسر کیا، ان تیرہ برسوں میں سے تخمیناً تین سال سے زائد اس طرح گذرے تھے کہ رسولؐ اسلام کے لئے شعب ابوطالب سے باہر نکلنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ دور خاموش تبلیغ کا زمانہ تھا جو رسولؐ اسلام اپنے سلیقہ سے نباہ لے گئے اور اپنے تدبر و ہوشمندی سے اپنے مشن کو آگے بڑھاتے ہی رہے۔ رسولؐ اور مسلمانوں پر طرح طرح کی تکالیف، سخت سے سخت اذیتیں، اہانت و رسوائی، بے پناہ دھمکیاں، قتل و غارت کی کوششیں، غرضکہ ہر قسم کے مصائب ڈھائے گئے لیکن جس جماعت کا رہبر و رہنما محمدؐ جیسی عدیم المثال شخصیت ہو اور وہ اُن کے درمیان اُن کی ہدایت پر مستعد رہے۔ اس کا متزلزل ہوجانا ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ رسولؐ اسلام جب ہر قسم کی ترغیب، تحریص اور جاہ و ثروت کی ہر پیش کش کو ٹھکرا کے خود ہی شدائد مصائب جھیل رہے تھے اور برابر سے زیادہ اُن کے شریک تھے تو اُن کے ماننے والوں کی بلند حوصلگی فطری بات تھی۔ وہ پورے ایمان و اعتقاد کے ساتھ اپنے نئے عقیدے پر مستحکم رہے اور رسولؐ اسلام کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا عین عبادت سمجھتے رہے۔ اُن کی اس پامردی اور ثبات نے دوسروں کو متاثر کیا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی صفوں میں اضافے ہوتے رہے لیکن ہر اضافہ کے ساتھ کفار قریش کی

جانب سے سختیوں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ چنانچہ بعثت کے پانچ برس کے بعد رسولؐ اللہ نے اپنے اصحاب کو ہجرت کا حکم دے دیا۔ اس اقدام میں مسلمانوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کی غایت بھی مقصود تھی۔ یہ لوگ صحبت رسولؐ میں اس قابل بن چکے تھے کہ جس محفل میں چلے جاتے بلندی کردار اور خوش اخلاقی وحق پرستی کی زندہ مثالیں پیش کرسکتے تھے، اس لئے اُن کی ہجرت رسولؐ کے مشن کی تکمیل میں وسیلہ بنی اور رسولؐ کا حکم پاتے ہی تخمیناً سو مرد اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر حبشہ چلے گئے۔ وہاں کا عیسائی بادشاہ نجاشی بے حد شریف النفس اور منصف و عادل تھا۔ اُس نے ان مسلمانوں کو اپنے ملک میں پناہ دے دی لیکن کفار قریش ان مسلمانوں کی ہجرت کو بھی گوارا نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنے ایک ایلچی کو تحائف دے کر نجاشی کے پاس اس استدعا کے ساتھ بھیجا کہ بادشاہ اُن عربی النسل مسلمانوں کو مکہ واپس کردے مگر بادشاہ نے وہ تحائف واپس کر دیئے اور مسلمانوں کو واپس بھیجنے سے انکار کردیا۔ اس طرح اسلام دوسرے ممالک میں پہنچا اور وہاں کے لوگ تعلیم رسولؐ سے متاثر ہوتے رہے۔ لاالٰہ الا اللہ کی خاموش تبلیغ ہوتی رہی، مکہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی اور دوسرے مقامات، مختلف اضلاع اور قریوں میں برابر لوگ مسلمان ہوتے رہے، رسولؐ اسلام کے ہاتھ پر آ آ کے بیعت کرجاتے تھے۔ ایسے لوگ انصار کہلاتے تھے اور اُن کی معقول تعداد مدینہ میں تیار ہوگئی۔ اس مقام پر یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ رسولؐ اسلام جن باتوں پر انصار سے بیعت لیتے تھے وہ یہ تھیں کہ شرک، چوری، زنا، قتل اور افترا کے مرتکب نہیں ہوں گے اور رسولؐ اللہ اُن سے جو اچھی بات کہیں گے اس سے سرتابی نہ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ رسولؐ کے پیش نظر ایک مقدس اور پاکیزہ سماج تعمیر کرنے کا منصوبہ تھا جہاں تمام لوگ امن وسکون کی زندگی بسر کرسکیں اس لئے تبلیغ کے ابتدائی دور میں زیادہ تر توجہ ان امور پر دی گئی جو حق العباد ادا کرنے سے متعلق تھے، جتنے ارکان مذہب حقوق الٰہی سے خاصتاً متعلق تھے اُن پر زیادہ توجہ ہجرت کے بعد فرمائی گئی تھی۔ اس طریقۂ کار کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں جاذبیت پیدا ہوگئی اور لوگوں کے دل اس دین کی طرف جھکنے لگے۔ لیکن کفار قریش کا دل کسی طرح ملائم نہیں ہوا اور نہ اُن کے دماغ صحیح راستہ پر آنے کے لئے آمادہ ہوسکے۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے رسولؐ اسلام کو قتل کردینے کا مضبوط پروگرام بنا ڈالا۔ بالآخر پیغمبر اکرمؐ کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ وطن آبائی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ مل چکی تھی، رسولؐ اسلام نے وہاں کی فضا کو سازگار پا کر مکہ سے ہجرت

فرمائی۔ ہجرت کی رات اپنے دامن میں بے پناہ وسعتیں سمیٹے ہوئے تھی۔ رسولؐ اسلام کا ترک وطن کرنا، لوگوں کے امانات کی پوری حفاظت کے ساتھ واپسی کیونکہ وہ باوجود تمام اختلافات کے تمام مکہ والوں کی نظر میں بہترین امین اور معتمد تھے، ساتھ ہی ساتھ اپنے بستر خواب کا کچھ ایسا مکمل انتظام کہ کفار قریش اُن کی عدم موجودگی محسوس نہ کرسکیں اور یہ تمام فرائض ادا کرنے کے بعد خود اس طرح مجمع چیرتے ہوئے نکل جانا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ دو مخلص دوستوں نے خاموشی اور تاریکی میں کامیاب اسکیم مرتب کی اور اس پر عمل درآمد کر ڈالا۔ رسولؐ اسلام دشمنوں کی صفوں سے اس طرح سکون و اطمینان کے ساتھ نکل گئے کہ کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلا کون آیا اور کون گیا۔ علیؑ بستر رسولؐ پر اُن کی چادر اوڑھ کر آرام کی نیند سو رہے۔ دشمن مکان گھیرے ہوئے تھے اور اُن کے ارادے رسول اسلام کو قتل کردینے پر مستحکم و مضبوط تھے۔ وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ رسول اپنے بستر پر آرام فرما رہے ہیں، صرف وقت کا انتظار تھا کہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنادیں اور علی اس حیات و موت کے خلفشار میں اُس پر ہول خواب گاہ پر ایسی پُرسکون اور خوشگوار نیند سوئے جیسی نہ کبھی پہلے اور نہ کبھی بعد میں اُن کو آئی تھی۔ صبح کو جب کفار قریش گھر میں گھسے تو علی کو دیکھ کر لرزہ براندام ہوگئے۔ اُن کی مایوسیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ علی نے فاتحانہ انداز میں صبح کا خیر مقدم کیا۔ رات کو اپنا نفس مرضی اللہ کے عوض بیع کر فراغت حاصل کر چکے تھے، دن کو لوگوں کے امانات بحفاظت تمام اُن کو واپس کردیں اور خود بھی مدینہ روانہ ہوگئے۔ یہ ہجرت اسلامؐ کا سب سے بڑا سیاسی اقدام تھا جو انہوں نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔

دورِ ہجرت کے بعد گیارہ سال کا زمانہ شدید ترین جدوجہد کا زمانہ تھا جس میں بہت سے واقعات کشمکش، سریات اور غزوات پیش آئے جن کی مجموعی تعداد غالباً بیالیس یا تینتالیس تک پہنچتی ہے سریات وہ ٹکراؤ تھے جن میں رسول اسلام نے بہ نفسِ نفیس خود شرکت نہیں فرمائی اور کسی نہ کسی کو اس خدمت کے لئے ہر موقع پر مامور فرمادیا تھا۔ سریات کی تعداد غزوات کے مقابلہ میں زیادہ تھی لیکن ہر سریہ کسی نہ کسی مقصد کے لئے عمل میں آیا تھا۔ غزوات جن میں رسولؐ نے بہ نفس نفیس سرداری کے فرائض انجام دیئے۔ بدر ۲ ہجری، احد ۳ ہجری، خندق ۵ ہجری، خیبر ۷ ہجری، فتح مکہ ۸ ہجری، حنین ۸ ہجری، تبوک ۹ ہجری اور مباہلہ ۱۰ ہجری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام تحریکات کا سیاسی جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مدینہ، مہاجرین اور انصار کی حفاظت کے لئے ان اقدامات کے علاوہ

اور کوئی چارۂ کار تھا ہی نہیں! مکہ کے قبائل جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا رسولؐ اسلام اور مہاجرین و انصار کے شدید ترین دشمن تھے، یہود و نصاریٰ بھی اس نئے مذہب کی ترویج و اشاعت اور ترقی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ان مخالفتوں میں ان نئے آنے والوں نے، جو اسلام اور رسولؐ اسلام سے برگشتہ ہوکر مدینہ سے مکہ چلے آئے تھے اور زیادہ ہیجان اور طاقت فراہم کردی تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر اشاعت دین کے ساتھ رسولؐ اسلام کے لئے یہ بھی ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اس بات کی خبر رکھیں کہ قریش مکہ میں کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں، جو قومیں مدینہ یا مدینہ کے ارد گرد رہتی ہیں اُن سے امن اور قریش کی مدد نہ کرنے کے معاہدے کریں، جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے اور وہاں سے بھاگنا چاہتے ہیں ان کی ہر امکانی مدد کریں، جو گروہ قریش مدینہ پر حملہ کرنے مکہ سے باہر نکلے یا کسی طرح یہ پتہ چل جائے کہ وہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے اس کا ہتھیاروں سے مقابلہ کریں اور سب سے زیادہ یہ فکر تھی کہ کسی تصادم میں ضرورت سے زیادہ خونریزی نہ ہو اور انسان کے لہو کی ہر بوند گراں قدر ہی برقرار رہے۔ چنانچہ تمام سریات و غزوات کا دقیق مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ان مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا اور اپنے جلیل القدر اصولوں کا ہر وقت احترام کیا گیا۔ رسولؐ اسلام نے خود کبھی کسی سے لڑنا پسند نہیں کیا، جنگ میں ابتداء نہیں کی تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کا کبھی کوئی خیال اُن کے دماغ میں نہیں آیا، حکومت قائم کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا، مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ صرف اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ اطمینان سے بیٹھ کر صلح و امن کے ساتھ لوگوں کو سچے مذہب کی طرف دعوت دیں لیکن کفار مکہ نے جب انہیں یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا تو انہوں نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اُن کا مقابلہ کیا۔ ابوسفیان کی سرکردگی میں کفار قریش کے حملوں کا نتیجہ بدر و احد کے غزوات تھے، کفار مکہ کے ورغلانے پر یہودی برسرِ پیکار ہوئے تو رسولؐ اللہ نے مجبوراً اُن سے بھی مقابلہ کیا چنانچہ خندق و خیبر میں یہودیوں سے لڑائیاں ہوئیں جن میں اُن کے دو جاں باز عمر ابن عبدود اور مرحب مارے گئے۔ یہ فتوحات علی ابن ابی طالبؑ کے کارنامے تھے جو تاریخ اسلام میں ہمیشہ زریں حروف میں محفوظ رہیں گے، حدیبیہ میں رسولؐ اسلام نے کفارِ قریش سے صلح کرکے سیاست میں ایک ایسا نیا باب شامل کردیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ اس وقت بڑے بڑے اولوالعزم صحابیوں کے ایمان متزلزل ہوگئے اور وہ اس صلح کی افادیت کو نہیں سمجھ سکے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ فتح مکہ اسی صلح کا لازمی نتیجہ تھی، حنین اور مباہلہ میں عیسائیوں سے

ٹکراؤ ضرور ہوا مگر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ پھر بھی یہ دونوں واقعات تاریخ اسلام میں اہمیت کے حامل ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ رسولؐ اسلام نے خود کو حاکم یا بادشاہ نہیں بنایا، وہ ہادی تھے اور ہادی ہی رہے۔ اگر وہ بادشاہی یا حکومت کے متمنی ہوتے تو قریش مکہ اُن کو یہ وجاہت و طاقت بخوشی و رغبت بہت پہلے ہی تفویض کر دیتے اور انہیں مکہ سے ہجرت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

رسول اسلامؐ نے جس معاشرے کی بنا ڈالی تھی اس میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے ایسے قوانین وضع کئے تھے جن میں اعتدال پسندی ملحوظ رکھی گئی تھی۔ نہ موسیٰ کی طرح سخت گیری کو شعار بنایا اور نہ عیسیٰ جیسی ''حدود سے متجاوز رحمدلی'' کو قبول فرمایا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے جرائم کی سزا موت نہیں قرار دی اور نہ ایک رخسار پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا رخسار پیش کرنے کی ہدایت فرمائی بلکہ آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان، جان کا بدلہ جان کے اصول کو نافذ کیا اور ایسی سزائیں جاری کرنے میں بھی انسانی فطرت کی کمزوریاں ملحوظ رکھنے پر پورا پورا زور دیا۔ سول لا (Civil law) بھی دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی افادیت تیرہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مسلم الثبوت ہے۔ ان سب سے بڑھ کر ان کے رائج کردہ نظام میں یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے امن و آشتی اور اخوت و مساوات کی بنیادوں پر اسلامی سماج کو منظم کر دیا۔ محنت و مشقت کو مایۂ صد افتخار قرار دے کر مزدوروں کی حوصلہ افزائی کی اور اکل حلال کے حصول پر راغب کرنے میں تجارت و محنت کو وسیلۂ معاش قرار دیا۔ یہی نہیں کہ ان اصولوں کی تبلیغ و تعلیم فرمائی بلکہ بہ نفس نفیس خود عمل کر کے دنیا کے سامنے بہترین نمونہ پیش کیا۔ رسولؐ اسلام کا ذریعہ معاش ہمیشہ تجارت رہا محنت و مشقت میں مہاجرین و انصار کے برابر شریک کار رہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے سے دو میل قبل جب آپ نے مقام قبا میں قیام فرمایا اور مسجد بنانے کا فیصلہ ہوا تو تعمیر مسجد میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی برابر کے شریک کار تھے۔ بھاری بھاری پتھروں کو اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مدینہ میں قیام کے بعد جب مسجد نبویؐ تعمیر کی گئی تو رسولؐ اسلام مزدوروں کے لباس میں آگے آگے تھے۔ یہ مسجد ہر قسم کے تکلف سے بری اور اسلام کی سادگی کی بہترین مثال تھی۔ کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ ابتداءً بیت المقدس کی طرف رکھا گیا تھا لیکن دوسرے ہی سال جب ۲ ہجری میں قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہوا تو شمال کی جانب ایک نیا دروازہ کھول دیا گیا۔ مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا۔ یہ اُن لوگوں کے لئے

تھا جو اسلام لاتے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔ مسجد مکمل ہوچکی تو مسجد سے متصل ازواج نبیؐ کے گھر بنائے گئے۔ ہر مکان چھ سات ہاتھ چوڑا دس ہاتھ لانبا اور بہت نیچا تھا، آدمی کھڑا ہوکر چھت کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا پردا پڑا رہتا تھا، راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ اس طرح زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ تھا کہ اصحاب صفہ کو بھی اپنی بے بضاعتی پر تاسف نہ ہوسکا اور وہ توکل اور قناعت کی فضیلتوں سے بہرہ یاب رہے۔

رسولؐ اسلام اور آل رسولؐ کی زندگی سادگی اور افلاس میں اپنی آپ نظیر تھی۔ وہ اپنی سادگی اور اپنی فقیری میں پُرکیف سکون حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے الفقر فخری کو اپنا شعار بنا کر اطمینان کے ساتھ ایام گزاری کرلی۔ تاریخ ان زرین واقعات کو مسخ نہیں کرسکتی کہ جب ۲ ہجری میں رسول اسلام نے اپنی لاڈلی بیٹی سیدہ کا عقد و نکاح علیؑ کے ساتھ طے کیا تھا تو نوشاہ کی جملہ املاک ایک بھیڑ کی کھال، ایک یوسیدہ یمنی چادر اور ایک زرہ پر مشتمل تھی۔ مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ میں ان املاک کا تذکرہ کیا ہے اور اُس زرہ کی قیمت سوا روپیہ بتائی ہے۔ یہ املاک مہر سیدہؑ میں دی گئی تھی اور جہیز میں رسولؐ اسلام نے اپنی پیاری بیٹی کو ایک بان کی چارپائی، ایک چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے بھرے تھے۔ ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے مرحمت فرمائے تھے۔ آلِ رسولؐ کی فقیرانہ زندگی کے واقعات و حالات اتنی کثرت سے تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں جن پر تبصرہ کرنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے اس موقع پر صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالیں اتنی بہتات کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے اس لئے پیش کی گئی تھیں تاکہ غربت و فاقہ باعث ننگ و رسوائی قرار نہ پائیں اور بھوک کے مارے ہوئے انسانوں کے دلوں میں بھی جینے کی ہمک پیدا ہو۔ اس ایک مقصد کی وضاحت بھی الفاظ میں ممکن نہیں ہے، صرف سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔

تدوین ارکان کا کام مدینہ میں مکمل ہوا تھا۔ مکہ میں بھی نمازیں پڑھی جاتی تھیں لیکن مغرب کے علاوہ ہر نماز دو رکعت کی ہوتی تھی، اذان کا کوئی طریقہ رائج نہیں ہوا تھا۔ مدینہ میں داخلہ کے ایک ماہ کے بعد نماز پنجگانہ کی سترہ رکعتیں قرار پائیں، اسی سال یعنی ۱ ہجری میں رسولؐ اللہ کے حکم سے علیؑ نے بلال کو اذان کی تعلیم دی اور بلال موذن مقرر ہوئے۔ اذان نماز جماعت قائم کرنے کے لئے رائج کی گئی تھی اور یہ ایجاد اسلام نے ایسی کی ہے جس پر دوسرے مذہب والے رشک کرتے تھے۔

مسٹر چیمبر نے اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ ''موذن کی آواز سادہ لیکن نہایت متین اور دلکش ہوتی ہے۔ اگرچہ شہر میں دن کے شور وغل کے بعد بھی مسجد کی بلندی سے خوشگوار محسوس ہوتی ہے مگر رات کے سناٹے میں اس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے اہل یورپ بھی پیغمبرؐ کو اس امر پر مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے انسانی آواز کو موسائیوں کے ترسا اور عیسائیوں کے گرجا کی گھنٹی پر ترجیح دی''۔ بہرحال پہلے سن ہجری میں نمازوں کی رکعتوں میں اضافہ ہوا، جماعت قائم کی گئی اور اذان رائج ہوئی۔ دوسرے سال یعنی ۲ ہجری میں نماز کا رخ کعبہ کی جانب موڑ کر اسی کو قبلہ قرار دیا گیا۔ اسی سال ۲ ہجری میں ماہ رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے۔ صدقۂ عیدالفطر اور نماز عیدالفطر کا حکم صادر ہوا۔ لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ زکوٰۃ کو روزوں پر اس طرح فضیلت ہوتی ہے کہ اس کے بارے میں ایک سال قبل یعنی ۱ ہجری ہی میں حکم دے دیا گیا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی مقدم قرار پائی تھی۔

ہجرت کے بعد رسولؐ اسلام کی زندگی کے گیارہ برس سریا اور غزوات کی مسلسل الجھنوں میں کٹے۔ قریش مکہ سب سے بڑا دردِ سر تھے لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود مدبر اعظم کا دماغ تبلیغ مذہب سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری میں جب کفار مکہ کے مدینہ پر حملہ کرنے کا خطرہ فرو ہو کر کچھ اطمینان حاصل ہوا تو رسول اسلام نے ایک مہر تیار کرائی جس پر ''محمد رسولؐ اللہ'' کندہ کرایا اور شاہان اطراف کے نام خطوط جاری کئے۔ انہیں خطوط میں ایک خط نجاشی بادشاہ حبش کے نام تھا۔ جس نے فی الفور اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔ دوسرا خط قیصر ہرقل بادشاہ روم کے نام تھا۔ قیصر کو جب یہ خط ملا تو ابوسفیان اور عرب کے کچھ تاجر اسی ملک میں اتفاق سے موجود تھے۔ وہ سب قیصر کے پاس بلائے گئے اور ان سے بھرے دربار میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر: تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟

ابوسفیان: میں۔

قیصر: مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: بہت معزز اور شریف۔

قیصر: اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان: کمزور لوگ ہیں۔

قیصر: وہ کبھی عہد اور اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر: تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان: ہاں

قیصر: نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر: وہ تم سے کیا کہتا ہے؟

ابوسفیان: کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامانی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ تم نے اس کو شریف النفس بتایا، پیغمبرؑ ہمیشہ اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہی کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروںؑ کے ابتداءً پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہوتے ہیں، تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبرؑ کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبرؑ آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔

یہ واقعہ اور اس کے پس منظر کا تجزیہ رسولؐ اسلام کے اس طریقۂ کار پر روشنی ڈالتا ہے جس کو انہوں نے تبلیغ مذہب کے سلسلے میں اپنایا تھا۔ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد سے بالخصوص خلفائے بنی امیہ و بنی عباسیہ نیز دیگر مسلم سلاطین کے دور میں ترویج اسلام کے جو ڈھنگ ایجاد کیے گئے تھے وہ کم سے کم اس اسلام کو نہیں پھیلا سکے جو رسول اکرمؐ دنیا کے سامنے پیش کر گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم ریاستیں بہت جلد ختم ہوگئیں اور مسلمانوں کے اقتدار سے بڑے بڑے علاقے نکل گئے۔ بہرحال رسولؐ اسلام نے جبر وتشدد کو کبھی جائز قرار نہیں دیا بلکہ اس کے برعکس حسن اخلاق اور بلندی کردار کو ترویج مذہب کا ذریعہ اور اخوت و مساوات کو تنظیم ملت کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنا پہلا یادگار درس عقد مواخات کے موقع پر ہجرت کے ۷ یا ۸ ماہ بعد دیا تھا جس کے ماتحت مسلمانوں کی تنظیم اخوت و مساوات کی بنیاد پر عمل میں آئی اور رفتہ رفتہ مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مستحکم و مضبوط ہوگئے۔ اُس وقت مسلمان دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے جو مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے وہ مہاجرین کہلاتے تھے اور انہوں نے مدینہ میں رہ کر اسلام قبول کیا تھا وہ انصاری کہے جاتے تھے۔ رسولؐ اسلام نے ایک ایک مہاجر کا ایک ایک انصاری سے بھائی چارہ مقرر کر دیا تھا چنانچہ تخمیناً پچاس مہاجرین کا اسی تعداد کے انصار کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم ہوگیا۔ اس نئے رابطے نے دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے کا ہر حال میں ہمدرد اور شریک بنا دیا۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ رسولؐ اسلام کو اعلیٰ انسانیت سکھانے اور دنیاوی زندگی کو بہترین عنوان سے بسر کرنے کی تعلیم دینے کا کس قدر زبردست اور بے مثل ونظیر سلیقہ تھا۔ مولانا شبلیؒ اپنی سیرت النبیؐ میں اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ''اسلام تہذیب و اخلاق وتکمیل فضائل کی شہنشاہی ہے، جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا اُن میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد و مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضروری ہے تفحص اور استفسار سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا دونوں میں یہ اتحاد و مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سیکڑوں اشخاص کی طبیعت، فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیت میں سے ہے''۔

اسی سلسلے میں یہ واقعہ بھی فوراً سامنے آجاتا ہے کہ علیؓ کے مذاق کا کوئی شخص نہ گروہ مہاجرین میں تھا اور نہ جماعت انصار میں دستیاب ہوسکا اور وہ اکیلے رہ گئے۔ جب انہوں نے پوچھا کہ یا رسولؐ

اللہ میں کس کا بھائی بنایا گیا؟ تو رسولؐ اسلام نے فرمایا: انت اخی فی الدنیا والآخرہ۔

متذکرہ بالا واقعات کی روشنی میں عہد رسالتؐ کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ اسلام نے بعثت کے بعد تیرہ سال تک اپنے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کی، مکہ سے ابتداء ہوئی لیکن دور دور سے مشتاقان زیارت آتے رہے، بیعت کرتے اور مشرف با اسلام ہوتے گئے۔ کفار قریش نے جب عرصۂ ہستی تنگ کردیا، مکہ کی ہوا نہایت گرم اور ناموافق ہوگئی اور مدینہ میں اسلام کو پناہ ملی تو رسولؐ اسلام نے ہجرت فرمائی۔ مدینہ پہنچ کر تبلیغ مذہب حقہ تدوین ارکان دین اور تنظیم مسلمین کے امور کی طرف متوجہ ہوئے سرایات اور غزوات کے مراحل کامیابی کے ساتھ طے ہوتے رہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ایک ایسا مکمل نظام زندگی بھی تیار ہوتا رہا جس کی بنیادیں حق و صداقت، دیانت و امانت، زہد و تقویٰ، شرافت و انسانیت، پاکدامانی و حق پرستی، خود داری و خدمت خلق اور امن و آشتی کے ایسے مستحکم و مضبوط ستونوں پر استوار کی گئی تھیں، یہ تھی حقیقی سیاست اسلامیہ اور یہ تھا وہ نظام حیات جس نے عظیم الشان سلطنتوں کی طاقتوں کو ہلا دیا۔ ایروِنگ اپنی تاریخ اسلام جلد ۲ میں لکھتا ہے کہ ''اس دانائی اور سادگی کے اصول سے اُس سلطنت کی بنیاد پڑی جو قلیل مدت میں بہت عظیم الشان طاقت حاصل کرنے والی اور دنیا کی زبردست سے زبردست سلطنتوں کو ہلا دینے والی تھی''۔ لیکن پھر بھی اس طاقت کو ملوکیت اور شاہنشاہیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دس برس کی مدت میں جب یہ مشن کامیاب ہوگیا، اسلام کی مقدس اور پاکیزہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تو ۱۱ ہجری میں حجۃ الوداع سے فارغ ہوکر رسولؐ اسلام نے اپنی اس متاع زندگی کی حفاظت و بقا اور مسلمانوں کی رہبری و رہنمائی کے لئے خلق کی ایسی ممتاز ترین اور مایۂ ناز شخصیت کو، جو ہر گرم و سرد میں اور ہر نازک سے نازک موقع پر رسولؐ کے شریک کار رہ چکے تھے اور مقصد رسولؐ سے کماحقہ واقف تھے۔ اپنا وصی و جانشین مقرر کرکے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ پیغمبر اسلام نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے ذریعہ جس وسیع اسلامی سماج کی تعمیر و تشکیل کی تھی اس کی ہدایت و رہنمائی کوئی معمولی بات نہ تھی ذرا سی کوتاہی ان کی ساری محنت کو رائگاں کرسکتی تھی۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے غدیر خم کے میدان میں اعلانیہ اپنے جانشین کی نشاندہی کردی تھی تاکہ ہدایت و رہنمائی کے باب میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے اور اگر اسلام دشمن طاقتیں اپنے سازشانہ منصوبوں کے ذریعہ اسلام کو انحراف سے دوچار کرنا چاہیں تو علی اور اولاد علی پیغمبر کی اس گرانقدر الٰہی

امانت کی حفاظت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردیں۔

مسجد کوفہ میں سجدہ کی حالت میں سر پر گہری ضرب لگنے کے بعد ''کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوگیا'' کا نعرہ اس بات کی دلیل ہے کہ علیؑ کی زندگی کا مقصد اسلام کی حفاظت اور ملت اسلامیہ کی قیادت و رہنمائی تھا۔ اس عظیم مشن کی تکمیل کی ذمہ داری امام حسنؑ نے قبول کی اور ان کے بعد امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں اسلام کا ایسا بیمہ کردیا کہ اب قیامت تک کسی یزید میں مسلمانوں سے طلب بیعت کی ہمت نہ ہوگی یہاں تک کہ قائم آل محمد کا ظہور عمل میں آجائے اور بندگان خدا کو ظلم و ناانصافی سے مکمل نجات حاصل ہوجائے۔

اسلامی قومیت کی تشکیل کے لیے
پیغمبرؐ اسلام کا آخری منشور

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی مرحوم

۱۰ ہجری میں پیغمبرؐ اسلام نے حج کا تاریخی فریضہ انجام دیا۔ یہ حج آں حضرتؐ کی حیات اور ان کی تبلیغ و رسالت کا ایک نہایت اہم اور غیر معمولی نتیجہ خیز موقع تھا۔ یوں تو حضرت نے ۲۳ سال تک فریضۂ رسالت کو اسی تن دہی کے ساتھ انجام دیا جو ان کے شایانِ شان تھی، قرآن کے ذریعہ سے احکام بھی اترتے رہے اور آں حضرت کے ذریعہ سے ان کی توضیح و تشریح بھی ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے مدت حیات انقطاع کے قریب پہنچی اس بات کی شدید ضرورت درپیش ہوئی کہ امت کی فلاح و بہبود کے اہم نکات بالمشافہ اور نہایت تاکید کے ساتھ زیادہ سے زیادہ افراد تک اجتماعی خطاب کے ذریعہ سے پہنچادیئے جائیں۔ اس اجتماعی خطاب کے لئے حج سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوسکتا تھا۔ اگرچہ کوئی واضح تاریخی شہادت موجود نہیں ہے پھر بھی مجموعی صورت کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس آخری حج میں پیغمبرؐ اسلام کے تشریف لے جانے کی اطلاع تقریباً سب ہی مسلمان بستیوں میں بہت پہلے سے پہنچا دی گئی تھی اسی لیے جب آنحضرتؐ مدینہ سے حج کے واسطے روانہ ہوئے تو بعض معتبر تاریخوں کی شہادت کی بنا پر تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار افراد ساتھ تھے ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو مختلف مقامات سے سفر کر کے مدینہ پہلے ہی سے پہنچ گئے تھے تاکہ رسول خداؐ کے ساتھ سفر کا شرف حاصل کرسکیں۔ مکہ پہنچنے کے بعد یہ تعداد فطرتاً اور بڑھ گئی اس لئے کہ لوگ جوق درجوق براہِ راست مکہ بھی پہنچ رہے تھے۔

یہ رسولؐ اللہ کا آخری حج بھی تھا اور اس حج کو حج وداع، حج اسلام، حج بلاغ، حج کمال اور حج تمام کے مختلف ناموں سے مورخین و محدثین یاد کرتے ہیں۔ اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معنوی حیثیت سے اس حج میں کتنی خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں۔ پیغمبرؐ اسلام کی زندگی کا آخری سال، اتنا

زبردست مجمع اور اسے مخاطب کرنے کا اتنا آسان اور موزوں موقع یہ تمام باتیں مل جل کر ایک ایسے مناسب لمحہ کی تخلیق کر رہی تھیں جس میں فلاح امت کے دائمی اصول وضوابط کی تشریح دفعۃً اتنے لوگوں کے سامنے کردی جائے کہ آئندہ اختلاف و انتشار کے دروازے بند ہوجائیں اس موقع پر جو بات بھی کہی جاتی وہ امت کی شیرازہ بندی اور اجتماعیت کی تکوین میں بیش بہا کردار انجام دینے کا باعث ہوتی، دراصل یہ وہ اہم موقع تھا کہ جب رسولؐ خدا نے فرد کو مسلمان بنانے کے علاوہ اپنے تاریخی خطاب اور منشور کی مدد سے ایک باقاعدہ اور باضابطہ مسلم قوم کی تشکیل کی۔

پیغمبرؐ اسلام کے سامنے اس وقت دو اہم فریضے تھے ایک تو مسلمانوں کو ایک قومیت میں ڈھالنے اور انہیں ایک مخصوص اسلامی تہذیب کا پابند بنانے کے لیے زندگی کے معنی اور امکانات کی مکمل تشریح کرنے والے ضابطہ حیات، فکر اور اخلاق کو ایک کو دوسرے سے مربوط کرنے والے عوامل اور عمل و عقیدہ کے درمیان دوئی کے مٹانے والے محرکات کی تبلیغ اور تاکید تھی اور دوسرا فریضہ اس قیادت کے متعلق تمام شکوک و ابہامات کا رفع کردینا تھا جو پیغمبرؐ اسلام کے بعد پیغمبرؐ ہی کی طرح اسلام اور مشیت الٰہی کے رموز کا عرفان رکھتی ہو اور دینی مزاج میں ہر طرح کی آمیزش کی مزاحمت کرکے مسلم قوم کی صحیح راہنمائی کرسکے۔ اگر ان دونوں باتوں کو ایک ہی خطاب میں کہہ دیا جاتا تو فطرتاً قیادت کی اہمیت ایک ضمنی اور فرعی حیثیت اختیار کرلیتی لہٰذا مکمل اہمیت واضح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ دونوں فریضوں کو علیحدہ علیحدہ موقع پر مگر ایک نسق میں ادا کیا جائے تاکہ ان دونوں کا باہمی ربط اور مستقل اہمیت دونوں ہی کا امت مسلمہ کو احساس ہوجائے۔

پہلے فریضے کی ادائیگی اور انسانوں کے نام دائمی قدر و قیمت رکھنے والے منشور و دستور کی تبلیغ کے لئے نہم ذی الحجہ ۱۰ھ کو جمعہ کے دن جبل الرحمہ سے میدان عرفات کے لاکھوں حاضرین کو پیغمبرؐ اسلام نے مخاطب فرمایا اور منشور کی ہر ہر دفعہ پر حاضرین کو خبردار اور اللہ کو گواہ بنایا۔ تاریخ نے اس تاریخ ساز منشور کو محفوظ رکھا ہے جس سے آج بھی اکتساب سعادت کیا جاسکتا ہے (خطبہ کا متن سیرت ابن ہشام اور جاحظ کی البیان والتبیین سے ماخوذ ہے)۔

سب تعریفیں خدا ہی کے لیے ہیں ہم (بھی) اسی کی تعریف کرتے ہیں اسی سے مدد کے طالب ہیں۔ اسی کی بارگاہ میں استغفار کرتے ہیں اور اسی کے سامنے توبہ کرتے ہیں، اور اللہ ہی سے اپنے نفس کی برائیوں اور اعمال کی خرابیوں سے پناہ مانگتے ہیں، اللہ جس کی ہدایت کرے اسے کوئی گمراہ

نہیں کرسکتا اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو پھر اسے راہِ راست پر کوئی نہیں لگا سکتا۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے۔

بندگان خدا میں تم کو تقوی خدا کی وصیت کرتا ہوں۔ اس کی اطاعت پر تمہیں اُبھارتا ہوں اور میں اچھی چیزوں ہی سے فتح و کامرانی کا طالب ہوں۔

ایھاالناس! میری باتیں سنو، میں تمہیں صاف صاف بتانا چاہتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ سال تم سے پھر یہاں ملنے کا موقع نہ مل سکے۔

ایھاالناس! تمہارے خون اور تمہارے اموال (ایک دوسرے پر) حرام ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملاقات کرو، ان میں ایسی ہی حرمت ہے کہ جیسی تمہارے اس شہر اور تمہارے اس مہینہ میں تمہارے آج کے دن کی اور عنقریب تم اپنے رب سے ملاقات کرو گے خبردار میں نے تبلیغ کردی؟ بارالہا تو گواہ رہنا۔

دیکھو جس کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ امانت رکھوانے والے کے پاس ضرور واپس کردے۔

جاہلیت میں رائج سود ختم کیا جاتا ہے البتہ راس المال پر تمہیں حق حاصل ہے (اس سلسلہ میں) نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تمہارے اوپر ظلم کرے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ سود نہیں چلے گا اور پہلا سود جس کے ختم کرنے کی میں ابتداء کرتا ہوں خود میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کا ہے۔

زمانہ جاہلیت سے جو خون باقی چلے آرہے ہیں (یعنی بدلہ لینے سے رہ گئے ہیں) وہ اب ساقط کیے جاتے ہیں اور پہلا خون جس سے سقوط کا آغاز کرتا ہوں عامر بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا ہے۔

دیکھو جاہلیت کی تمام رسمیں بھی ختم کی جاتی ہیں، اب کعبہ کی نگہبانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ اور کوئی عہدہ باقی نہ رہے گا۔

''قتل عمد'' میں قصاص ہے اور ''شبہ عمد'' میں ڈنڈے اور پتھر (وغیرہ) سے لازم ہو سو اونٹوں کا جرمانہ جو اس سے زیادہ لے وہ اہلِ جاہلیت میں سے ہے۔

خبردار! میں نے تبلیغ کردی؟ بارِ الہا تو گواہ رہنا۔

ایھاالناس! شیطان کو اب اس سے تو مایوسی ہوگئی ہے کہ تیری اس سرزمین پر اس کی پرستش ہوسکے، مگر اس کے ماسوا وہ اس بات پر راضی ہے کہ اس کی اطاعت تمہارے ان اعمال میں ہو جنہیں

تم اپنی دانست میں حقیر سمجھتے ہو۔ لہٰذا شیطان سے اپنے دین کے معاملہ میں ہوشیار رہنا۔

ایھاالناس! مہینوں میں لون لگانا کفر میں سراسر زیادتی ہے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ اس ذریعہ سے خوب گمراہ کیے جارہے ہیں لوگ ایک سال میں کسی مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال حرام بنادیتے ہیں تاکہ وہ تعداد پوری کردیں جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے اب زمانہ چکر کھاکے اسی ہیئت پر آ گیا ہے جس ہیئت پر اس دن تھا کہ جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا'' جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اللہ کے نزدیک کتاب خدا میں مہینوں کی گنتی بارہ ہے''۔ ان میں چار مہینے حرام ہیں'' تین لگاتار اور ایک اکیلا۔ ذی قعدہ ذی الحجہ اور محرم۔ اور رجب جو کہ جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔!

خبردار! میں نے تبلیغ کردی؟ بارالٰہا تو گواہ رہنا۔

ایھاالناس! تمہاری عورتوں کا بھی تمہارے اوپر ایک حق ہے اور تمہارا بھی ان پر حق ہے۔ تمہاری طرف سے ان پر فرض یہ ہے کہ تمہارے بستروں کو غیروں سے نہ روندوائیں اور تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھروں میں ان اشخاص کو نہ آنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔ کسی فحش امر کا ارتکاب نہ کریں اور اگر کر ہی گزریں تو پھر اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم سختی سے روکو، ان کے ساتھ ہمبستری چھوڑ دو اور اگر ضرورت ہو تو انہیں معمولی زدوکوب کرو، اگر وہ باز آجائیں اور تمہاری اطاعت کریں تو پھر انہیں اچھی طرح کھلانا پہنانا تمہارے اوپر لازم ہے (دیکھو) عورتیں (بالعموم) زیادہ تجربہ اور سمجھ نہیں رکھتی ہیں اور اپنے لیے کسی چیز پر قابو نہیں رکھتی ہیں، تم نے اللہ کی امانت کی حیثیت سے انہیں حاصل کیا اور اللہ کے کلمات کے ذریعہ انہیں اپنے لیے حلال بناتے ہو لہٰذا عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو اور ان کے متعلق اچھی وصیت کو یاد رکھو۔

ایھاالناس! میری بات کو گرہ میں باندھ لو اور یہ بات بخوبی سمجھ لو کہ تمام مومن بھائی بھائی ہیں اور بلاطلب خاطر کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں ہے۔ دیکھو اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرنا۔

میرے بعد پلٹ کر کافر نہ ہوجانا اور ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا، میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ دی ہے کہ جس سے تمسک کرکے تم گمراہ نہ ہوگے۔ کتاب اللہ (سیرت ابن ہشام میں کتاب اللہ کا ذکر کیا ہے مگر دونوں ہی صورتوں میں تحریف یقینی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ پیغمبر، اسلام نے ایسے مواقع پر قرآن اور اہل بیتؑ وعترت کا ذکر متواتر کیا ہے)۔

ایھاالناس! تمہارا رب ایک ہے تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے بنے۔ اللہ کے نزدیک زیادہ بزرگی والا وہی ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہو عربی کو عجمی پر سوائے تقویٰ کے اور کسی بات سے برتری نہیں ہے۔

خبردار! میں نے تبلیغ کردی؟ بارِ الٰہا تو گواہ رہنا۔ لوگوں نے بھی کہا ''بہت بہتر'' تو پیغمبرؐ نے فرمایا تو پھر حاضر غائب کو پہنچادے۔

ایھاالناس! میراث میں اللہ نے وارث کا حصہ مقرر کردیا ہے اب وارث کے لئے کسی (خصوصی) وصیت کی ضرورت نہیں اور ایک تہائی سے زیادہ مال میں تو وصیت جائز ہی نہیں ہے۔ لڑکا بستر (کے مالک) کا ہوگا اور بدکار کے لئے تو صرف پتھر، جو پدرِ اصلی کے علاوہ اپنے کو کسی اور کی طرف منسوب کرے گا یا اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی اور کو مالک سمجھے گا تو اس پر اللہ ملائکہ اور لوگوں کی لعنت ہو۔ اس کا کوئی حیلہ بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

فرائض رسالت سے متعلق یہ ایک رخ تھا جس کی شناخت کے لیے عرفات کا میدان منتخب کیا گیا۔ اس خطاب میں حدود و احکام باہمی روابط اہلی اور سماجی زندگی سے متعلق ان اخلاقی و روحانی ضوابط کی نشان دہی کی گئی جن سے اسلامی زندگی طرزِ فکر کی مجموعی حیثیت سے عبارت ہے۔

فرائض رسالت کے دوسرے رُخ کی تبلیغ کے لیے ۱۸ رذی الحجہ کا دن اور غدیر کا میدان منتخب کیا گیا۔ جبکہ آنحضرتؐ مراسم حج ادا کرکے واپس ہورہے ہیں اور اس منزل تک پہنچ گئے تھے جہاں سے راستے مختلف سمتوں میں بدلتے تھے۔ اکثریت کی توقع کے برخلاف جو یہ سمجھ رہی تھی کہ پیغمبرؐ کو جو کچھ کہنا تھا وہ عرفات کے میدان میں فرما چکے، ایک نئے اہم پیغام کے پہنچانے کا بندوبست شروع ہوا عرفات کے میدان میں آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا اس کے متعلق تو یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ لوگ جمع تھے ہی موقع کو مناسب جان کر پیغمبرؐ نے اوامر و نواہی سے متعلق بنیادی باتیں بتادیں مگر غدیرخم میں مجمع کو خصوصیت سے روکا گیا۔ آگے بڑھ جانے والوں کو واپس بلایا گیا پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کیا گیا اور پھر رسولؐ اکرم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو تاریخ میں محفوظ ہے اس خطبہ کا مقابلہ اگر میدان عرفات والے خطبے سے کیا جائے تو پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ دونوں کے نہ صرف بہت سے مطالب مشترک ہیں بلکہ الفاظ ولب ولہجہ اور تاکید و آگاہی کا انداز بھی مشترک ہے غالباً اس سے مقصد یہ رہا ہوگا غدیر و عرفات کے میدان میں کہی گئی باتوں کو ایک دوسرے پر موقوف سمجھا

جائے۔ کوئی بھی عملی مذہب ہو بغیر ایک نظام عدالت اور نظام امارت کے نہیں چل سکتا عرفات کے میدان میں انسانوں کو نظام عدالت کی تفہیم کی گئی میدان غدیر میں اسلام کے مستقل جاری رہنے والے نظام امارت کی تبلیغ کر کے پیغمبرؐ نے اس منشور کی تکمیل کردی جسے تیئیس ۲۳ سالہ تبلیغی زندگی اور غرض بعثت کا حاصل کہنا چاہئے۔

تاویل تشریح اور تفسیر بالرائے کے ذریعہ سے بعد میں نمودار ہونے والی نسل جو الجھن جی چاہے پیدا کرے یا جس الجھن میں جی چاہے اپنے کو مبتلا کرے مگر غدیر کے میدان میں موجود انسانوں نے پیغمبرؐ کی زبان سے بھی سُنا کہ من کنت مولا فھذا علی مولا اور ان لاکھوں انسانوں میں سے کسی ایک کو بھی اس وقت مولا کے معنی میں شبہ نہیں ہوا ورنہ کسی نہ کسی کو تو یہ پوچھ ہی لینا چاہئے تھا کہ حضور کا مدعا ومقصد کیا ہے جبکہ بالعموم اصحاب معمولی باتوں کے پوچھنے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔

زندگانی پیغمبر اسلام:
معاہدۂ صلح حدیبیہ کا متن

آیت اللہ جعفر سبحانی

عصر حاضر میں عالمی سامراجی طاقتیں اور ان کی رضا و خوشنودی میں ہمہ تن سرگرم وسائل ابلاغ عامہ کی حتی الامکان کوشش یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی اور قتل و غارتگری سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کردیں لیکن ان اسلام دشمن الزامات کو ثابت کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس نہ ماضی میں کوئی دلیل تھی اور نہ موجودہ زمانہ میں رونما ہونے والے حوادث میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت موجود ہے البتہ بیشمار تاریخی شواہد اور ناقابل تردید اسناد و مدارک کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسلام خداوند عالم کا وہ پسندیدہ دین ہے جس نے انسانی دنیا کو صلح و سلامتی اور انسان دوستی کا پیغام دیا ہے اور جس کا مخاطب فقط مسلمان و صاحب ایمان ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان ہے اور جس نے ایک مرد بیگناہ کے قاتل کو انسانی دنیا کا قاتل قرار دیا ہے اور جس کی صلح پسندی کا یہ عالم ہے کہ جنگ و نبرد آزمائی کے مقابلے میں صلح کو ترجیح دیتا ہے چاہے بعض مخلصین کو اس صلح سے بظاہر شکست کا احساس کیوں نہ ہورہا ہو۔ واضح رہے کہ بعض اصحاب و مخلصین کی ناراضگی کے باوجود جنگ و خونریزی اور تباہی و بربادی سے بچنے کے لئے پیغمبر اکرمؐ نے متن معاہدۂ صلح حدیبیہ پر دستخط کردیئے ہیں جو حاضر خدمت ہے۔ ادارہ

آخر کار معاہدہ کے عناوین اور موضوعات کے سلسلے میں موافقت کے بعد پیغمبر اکرمؐ اور قریش کے درمیان ایک قرارداد کی تدوین عمل میں آئی جس میں درج ذیل موضوعات شامل ہیں۔

۱- قریش اور مسلمان دونوں یہ عہد کرتے ہیں کہ آئندہ دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف جنگ اور تجاوز نہ کریں گے تاکہ عربستان کے ہر علاقے میں مجموعی امن و سلامتی اور صلح عمومی قائم ہوجائے۔

۲- اگر قریش کا کوئی فرد اپنے خانوادہ کے بزرگ کی اجازت کے بغیر سرزمین مکہ سے فرار اختیار

کرتے ہوئے اسلام قبول کرلے اور مسلمانوں میں شامل ہوجائے تو محمد اس شخص کو قریش کے حوالے کردیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان قریش کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ بات لازمی نہ ہوگی کہ قریش اس شخص کو مسلمانوں کے حوالے کریں۔

۳۔ مسلمان اور قریش جس قبیلے کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔

۴۔ محمد اور ان کے ساتھی اس سال اسی جگہ سے مدینہ واپس چلے جائیں لیکن آئندہ سالوں میں وہ لوگ پوری آزادی کے ساتھ مکہ جاکر خانۂ خدا کی زیارت کرسکتے ہیں لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ لوگ تین روز سے زیادہ سرزمین مکہ میں توقف نہ کریں گے اور اسلحۂ سفر یعنی ایک تلوار کے علاوہ یہ لوگ کوئی دوسرا اسلحہ اپنے ساتھ مکہ نہ لے جائیں گے۔[۱]

۵۔ اس معاہدہ کے بموجب مکہ میں مقیم مسلمانوں کو اپنے مذہبی شعائر کو انجام دینے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی اور قریش کو انہیں کسی طرح کی معمولی سی اذیت پہنچانے کا حق حاصل نہ ہوگا یا ان لوگوں کو اس بات کے لئے مجبور نہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب سے روگردانی اختیار کریں یا اس کا مذاق اڑائیں۔[۲]

۶۔ معاہدہ پر دستخط کرنے والے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کی اموال و املاک کا احترام کریں گے مکر و فریب اور حیلہ و خدعہ سے دوری و علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ایک دوسرے کے لئے ان کے قلوب ہر طرح کے کینہ سے خالی رہیں گے یعنی فریقین ایک دوسرے کے ساتھ مکر و فریب اور کینہ پروری سے کام نہ لیں گے۔

۷۔ جو مسلمان مدینہ سے مکہ وارد ہونگے ان کی زندگی اور ان کے مال کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔[۳]

یہ معاہدہ صلح حدیبیہ کا متن ہے جن کو مختلف اسناد و مدارک کی مدد سے جمع کیا گیا ہے اور ان میں سے بعض کی نشاندہی بھی حاشیہ میں کردی گئی ہے۔ مذکورہ دفعات وعنوانات پر مشتمل اس معاہدہ کے دو نسخے تیار کئے گئے۔ اس کے بعد قریش اور اسلام کی نامور شخصیتوں نے اس معاہدہ کی گواہی دی اور اس کے بعد صلح نامہ کا ایک نسخہ ''سہیل'' اور دوسرا پیغمبر کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔[۴]

۱۔ سیرۂ حلبی، ج ۳، ص ۲۴ ۲۔ بحار، ج ۲۰، ص ۳۵۳ ۳۔ مجمع البیان، ج ۹، ص ۱۱۷

۴۔ سیرۂ حلبی، ج ۳، ص ۲۵، ۲۶

قاصد آزاد

اس معاہدہ کے مطالعے سے ہر بے غرض اور مخلص دانشمند کو یہ سمجھنے میں تاخیر نہیں ہوتی کہ یہ معاہدہ آزادی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اس معاہدہ کی ہر دفعہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کی دوسری دفعہ نہایت حساس اور توجہ طلب ہے جس کی وجہ سے کچھ لوگ بھڑک گئے تھے اور اصحاب پیغمبر اس امتیازی برتاؤ کی وجہ سے غیر معمولی طور پر ناراض ہو گئے تھے اور پیغمبر اسلام جیسے قائد کی قیادت و رہبری کے سلسلے میں ایسی باتیں کہنے لگے جو ان لوگوں کو نہ کہنا چاہیے۔ صلح نامہ کی یہ دفعہ آج بھی ایک مشعل کی طرح روشن و تابناک ہے۔ اس دفعہ کے ذریعہ پیغمبر اسلام نے اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جو راہ و روش اختیار کی تھی اس کی عملی وضاحت ہو جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ معاہدہ کی اس دفعہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت اصول آزادی کو غیر معمول طور پر عزیز و محترم خیال کرتے تھے۔

بعض اصحاب نے اعتراض آمیز لہجے میں پیغمبر سے سوال کیا کہ ہم لوگ قریش کے پناہ گزینوں کو ان کے حوالے کیوں کریں جب وہ لوگ ہمارے فراری گروہ کو ہماری تحویل میں دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں؟ پیغمبر نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ''جو مسلمان پرچم اسلام کے سایہ سے نکل کر شرک کی طرف فرار اختیار کرے اور بت پرستی و انسان دشمن آئین کو اسلامی ماحول اور آئین خداپرستی پر ترجیح دے اس کے بارے میں یہ حقیقت بخوبی واضح ہے کہ اس نے خلوص نیت اور دل کی گہرائی سے اسلام قبول نہیں کیا ہے اور اس کا ایمان صحیح بنیادوں پر مستحکم نہیں رہا ہے اور ایسا مسلمان ہمارے کام کا ہرگز نہیں ہے۔ دوسری طرف ہم لوگ قریش کے پناہ گزیں افراد کو اس لئے ان کی تحویل میں دے دیں گے کہ ہمیں مکمل اطمینان ہے کہ خداوند عالم ان لوگوں کی ہدایت و نجات کا وسیلہ یقیناً فراہم کردے گا۔[1]

پیغمبر کا یہ نظریہ عقل و منطق کے اصولوں کے مطابق تھا اور یہ بات وقت کی رفتار کے ساتھ بخوبی واضح بھی ہوگئی چنانچہ تھوڑی مدت گزرنے کے بعد اس دفعہ کی وجہ سے قریش کے درمیان رونما ہونے والے بعض ناگوار حوادث کی وجہ سے ان لوگوں نے اس کی منسوخی کا مطالبہ شروع کر دیا جس کی تفصیلی وضاحت آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

۱۔ سیرۂ حلبی، ج ۳، ص ۱۱۲؛ بحار، ج ۲۰، ص ۳۱۳

صلح نامہ کی یہ دفعہ ان مستشرقین کی مغرضانہ تبلیغات کا دندان شکن جواب ہے جو اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسلام کی حیرت انگیز کامیابی و عالمگیر مقبولیت کا راز تلوار کی طاقت میں مضمر ہے یہ لوگ اس ترقی کو اسلام کی عظمت و فضیلت تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں جس نے مختصر سی مدت میں دنیا کے اکثر علاقوں میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ اس حقیقت سے انحراف اختیار کرتے ہوئے ان لوگوں نے عوام الناس کے درمیان بدگمانی پھیلانے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی و غیر معمولی مقبولیت کی بنیادی وجہ مسلمانوں کے تلوار کی طاقت میں پوشیدہ ہے جب کہ یہ تاریخی معاہدہ ہزاروں افراد کی نگاہوں کے سامنے دونوں جماعت کے رہنماؤں کی موجودگی میں انجام پایا اور جو اسلامی روح اور تعلیمات کی مکمل عکاسی بھی کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ کہنا حقیقت سے کوسوں دور کی بات ہوگی کہ اسلام اور مسلمانوں نے تلوار کی طاقت سے یہ کامیابی و ترقی حاصل کی ہے۔

قبیلۂ ''خزاعہ'' کے لوگ بھی اس معاہدہ کی دفعہ ۳ کے سایہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہم معاہدہ ہوگئے اور قبیلۂ ''بنی کنانہ'' والوں نے جو قبیلۂ ''خزاعہ'' کے جانی دشمن تھے، قریش کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کر دیا۔

صلح کی حفاظت کی آخری کوشش

معاہدہ کے ابتدائی مراحل اور متن کا مکمل تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ معاہدہ کا بیشتر حصہ تحمیلی اور تسلط آمیز پہلوؤں کا حامل ہے۔ اس معاہدہ کے لئے پیغمبر کا آمادہ ہونا، لقب ''رسول اللہ'' کا معاہدہ کے متن سے حذف کیا جانا اور دور جاہلیت کی طرح "بسمک اللھم" سے معاہدہ کی شروعات کو تسلیم کرلینا اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ہر قیمت پر عربستان میں صلح و سلامتی کا ماحول قائم کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ قریش کے مسلمان پناہ گزینوں کو بت پرست حکومت کے افسروں کی تحویل میں دینے کے لئے راضی ہوگئے تو اس کی وجہ در اصل ''سہیل'' کی لجاجت اور ہٹ دھرمی تھی۔ لوگ پناہ گزینوں کے سلسلے میں اپنائے گئے امتیازی سلوک کی وجہ سے ناراض تھے لیکن اگر پیغمبر نے سہیل کی بات نہ مانی ہوتی تو گفتگو کا سلسلہ ختم ہوجاتا اور صلح کا قیام ناممکن ہوجاتا اور آنے والے وقت میں حیرت انگیز نتائج کی حامل یہ عظیم نعمت ہاتھ سے نکل جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ پیغمبر اکرمؐ نے مذکورہ بالا مقصد کی حفاظت کی خاطر ہر طرح کے دباؤ کا بوجھ قبول کرلیا تاکہ اس مقصد عظیم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے جس کے لئے اس قسم کے مسائل و مصائب کی کوئی اہمیت نہیں رہ

جاتی۔ پیغمبر اکرم افکار عمومی اوراس جماعت کے حقوق کا لحاظ رکھتے تھے اور ''سہیل'' اپنی مخصوص لجاجت و ہٹ دھرمی کی وجہ سے جنگ کی آگ بھڑکادیا کرتا تھا۔ درج ذیل واقعہ سے اس قول کی تصدیق ہوجاتی ہے۔

معاہدہ کی دفعات کے سلسلے میں ہونے والی گفتگوختم ہوگئی تھی اور حضرت علی علیہ السلام صلح نامہ لکھنے میں مشغول تھے کہ اچانک ''سہیل'' کا بیٹا ''ابوجندل'' جوصلح نامہ کی تحریر میں قریش کا نمائندہ تھا اور جس کے پیروں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی، اس جلسہ میں داخل ہوا۔ سبھی لوگ اس کی آمد سے حیران ہوگئے کیونکہ بہت دنوں سے وہ باپ کے قیدخانہ میں زندگی بسر کررہا تھا اور اس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بے گناہ قیدی تھا اور اس کا گناہ یہ تھا کہ اس نے مذہب توحید پرستی قبول کرلیا تھا اور اس کا شمار پیغمبر کے چاہنے والوں میں ہونے لگا تھا۔ قیدخانہ کے اردگرد ہونے والی گفتگو سے ''ابوجندل'' کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ مسلمان ''حدیبیہ'' تک آچکے ہیں۔[1] لہٰذا اس نے قیدخانہ سے فرار اختیا کیا اور عام راستہ سے نہیں بلکہ پہاڑوں کو پارکرتے ہوئے خود کو مسلمانوں تک پہونچانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ جیسے ہی سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھا اس کے غصہ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ انتہائی غیظ وغضب کے عالم میں اس نے اپنے بیٹے کے چہرہ پر بھرپور طمانچہ رسید کردیا۔ اس کے بعد اس نے پیغمبر کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ پہلا آدمی ہے جس کو اس معاہدہ کی دفعہ دوم کے مطابق مکہ واپس کردینا چاہیے یعنی ہماری طرف سے فرار کرنے والے کو ہمارے حوالے کردیجئے۔ اس سلسلے میں ذرہ برابر گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ''سہیل'' کا مطالبہ بالکل غلط اور بے بنیاد تھا کیونکہ ابھی معاہدہ کتبی صورت میں تیار بھی نہیں ہوا تھا اور طرفین نے اس پر دستخط بھی نہیں کئے تھے۔ جس معاہدہ نے ابھی آخری مراحل بھی طے نہیں کئے اس کو یک طرفہ سند کے طور پر کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا:

''ابھی تو معاہدہ پر دستخط بھی نہیں ہوئے''۔ سہیل نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں تمام باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کو بنیادی طور پر ختم کردوں گا۔ اس نے اپنی بات پر اصرار کیا کہ قریش کی دو بڑی شخصیتوں کو، جن کا نام ''مکرز'' اور ''حویطب'' تھا سہیل کی شدت پسندی پر غصہ آگیا۔ ان لوگوں نے ''ابوجندل'' کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک خیمہ میں داخل کردیا اور پیغمبر سے فرمایا ''کوئی بات

۱- حدیبیہ درحقیقت حدیبا کی تصغیر اور شہر مکہ سے نومیل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس علاقے کی زیادہ تر زمین حرم کا حصہ ہے

نہیں ابوجندل آپ کی پناہ میں رہے''۔

وہ لوگ اس بات کو اسی جگہ پر ختم کردینا چاہتے تھے لیکن ''سہیل'' کا اصرار بڑھتا گیا اور ان لوگوں کی تدبیر ناکام ہوگئی۔ اس نے اپنی بات پر اٹل رہتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک مذاکرہ و گفتگو کا سوال ہے معاہدہ مکمل ہو چکا تھا۔ آخر کار پیغمبر مجبور ہوگئے۔ ان کی نظر میں صلح کی بڑی اہمیت تھی۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھی پرامن ماحول ضروری تھا لہذا صلح و سلامتی کی راہ میں آخری کوشش کے طور پر وہ راضی ہوگئے کہ ابوجندل اپنے باپ کے ہمراہ مکہ واپس چلے جائیں پس اس مسلمان قیدی کی دلجوئی کرتے ہوئے پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا:

''ابوجندل! تم صبر وتحمل سے کام لو۔ ہم لوگوں نے تمہارے والد سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ لطف و محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہیں ہمارے حوالے کردیں لیکن انہوں نے ہماری بات نہیں مانی۔ تم صبر وتحمل سے کام لو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ خداوند عالم تمہاری اور تم جیسے دیگر افراد کی نجات کی راہ ہموار کردے گا''۔

گفتگو ختم ہوگئی اور صلح نامہ کے دونوں نسخوں پر دستخط بھی ہوگئے۔ سہیل اور اس کے احباب مکہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابوجندل بھی ''مکرز اور حویطب'' کی حمایت میں مکہ واپس چلے گئے اور پیغمبر اکرمؐ نے احرام سے خارج ہونے کے لئے اپنے اونٹ کو اسی مقام پر نحر کردیا اور اپنے سر کے بال بھی اتروادیئے اور جماعت میں موجود دیگر افراد نے بھی پیغمبر کی سیرت کی پیروی کی۔[1]

معاہدہ حدیبیہ کا تجزیہ

پیغمبر اکرمؐ اور سرداران شرک کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوگیا اور سرزمین ''حدیبیہ'' میں ۱۹ روز کے توقف کے بعد مسلمان مدینہ کی طرف اور بت پرست مکہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

معاہدہ کی کتابت کے دوران اور اس کے بعد بھی پیغمبرؐ کے اصحاب کے درمیان اختلافات اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ان لوگوں کی ایک جماعت اس معاہدہ کو اسلام کے لئے مفید و سودمند قرار دیتی تھی لیکن معدودے چند ایسے لوگ بھی تھے جو اس معاہدہ کو اسلامی مفاد و مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ سردست اس معاہدہ کے بعد چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن ہر طرح کے تعصب سے دور حقیقتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ذیل میں اس کا اجمالی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ قارئین کرام کو

۱۔ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۲۸۱؛ بحار، ج ۲۰، ص ۳۵۳؛ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ۳۱۸

اصحاب کے درمیان ہونے والے مباحثات کا اندازہ ہوسکے اور معاہدہ کے تمام پہلوؤں کی بھرپور وضاحت بھی ہوسکے۔

ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ صلح سو فیصدی اسلام کے حق میں مفید تھی اور اس کی وجہ سے اسلام کی کامیابی یقینی ہوگئی۔ ذیل میں اس کی دلیلیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱- معاہدہ سے قبل لگاتار حملات اور ان کی داخلی و خارجی سرگرمیوں کا مختصر خاکہ جنگ اُحد اور جنگ احزاب کی شکل میں پیش کیا جاچکا ہے۔ ان لوگوں کی ان معاندانہ حرکتوں کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ کو موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ وہ دیگر قبائل اور عربستان کے باہر زندگی بسر کرنے والوں کے درمیان دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیں بلکہ ان کا زیادہ تر وقت دشمنوں سے دفاع اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے میں گزر جایا کرتا تھا لیکن اس معاہدہ کے بعد پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو جنوبی علاقے سے اطمینان ہوگیا اور اس کے ساتھ دیگر علاقوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی زمین ہموار ہوگئی۔ دو سال گزرنے کے بعد اس امن و سلامتی کا نتیجہ ظاہر ہوگیا کیونکہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ کے ساتھیوں کی تعداد ۱۴۰۰ افراد پر مشتمل تھی لیکن دو سال بعد جب پیغمبر فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو دس ہزار لوگ پرچم اسلام کے سایہ میں مکہ کی طرف گامزن تھے اور یہ نمایاں فرق درحقیقت ''صلح حدیبیہ'' کا براہ راست نتیجہ تھا۔

قریش کے ڈر کی وجہ سے لوگ اسلام اور مسلمانوں سے نہیں ملا کرتے تھے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش نے اسلام کے وجود کو باقاعدہ تسلیم کرلیا تھا اور قبائل کو اسلام کی طرف راغب ہونے کی آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کے لئے کوئی خوف وخطرہ باقی نہ رہ گیا تھا بلکہ مسلمان آزادی فکر کے ساتھ اسلام کی تبلیغ میں سرگرم ہوگئے تھے۔

۲- معاہدہ صلح حدیبیہ سے مسلمانوں کو دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مشرکین نے عوام اور اسلام کے درمیان جو آہنی دیوار قائم کررکھی تھی وہ خود بخود گرگئی۔ مدینہ کی طرف آمد و رفت کی آزادی مل گئی اور ان لوگوں نے اپنے سفر کے دوران مدینہ میں مقیم مسلمانوں کے ساتھ تعلقات بھی قائم کئے اور اسلام کی مفید تعلیمات سے واقفیت بھی حاصل کی۔

مسلمانوں کے نظم و انتظام اور صاحبان ایمان افراد کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ کی مخلصانہ پیروی کو دیکھ کر قریش کے ہوش اڑ گئے۔ نماز کے وقت باوضو مسلمانوں کی نظافت، نمازیوں کی منظم اور مثالی صفیں،

پیغمبر اکرمؐ کی پرجوش اور دلکش تقریریں اور قرآن مجید کی لذت آمیز آیات کو، جو فصاحت و سلاست و بلاغت کی انتہا پر فائز تھیں، سن کر لوگ اسلام کے گرویدہ ہونے لگے۔ دوسری طرف مسلمان اس معاہدہ کے بعد مختلف حیثیت سے مکہ اور اس کے اطراف میں واقع علاقوں میں آنے جانے لگے اور اپنے دیرینہ دوستوں اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ملاقات و گفتگو کے دوران اسلام کی تبلیغ بھی کرنے لگے۔ فطری طور پر اسلامی قوانین کی خوبیوں کا ذکر رہنے لگا اور آداب و رسوم اور حلال و حرام کا چرچا بھی ہونے لگا جس کا اہم ترین نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خالد بن ولید اور عمر و عاص جیسے لوگ فتح مکہ سے پہلے ہی مسلمانوں سے وابستہ ہوگئے۔ اسلام کی حقیقت سے اس قسم کی واقفیت و آگاہی نے فتح مکہ کی زمین ہموار کردی اور وقت کی رفتار کے ساتھ وہ اسباب و عوامل بھی فراہم کردیئے جن کی وجہ سے بت پرستی کا یہ عظیم مرکز کسی قسم کی مقابلہ آرائی کے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور لوگ آہستہ آہستہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ہجرت کے آٹھویں سال کے واقعات کے ذیل میں ان باتوں کا تفصیلی ذکر پیش کیا جائے گا لیکن مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ عظیم کامیابی لوگوں کے درمیان نزدیکی تعلقات کی تشکیل، خوف و دہشت کے اختتام اور تبلیغ اسلام کے سلسلے میں موجود آزادی کی مرہون منت ہے۔

۳۔ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ اس معاہدہ کی تشکیل کے موقع پر سرداران شرک کے قریبی تعلقات کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی اکثر روحانی پیچیدگیوں کا حل مل گیا کیونکہ دوسری جانب سے مسلسل دباؤ اور بداخلاقی کے مقابلے میں پیغمبر کا حسن اخلاق، ان کی رحمدلی اور ان کا صبر و تحمل نیز امن سلامتی کی حفاظت کے لئے ان کی مخلصانہ کوشش نے یہ ثابت کردیا کہ وہ خلق عظیم کا سرچشمہ اور تمام انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ تھے۔

اگرچہ قریش کے ہاتھوں پیغمبر نے بڑے مصائب جھیلے تھے پھر بھی ان کا قلب انسان دوستی کے احساس سے لبریز تھا۔ خصوصی طور پر قریش نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ معاہدہ صلح کے دوران مسلط کردہ دفعات کے سلسلے میں انہوں نے اپنے زیادہ تر اصحاب کی مخالفت مول لی اور حرم و خانۂ خدا اور اپنی ولادت گاہ کے احترام کو جماعتی جذبات پر ترجیح دی۔

اس راہ و روش نے پیغمبرؐ کے سلسلے میں کی جانے والی ہر جھوٹی اور بے بنیاد تبلیغات کو بے اثر کردیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ وہ ایک ایسے انسان دوست اور صلح پسند انسان ہیں کہ اگر ایک دن انہوں نے

پورے عربستان پر بھی غلبہ حاصل کرلیا تو بھی اپنے دشمنوں کے خلاف کینہ و عداوت سے کام نہ لیں گے کیونکہ اس میں ذرہ برابر شک و تردید کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ جنگ کے لئے آمادہ ہوجاتے تو وہ ان لوگوں پر مکمل غلبہ حاصل کرلیتے اور سرداران قریش کے پاس بھاگنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہ رہ جاتا جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے کہ:

''اگر کافروں کے خلاف جنگ و نبرد آزمائی کرتے تو وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوتے اور انہیں کوئی یاور و مددگار نہ ملتا''۔[۱]

ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے مثالی صلح پسندی اور امن دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنیائے عرب کے ساتھ اپنی محبت اور نرمی کا مظاہرہ کیا اور مخالف پرپگنڈوں کو پوری طرح ناکام بنادیا۔

ان حقائق و ناقابل تردید دلائل کی روشنی میں اس صلح کے سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے: "و ما کان قضیة اعظم برکة منها"۔ یعنی پیغمبر اسلام کی تاریخ حیات میں صلح حدیبیہ سے زیادہ سودمند کوئی دوسرا واقعہ نہیں رہا ہے۔

آئندہ رونما ہونے والے حوادث نے یہ ثابت کردیا کہ اس معاہدہ کے سلسلے میں عمر بن خطاب جیسے بعض اصحاب نے جو اعتراضات کئے تھے وہ بالکل بے بنیاد تھے۔

سیرت نگاروں نے معترضین کے اعتراضات کی جملہ خصوصیات نقل کردی ہیں اور مزید اطلاع کے لئے ''سیرۃ ابن ہشام'' کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔[۲]

معاہدہ صلح حدیبیہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا کافی ہے کہ صلح نامہ پر دستخط کرنے کے بعد ابھی پیغمبر اسلام مدینہ پہونچے بھی نہیں تھے کہ مسلمانوں کو خوشخبری دینے والی سورۂ فتح نازل ہوگئی جس میں اس معاہدہ کو دوسری بڑی کامیابی یعنی فتح مکہ کا مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہوتا ہے: "انا فتحنا لک فتحا مبینا"۔

قریش معاہدہ کی ایک دفعہ کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہیں

کچھ ہی دنوں میں رونما ہونے والے تلخ حوادث کو نگاہ میں رکھتے ہوئے قریش پیغمبر اکرمؐ سے یہ مطالبہ کرنے کے لئے مجبور ہوگئے کہ معاہدہ صلح حدیبیہ کی دفعہ ۲ کو منسوخ کردیا جائے یہ وہی دفعہ ہے جس

۱- سورۂ فتح، آیت ۲۲، ولو قاتلکم الذین ..... ولا نصیرا ۲- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۱۶

نے پیغمبرؐ کے بعض اصحاب کے جذبات بھڑکا دیئے تھے اور جس کو پیغمبرؐ نے ''سہیل'' کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے قبول کرلیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ'' اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ قریش کے مسلمان فراریوں کو حکومت مکہ کے حوالے کردے گی لیکن قریش اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ مسلمان فراریوں کو پیغمبر کے حوالے کریں''۔ معاہدہ کی اس دفعہ سے بعض اصحاب بہت ناراض ہوگئے تھے لیکن پیغمبر نے مسکراتے ہوئے قریش کے اس مطالبہ کو تسلیم اور اسے معاہدہ میں شامل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:'' خداوند عالم قریش کے چنگل سے کمزور وسن رسیدہ مسلمانوں کی نجات کا راستہ فراہم کردیتا ہے''۔نجات کا راستہ اور معاہدہ کی دفعہ ۲ کی منسوخی کا سبب یہ ہے:

''ابوبصیر'' نامی ایک مسلمان ایک طویل مدت سے مشرکوں کے قیدخانہ میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اپنی خصوصی کوشش سے قیدخانہ سے آزادی حاصل کرلی اور بھاگ کر مدینہ آ گیا۔قریش کے دو نامور حضرات'' ازہر'' اور'' اخنس'' نے پیغمبر کو ایک خط لکھا اور یہ مطالبہ کیا کہ معاہدہ حدیبیہ کی دفعہ ۲ کے بموجب'' ابوبصیر'' کو قریش کے حوالے کردیجئے۔ ان لوگوں نے اپنے غلام'' بنی عامر'' کے ذریعہ یہ مکتوب پیغمبرؐ کے پاس بھیج دیا۔

پیغمبرؐ نے معاہدہ کے مطابق'' ابوبصیر'' سے کہا:'' تم اپنی قوم والوں کے پاس چلے جاؤ یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ ہم لوگ ان کے ساتھ مکر وفریب سے کام لیں۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ خداوند عالم تمہاری اور تم جیسے دیگر افراد کی آزادی کا سامان ضرور فراہم کردے گا''۔

ابو بصیر نے کہا'' کیا آپ مجھے ان مشرکوں کے حوالے کردینا چاہتے ہیں تاکہ وہ مجھے دین خدا سے دور رکھیں''۔ پیغمبر نے اپنی بات کو دوبارہ کہتے ہوئے ابوبصیر کو قریش کے نمائندوں کے حوالے کردیا اور وہ لوگ مکہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب وہ لوگ'' ذی الحلیفہ''[1] تک پہنچ گئے تو ابوبصیر تھکاوٹ کی وجہ سے دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد'' عامری'' کو دوستانہ لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا'' ذرا اپنی تلوار تو دکھانا'' اس نے اپنی تلوار ابوبصیر کے حوالے کردی جب تلوار ہاتھ میں آ گئی تو اس نے تلوار غلاف سے باہر نکالی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مرد عامری کو قتل کرڈالا۔'' غلام'' اس واقعہ سے بہت وحشت زدہ ہوا اور مدینہ کی طرف بھاگنے لگا۔ مدینہ پہنچ کر اس نے سارا واقعہ رسول خدا کی خدمت میں پیش کردیا۔ اس نے پیغمبرؐ سے کہا کہ'' ابوبصیر نے میرے رفیق کو قتل کرڈالا''۔ تھوڑی

۱۔ ذی الحلیفہ ایک گاؤں کا نام ہے جو مدینہ سے چھ سات میل کے فاصلے پر قائم ہے لوگ اس جگہ سے بھی مکہ کے لئے محرم ہوتے۔

ہی دیر میں ابوبصیر بھی وہاں آ گئے اور انہوں نے سارا ماجرا بیان کرتے ہوئے پیغمبر سے کہا:

''اے خدا کے رسول! آپ نے اپنے معاہدہ کے مطابق کام انجام دے دیا لیکن میں اس بات کے لئے قطعی آمادہ نہیں ہوں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ وابستہ ہوجاؤں جو میرے دین کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں''۔ یہ جملہ کہنے کے بعد ابوبصیر دریا کے اس ساحل کی طرف روانہ ہوگئے جہاں قریش کا قافلہ دریا کو عبور کرتا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور ''عیص'' نامی جگہ پر سکونت پذیر ہوگئے۔ مکہ میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کو بھی ابوبصیر کے حالات معلوم ہوئے تو تقریباً ۷۰ لوگ ابوبصیر کے اردگرد آباد ہوگئے۔ یہ ۷۰ طاقتور مسلمان قریش کے ظالمانہ سلوک سے تنگ آ چکے تھے۔ نہ ان لوگوں کی کوئی زندگی تھی اور نہ ہی انہیں کسی قسم کی آزادی حاصل ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ سے گزرنے والے قریش کے قافلوں کو لوٹیں گے اور جو قریش ان کے قبضہ میں آ گیا اسے قتل کرڈالیں گے۔ ان لوگوں نے ایسے ماہرانہ انداز میں اپنا کارنامہ انجام دیا کہ قریش کا جینا دوبھر ہوگیا لہذا ان لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کو ایک خط لکھا جس میں یہ درخواست کی کہ فریقین کی رضامندی سے معاہدہ کی دفعہ ۲ کو منسوخ کرتے ہوئے فراری مسلمانوں کو مدینہ بلالیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے مذکورہ دفعہ کو فریقین کی رضامندی سے منسوخ کردیا اور جو مسلمان فراری عیص نامی گاؤں میں سکونت پذیر ہوگئے تھے انہیں مدینہ بلالیا۔[1] اس طرح عام لوگوں کی نجات کا وسیلہ فراہم ہوگیا اور قریش اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہوگئے کہ صاحبان ایمان کو ہمیشہ کے لئے قیدی نہیں بنایا جاسکتا اور اس کو قید رکھنا اس کی آزادی سے زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے جس دن وہ فرار کرتا ہے دشمن سے انتقام لینے کا ٹھوس ارادہ رکھتا ہے۔

مسلمان خواتین قریش کی تحویل میں نہیں دی جاتی تھیں

معاہدہ صلح حدیبیہ پر دستخط ہوگئے۔ ''عقبہ بن ابی معیط'' کی بیٹی ام کلثوم مدینہ آ گئی۔ ''عمارہ'' اور ''ولید'' نامی اس کے دو بھائیوں نے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ معاہدہ کی دفعہ ۲ کے بموجب ان کی بہن کو ان کی تحویل میں دے دیا جائے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اس دفعہ میں خواتین شامل نہیں ہیں بلکہ وہ فقط مردوں کے لئے مخصوص ہے''۔[2] اس کے علاوہ سورہ ممتحنہ کی دسویں آیۂ کریمہ نے اس بات کو مزید واضح کردیا جس کا مفہوم یہ ہے: ''جب با ایمان خواتین پیغمبرؐ کی خدمت میں آ گئیں تو یہ ضروری ہے

۱- مغازی واقدی، ج ۲، ص ۶۲۴؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۸۴ ۲- سیرۂ ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۲۳

کہ ان کے ایمان کی آزمائش کی جائے اور اگر وہ اپنے ایمان میں پوری طرح مستحکم تھیں تو پھر انہیں کافروں کی طرف ہرگز نہ بھیجنا چاہیے کیونکہ مسلمان خاتون کافر کے لئے حرام ہے''۔[1]

یہ تھی داستان صلح حدیبیہ جس کے سایہ میں حاصل ہونے والے پرسکون ماحول میں پیغمبر نے دنیا کے بادشاہوں اور حاکموں سے خط و کتابت کے ذریعہ اپنی نبوت کی خبر دنیا والوں تک پہونچادی جس کی تفصیل آئندہ پیش کی جائے گی۔

۱۔ سورہ ممتحنہ، آیت ۱۰، یا ایھا الذین آمنوا..... و آتوھم انفقوا

مرسل اعظم قوم گری کی سنگلاخ وادی میں

مولانا سید غلام عسکری مرحوم

مشکل ترین کام

ہرگز مبالغہ نہ ہوگا اگر قوم گری اور ہدایت وتبلیغ کو عالم اسباب کا مشکل ترین کام قرار دیا جائے ۔ ایک بچہ جو بری عادتوں کا خوگر نہ ہوا ہو، اسے خوبیوں کا حامل انسان بنانے میں ماں باپ بلکہ پورا گھر محنت کرتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے ایسے مدرسین کی ضرورت ہوتی ہے، جو درجہ بدرجہ اس کو منازل انسانیت سے آشنا کراتے جائیں اس کے بعد بھی صرف امید ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بن سکے گا۔ یقین پھر بھی نہیں ہوتا اس کے برخلاف ایک لڑکا نالائق ہوجائے تو صرف ماں باپ، گھر اور خاندان والے، تعلیم گاہوں کے ماہرین اس کو درست کرنے میں ناکام رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایک بگڑے انسان کی تباہ کاریوں کو ملک و قانون بلکہ بین الاقوامی طاقتیں بھی نہیں روک سکتیں۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ پوری قوم کی تعلیم و تربیت، اور قومی کردار کی تعمیر کتنا مشکل کام ہے جو صرف ایک انسان (ہادی) کے سپرد کیا جاتا ہے۔ تبلیغ کی راہ میں رکاوٹوں کے طوفانی سمندر میں ہادی (نبی یا امام) ہدایت کی ہلکی پھلکی کشتی چلاتا ہے جبکہ کشتی میں نہ حکومت کا لنگر ہوتا ہے نہ دولت کا بادبان، نہ جماعت و طاقت کے پتوار ہوتے ہیں نہ سیاست و مصلحت کا دخانی انجمن اس پر مزید مشکل یہ ہوتی ہے کہ کشتی مشیت الٰہی کی راہ پر چلانا ہوتا ہے جس سے بال برابر انحراف بھی راستہ کو کھو دیتا ہے۔

ہادی یعنی نبی یا امام کو دوہری مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ایک خوف خدا کے کامل و مکمل عرفان کے سورج کے باعث ہادی پر بندگی کی کڑی دھوپ ہمہ وقت رہتی ہے دوسری طرف بگڑی قوم کی کند ذہنی، پرانی خصلتوں کا عشق بے شعور عوام کی خود فراموشی، خواص کی خود پرستی اور سبکی، خداناشناسی کا قدم قدم پر سامنا کرنا ہوتا ہے۔ سب سے بڑی دشواری ہادی کے لیے یہ ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ قومی بے راہ روی پر قابو پانا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک گمراہی کا ٹائیفائڈ قوم کی تعمیر کے بعد اقتدار کی ہوس کے باعث بار بار عود کرتا ہے اور ہر دوسرا حملہ پہلے حملہ سے سخت تر ہوتا ہے۔ جسمانی امراض میں

فالج تقریباً ناقابل علاج بیماری ہے جس سے کلی صحت ناممکن اور اس کے دوسرے حملہ سے محفوظ رہنا محال ہے مگر ہادی کو اپنی مفلوج قوم کا مکمل علاج کرنا پڑتا ہے۔ چاہے شہیدوں کا گرم گرم خون بار بار کام میں لانا پڑے۔ ''ہر انجام کو رنگ آغاز دینا'' ایک ایسا مشترک راستہ ہے جس پر قوم اور ہادی مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ قوم ہدایت کے ہر انجام کو گمراہی کا رنگِ آغاز دیتی رہتی ہے اور ہادی گمراہی کے ہر انجام کو ہدایت کا رنگِ آغاز دیتا رہتا ہے۔

جناب آدم سے امام حسن عسکریؑ تک دین کی پوری تاریخ کا یہی ڈھرہ رہا ہے اور اس نے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کو دنیا میں آنے پر مجبور کیا اور اسی نے ایک امام کے بعد دوسرے امام کو جامِ شہادت پلوایا ہے اس نے وارث کو غیبت کے پردہ میں جانے پر مجبور کیا ہے اور انجام و آغاز کا آخری معرکہ بعد میں ظہور پیش آنے والا ہے جس کے بعد دنیا کا آخری انجام سامنے آجائے گا۔ غرضکہ کہنا صرف اتنا تھا کہ ہادی کی ذمہ داری، قوم گری، تبلیغ و ہدایت اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

ناممکن کو ممکن بنانے والا

نبوت کو معراج ہوئی جب حضور تک پہنچی آگے بڑھنے کی گنجائش نہ پاکر ''ختمِ نبوت'' کی ''معراجی قوسین'' یعنی حضور کی نبوت و ائمہ اہل بیت کی امامت پر اپنا سفر ختم کیا۔ لیکن جس طرح حضور پر نبوت ختم ہوئی اسی طرح تبلیغی مشکلات کا خاتمہ بھی حضور پر ہوا۔ وہ کون سی مشکل نہ تھی جس نے آپ کا سامنا نہ کیا ہو۔ مگر عرش جس کے زیر قدم رہا تھا مشکلات کے ہمالہ کو اس نے نہ صرف روند ڈالا بلکہ اس طرح زیر و زبر کیا کہ مشکلات حضور کے آگے پیش نہ پاسکیں۔

حضور کی بعثت چھٹی صدی عیسوی میں ہوئی جو انسانوں کی مدون تاریخ کی سب سے تاریک صدی ہے۔ اس وقت ساری دنیا پر جہالت اور غیر انسانی کردار کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر خطہ زمین اور ہر قوم انسانی پستی میں تھی۔ عرب اس تاریک دنیا کا سب سے زیادہ تاریک ترین حصہ تھا۔ نہ صرف عرب کی سرزمین پتھریلی اور ریگستانی تھی بلکہ عرب قوم کا مزاج بھی پتھریلا تھا وہ کسی صالح انقلاب کو قبول کرنا سنگین قومی جرم سمجھتے تھے اور ان کے کردار کے ریگستان کو انسانیت کے گلشن میں تبدیل کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ مگر وحی کی بارش اور ''بادیانہ زراعت'' کے ماہر اعظم کی اب تک کی محنتوں نے اس بنجر زمین میں کیسے چمن پیدا کیے وہ آج بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ عرب کو انسان بنانے کا کام جس کے سپرد کیا جاتا وہ یہی کہتا کہ مردہ کا زندہ کرنا ممکن ہو تو ہو مگر عربوں کو انسان بنانا

ناممکن ہے۔ حضور اسی ناممکن کو ممکن بنانے آئے تھے تاکہ قیامت تک پھر کبھی انسانوں کی اصلاح کو ناممکن نہ کہا جاسکے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جبکہ دنیا بہت بڑی تھی۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے ایک انسان کی عمر کافی نہ تھی بلکہ نسلوں کی عمر درکار تھی۔ ذرائع رسل و رسائل وسائل تبلیغ ونشرواشاعت اور سامان نقل وحمل بے حد کم تھے۔ اس وقت ایک عالمی انقلاب لانا کتنا دشوار تھا اس کا اندازہ آج کا انسان نہیں لگا سکتا جبکہ آج کی دنیا کا پھیلاو اتنا سمٹ گیا ہے کہ ایک دن میں نہ صرف پوری دنیا کا طائرانہ بلکہ کافی حد تک تفصیلی دورہ ممکن ہے اور ابھی نکلی آواز چند گھنٹوں میں ساری دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ سکتی ہے۔ آج انقلاب آسان ہے مگر پھر بھی حکومت و جماعت کے بے شمار وسائل کے باوجود عالمی نہیں بلکہ کسی ایک چھوٹے سے ملک کی مختصر قوم میں انقلاب لاتے ہوئے برسوں لگ جاتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ سیاسی انقلاب کے مقابلہ میں اخلاقی و کرداری انقلاب لانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اخلاقی انقلاب کچھ ایسا ہی دشوار ہے کہ حکومت اور جماعت کی طاقت رکھنے والے اس کو لانے کی ہمت بھی نہیں کرتے۔ آج جبکہ صرف ''نشہ بندی'' کے محاذ پر حکومتیں اس طرح شکست کھا چکی ہیں کہ وہ نہ صرف نشہ بندی ختم کررہی ہیں بلکہ شراب بنانے کو سرکاری صنعت کے زمرہ میں شامل کرنے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ الفاظ نہیں ملتے جن کے ذریعہ اس انسان کی تعریف کی جائے جس نے ملک و دولت اور سیاست و طاقت کے بغیر صرف نشہ بندی کے محاذ پر کامیابی حاصل نہ کی تھی بلکہ شراب جوا، زنا، سود، رقص وموسیقی غرضکہ تمام انسانی کہنہ و دیرینہ عادات بد کو بند کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی اور وہ بھی عربوں کے سنگلاخ مزاجوں میں۔ شر اور بدی کی یہ بندش صرف قانونی نہ تھی بلکہ عملی تھی۔ عہدِ حضور میں شراب حرام تھی نہ شراب کی لائسنس رکھنے والی دوکانیں تھیں اور نہ غیر قانونی شراب کی بھٹیاں تھیں۔ زنا کو حرام کیا تو زنا کاری بند ہوگئی تھی۔ زنا کے اڈے کلاکاری اور فن لطیف کی آڑ میں چھپے نہ تھے۔ نہ زنا کاری کلب اسپتال اور تعلیم و فلاح عامہ کے مرکزوں میں پناہ ڈھونڈ سکی تھی نہ شری گھروں میں بدکاری ''دست غیب'' قسم کا ذریعہ معاش بنی تھی بلکہ اسلام نے زنا کو حرام کیا تھا تو زنا کا جھنڈا اٹھانے والی قوم میں زنا کا واقعی قتل عام ہو چکا تھا۔ جوا اور سود حرام تھا تو ریس، بینکنگ، سٹہ بازی کسی بھی چور دروازے سے جوا یا سود معاشرہ میں داخل نہ ہوسکا تھا۔ جن برائیوں کو آج تک حکومتیں، قومیں، اخلاقی مصلح، سیاسی انقلابی مل کر ہزاروں سال میں نہ روک سکے ان ہی برائیوں کے تلاطم خیز طوفان و سیلاب کو ایک انسان نے اپنے پیغام کی خوبیوں اور

کردار کی طاقت کے ذریعے روک دیا تھا۔ اور شروبدی کے یاجوج ماجوج کو انسانی معاشرہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے بند سکندری سے زیادہ مضبوط اسلام کا بند بنادیا تھا۔ کاش اس بند کو نفاق کے ذریعہ کھوکھلا نہ کیا گیا ہوتا اور ملوکی خلافت کے ذریعہ اس میں شگاف نہ ڈالے گئے ہوتے تو آج اسلام کو تبلیغ کی ضرورت نہ ہوتی۔ بلکہ مسلمان قوم کے ہر فرد کی زندگی ایک دفتر تبلیغ ہوتی جسے چارو ناچار دوسری قومیں دیکھنے اور پڑھنے پر مجبو ہوتیں اور بغیر تبلیغ دوسرے از خود کلمہ پڑھتے۔ دنیا یہی ہوتی مگر زمین و آسمان بدلے ہوئے ہوتے۔ چودہ سو سال پہلے انسانیت نے یہی سنہرا خواب دیکھا تھا جو خلفاء اسلام کے ہاتھوں شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور آج اسلام مسلمانوں کا شاکی ہے کہ:

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

ان چند جملوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضورؐ نے کس قدر زحمتیں اٹھائیں تھیں اور کتنی محنت سے اسلام کو بارآور کیا تھا۔ خود ہی فرماتے تھے

ما اوذی نبی قط کما اوذیت (کسی نبی کو اتنے مصائب و شدائد کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنے مصائب میں نے اٹھائے ہیں) یہ بھی سوچنا ہر نبی کے محبّ کا فرض ہے کہ حضورؐ کی کتنی عظیم زحمتوں کو خلفاء اسلام نے تباہ و برباد کیا ہے۔ انسان کا شعور جب بھی مکمل ہوگا اسے احساس ہوگا کہ انسانیت کے اس عظیم سرمایہ میں کتنا خرد برد کیا گیا ہے اور جن لوگوں نے انسانی سرمایہ (اسلام) کی تباہ کاری میں حصہ لیا ہے ان کے خلاف باشعور انسانوں میں شدید اور پرازنفرت ردعمل ہونا ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔ بات کہاں سے کہاں جانکلی ورنہ مقصود صرف یہ محسوس کرانا تھا کہ حضورؐ نے عظیم مشکلات کے ہوتے ہوئے بے سروسامانی میں جو بے مثال ''عالمی انقلاب'' پیدا کیا وہ انسانی تاریخ کا سب سے عظیم شاہکار ہے۔ اور معجزات کی تاریخ میں اس سے بڑا معجزہ نہ ہوا اور نہ ہوسکے گا مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مشکلات (۱) حضور عرب کی منتشر قوم کو اگر قومیت یا وطنیت یا قومی حکومت کے نام پر جمع کرتے تو انقلاب لانے میں آسانی تھی۔ ابوجہل، ابوسفیان، ابولہب اور ان کی جماعت جس نے حضور کو تنگ کرنے میں ننگ انسانیت بننے سے بھی شرم نہ کی وہ قومی حکومت کے نام پر مخالفت کرنے کے بجائے حضور کے گرد اس سے زیادہ دلجمعی اور یکسوئی سے جمع ہوتے جس دلجمعی سے ابوسفیان اور خالد بن ولید وغیرہ حضرت ابوبکر کے گرد قریش کی ''قبیلانہ حکومت'' کے لئے جمع ہوئے۔ مگر حضور کی مشکلات پسند

طبیعت نے سیاسی انقلاب کے بجائے ''اخلاقی انقلاب'' کا نعرہ بلند کیا۔ جس کے عوض دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں جنت کا وعدہ تھا ملک یا مال کا وعدہ نہ تھا اور اس مشکل کام کے لئے ابوجہل کے تنومند، با اثر اور پرقوت ٹولہ اور جرگہ کے بجائے حضور نے ابوذر، عمار یا سرسلمان اور ان کے ہم کردار افراد سے کام لیا۔ جو تقریباً سب کے سب مصیبتوں کے مارے، غلامی کے شکنجے میں کسے، بیچارگی اور درماندگی کے ستائے تھے۔ اب یہ حضور کی صلاحیت قوم گری تھی کہ پتھروں کو شیشوں سے توڑا۔ ظلم کو درد سے موڑا، خاروں کو پھول بنا کر چھوڑا۔ مزہ یہ ہے کہ ہاتھوں میں نہ تلوار لی اور نہ کوڑا۔

۲- نبی اور مصلح کا فرق کم لوگوں کی نظر میں ہے چنانچہ اکثر مقررین و مصنفین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نبی یا امام کے تعارف وتقابل کے لئے گوتم بدھ و کبیرداس وغیرہ قسم کے مصلحین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ تقابل نہ صرف ایک گھٹیا بات ہے بلکہ نبوت و امامت کے بارے میں ناواقفیت اور اپنی تاریخ و مذہب کے لئے احساس کمتری کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح سخت تنقید کے قابل یہ بات بھی ہے کہ اکثر حضرات معصومین کو غیر مسلم مشہور افراد کے تاثرات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو اپنے ''ایڈوانس'' ہونے کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اب قرآن مستشرقین کے ترجموں سے سمجھا جاتا ہے اور معصومین کی سیرتیں کارلائل، گبن، جارج جورداق کی کتابوں سے معلوم کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و معصومین کو اپنے نقطۂ نظر سے سمجھا ہے قرآن کو قرآنی نقطۂ نظر سے اور معصومین کو ان کے مقاصد و طریقہ کار کے مطابق نہیں سمجھا ہے۔ ظاہر ہے کہ خود پورے طور پر نہیں سمجھے ان سے سمجھنے والے نہ معلوم کیا سمجھ بیٹھیں گے جو چاہے کچھ بھی ہو مگر وہ نہ ہوگا جس کو سمجھنے کی کوشش انھوں نے کی تھی تنقید نیت پر نہیں ہے بلکہ گزارش ہے کہ نیک نیتی کافی نہیں ہوتی جب تک طریقۂ عمل بھی صحیح نہ ہو۔ اپنے مذہب کو غیروں سے سمجھنا دراصل اس ''مذموم ہندوستانیت'' کا نتیجہ ہے جو غلامانہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔ ایسے لوگ ہندوستان کے بنے ہوئے مال کو دیسی ہونے کی بنا پر قابل قدر نہیں سمجھتے ہیں اور وہی مال جب ''فارن'' سے آتا ہے حالانکہ ہندوستان ہی سے گیا تھا تو وہ قیمتی اور دل پسند ہوتا ہے۔ ہنسی کیسے رکے جب ہماری اعلیٰ سوسائٹی کے مجنوں ہندوستانی کھیت کے مثلاً تازہ مٹر کو بدمزہ قرار دیتے ہیں مگر جب وہی مٹر یہاں سے جاکر فارن سے پیک ہوکر آتا ہے تو اس کے بگڑے ہوئے مزے کو فارن کے مٹر کا مزہ قرار دے کر بشوق کھاتے کھلاتے ہیں اور اپنی ''صاحبیت'' کی نمائش کرتے ہیں۔ یہی مذموم بلکہ مسموم ذہنیت اب مذہب میں داخل ہورہی ہے کہ

حضرت علیؑ نے حضورؐ کے لئے کیا کیا اس سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہوتی ہے کہ عیسائی مؤرخ نے آپ کے لئے کیا کہا ہے مضمون کا یہ حصہ موضوع سے غیر متعلق ہونے کے باوجود عمداً اتنا طویل لکھا گیا تاکہ مسلح اور نبی کا فرق سمجھانے سے پہلے ناظرین کی پوری توجہ حاصل کی جاسکے۔ مصلح کے لغوی معنی پر گفتگو نہیں ہے لغوی معنی کے اعتبار سے نبی بھی مصلح ہوتا ہے بلکہ واقعی اور کامل مصلح صرف نبی یا امام ہوتا ہے بلکہ مصلح کے اصطلاحی معنی پر بحث ہے جس کی مثال میں گوتم بدھ وغیرہ کا نام آچکا ہے نبی و مصلح میں فرق یہ ہے کہ مصلح قوم میں چند نمایاں خرابیوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک یا چند کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ستی کی رسم، بیوہ کے عقد ثانی کی مخالفت شراب و جوا وغیرہ کو دور کرنے کے لئے مصلح پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن نبی جسم انسانیت کے صرف ایک یا دو نمایاں مرض کو دور کرنے نہیں آتا بلکہ پورے نظام کو امراض سے پاک کرنے اور ہر آب و ہوا میں صحتمند رکھنے کے لئے آتا ہے۔ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بغیر تعلیم گدی نشین جراح یا عطائی حکیم اپنے موروثی نسخوں سے مخصوص امراض کا علاج کرتے ہیں اور بلاشبہ ان سے بھی سماج کو فائدہ ہوتا ہے لیکن وہ پورے نظام جسم پر نظر رکھ کر علاج نہیں کرسکتے۔ اکثر ان کا علاج ایک مرض کو دور کرتے ہوئے دوسرے مرض کو پیدا بھی کردیتا ہے۔ اس کے برخلاف تعلیم یافتہ طبیب اور حاذق حکیم یا ڈاکٹر پورے جسم پر نظر رکھ کر صحت کلی کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ ان پڑھ جراح اور حکیم میں تجربہ کار کمپاؤنڈر اور مکمل سرجن میں جو فرق ہے تقریباً وہی فرق مصلح اور نبی میں ہوتا ہے۔ حضورؐ نے جہاں سیاسی انقلاب پیدا کرنا مناسب نہ جانا وہاں وہ عربوں میں کسی مخصوص اصلاحی مشن کے علمبردار بھی نہیں بنے بلکہ عالمی انقلاب کے ذریعے تمام قوموں میں انسانی کردار پیدا کرنا چاہا قومی کردار پیدا کرنا آپ کا مقصد نہ تھا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ ''قومی کردار'' سے بالاتر ''انسانی کردار'' کی ترویج کے لیے ان عربوں سے کام لیا جو ساری غیر عرب دنیا کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سوچئے کتنا مشکل مقصد تھا اور اس سے زیادہ مشکل تر تھا اس کا ذریعہ:

واللہ کہ اے رسول کاری کردی

۳۔ تبلیغ و ہدایت میں حسب ذیل چیزیں شدید رکاوٹ بنتی ہیں۔

الف: خاندان اور وطن والوں پر اثر انداز ہونا ناممکن ہے۔ وطن سے باہر اثرانداز ہوکر وطن میں بااثر ہونا سب کو آتا ہے لیکن خاندان و وطن میں با اثر ہوکر باہری دنیا پر اثرانداز ہونا بلاشبہ دنیا و دین

کے مشاہیر کی تاریخ میں صرف ''محمدی خصوصیت'' ہے۔

ب: جاہلوں کو سمجھانا اگر ناممکن نہیں تو دشوارترین کام ضرور ہے۔ حضورؐ کی بعثت یونان میں نہیں ہوئی جہاں علم و حکمت کے چراغ روشن تھے بلکہ بعثت کے وقت جو قومیں متمدن تھیں اور اپنی ایک ترقی یافتہ تہذیب رکھتی تھیں مثلاً ایران یا روم حضور وہاں کے بجائے عرب میں مبعوث ہوئے۔ جس عرب کا ذائقہ اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اسے مردہ جانور کا متعفن گوشت لذیذ ترین غذا معلوم ہوتی تھی تنگ نظری ایسی بڑھی تھی کہ دولت کی تقسیم کے خوف سے باپ بیٹی کا گلا اپنے ہاتھ سے دبا دیتا تھا ذہن اتنے مسخ تھے کہ اوہام پرستی اور شگون لینے میں عرب اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ فکر اتنی گر چکی تھی کہ خودفراموش عوام خود پرست سردار کے حوض میں دوسرے قبیلے کے اونٹ کے ایک گھونٹ پانی پی لینے پر چالیس سال تک اپنا اور اپنی نسل کا خون بہانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ پاکیزہ رشتوں پر نہیں بلکہ بدکاری پر ناز کرتے تھے۔ دشمن کا گلا کاٹنا ان کو تسکین نہ دیتا تھا بلکہ گلا کاٹ کر دشمن کا خون پیتے تھے اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ چباتے جاتے تھے۔ دشمن کے اعضا کاٹ کر ہار پہننے میں اپنی جیت سمجھتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ آج کی روشن بیسویں صدی میں اگر عراقی شاہ فیصل، نوری السعید، اور عبداللہ کی لاشوں کو سڑک پر کھینچتے ہیں اور لاشوں پر سے سواری گزارتے ہیں تو سوچئے وہ عرب جو اسلام اور زمانہ کی موجودہ ڈیڑھ ہزار سال کی ترقی سے ناآشنا تھے اور عرب کے اندر کنویں کے مینڈک بنے ہوئے تھے ان کا حال کیا ہوگا۔ ان متعفن انسانوں میں چالیس سال خاموش زندگی بسر کرنا اور ۲۳ سال میں ان کو بدل ڈالنا بس ختم المرسلین کا کام تھا جن پر علم و عمل کی تاریخ ختم ہوتی ہے۔

۴- عرب ایک قوم نہ تھے بلکہ جتنے قبیلے تھے اتنی قومیں تھیں ان کو ایک قوم بنانا نہ تھا بلکہ ان لوگوں کو ایک انسانی قوم کا حصہ بنانا تھا اور ایسا جاندار اور روشن حصہ جو باقی حصوں کو زندگی و روشنی دے۔ جن باتوں کا آج سوچنا مشکل ہے ان کو کر گزرنا کتنا مشکل تھا۔

۵- حضورؐ کے پاس نہ پریس تھا نہ اخبارات و رسائل نہ لٹریچر، نہ اڈیٹری نہ کلچرل پروگرام آپ نے ملک کا تبلیغی دورہ بھی نہ کیا۔ شاعری جو اس وقت کا بہترین ذریعہ نشر و اشاعت تھا اس کو بھی بروئے کار نہ لائے تاکہ اسلام یا نبوت شاعری نہ بن جائے۔ چالیس برس چپ رہے حالات کا اندازہ لگایا اور اسی اندازہ کے مطابق جرأت عمل کا ذخیرہ کیا۔ ۱۳ برس مکہ میں رہے جس کی ہر صبح و شام کو مصائب کا نیا طوفان اٹھتا تھا۔ مسلمان اتنا ستائے گئے کہ ستانے والے تھک گئے۔ قوت

برداشت کے جواب دینے سے پہلے حضورؐ نے ان کو حبشہ اور مدینہ کی پناہ گاہوں میں بھیج دیا۔ مدینہ میں دس سال زندہ رہے جس میں ۸۸ بار مسلح حملہ کا مقابلہ کیا۔ یعنی سالانہ ۹ حملوں کا دفاع آپ کا فریضہ رہا۔ آپ کی تنہا ذات میدان میں افواج کی کماندار بھی تھی اور مدینہ میں قاضی بھی۔ پوری فاقہ کش جماعت کی غذا و لباس کی ذمہ دار بھی۔ ۹ بیویوں کا خرچ اور ان کی کشاکش الگ، تبلیغ کی ذمہ داری الگ، طریقہ صرف احکام صادر کرنے کا نہ تھا بلکہ خود قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے حصہ کی خندق بھی کھودتے تھے۔ مسجد کی اینٹیں بھی اٹھاتے تھے۔ خدا سے وحی لے کر مسلمانوں کو یاد بھی کراتے تھے۔ اتنی مصروفیت میں بھی عبادت یوں کرتے تھے کہ خدا عبادت میں کمی کرنے کی فرمائش کرتا تھا۔ غرض کہ وسائل محدود، مشکلات عظیم، افکار کا ہجوم، صدمات پھر وہ بھی مسلسل ذاتی بھی اور قومی و دینی بھی، مقصد وسیع، مدت کم، طریقہ کار مشکل، انسانی صحت ہار جائے مگر حضورؐ نہیں ہارے اور وہ کر دیا جو مٹنے کے بعد بھی دنیا کے لیے واحد روشنی کا مینارہ ہے حضور کے آخری وقت درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے دنیا کو کیا بنانا چاہا تھا۔

انسانیت کی بہار

آمنہ کی گود میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے مشیت نے طے کیا تھا کہ آج کا بچہ ''گزشتہ زمانہ کا مصلح اور آئندہ زمانہ کا ہادی ہوگا'' جس نے زندگی کی کڑی دھوپ میں باپ کی محبت اور ماں کی شفقت کا سایہ بھی نہ پایا۔ جس نومولود کے لئے اوہام پرست اور بدشگونی پر اعتقاد رکھنے والوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بچہ (معاذ اللہ) ''منحوس'' ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے باپ مر گیا۔ بچپنے میں ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ دادا بھی زیادہ زندہ نہ رہا۔ ''سبز قدمی'' جس کے لئے مشہور کی جارہی تھی اس کو خاندان کے بزرگ عبدالمطلب و ابو طالب نہ معلوم کن آنکھوں سے دیکھ کر فخر خاندان و نازش زمانہ سمجھ رہے تھے۔ ہوا بھی یہی کہ کل کا یتیم انسانی قوم کا باپ ثابت ہوا۔ بے سہارا جینے والا بے سہاروں کا مرکز زندگی نکلا۔ غریب شہر عزیز دہر ہوا مقصود اس وقت کا تذکرہ ہے جب انسانیت کو سنبھالنے والا اپنے جسمانی قدم سنبھال کر نہیں اٹھا سکتا بلکہ دو جوانوں (علی اور فرزند عباس) کے کاندھوں پر بوجھ دے کر گھر سے جس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے آنا چاہتا ہے مگر قدم نہیں اٹھتے بلکہ زمین پر گھسٹتے جاتے ہیں۔ علی و فاطمہ کو معلوم ہے کہ حضور اب موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ناتوانی رگوں میں دوڑ رہی ہے، منبر کی ایجاد کرنے والا منبر پر آخری بار جارہا ہے اور اس لیے جارہا ہے کہ آخری بار انسانوں کو

کردار کے ''عالمی انقلاب'' کی ''کلیدی بات'' کو ذہن نشین کرادے یعنی ''قانون کو ہر حال پر، ہر شخص پر، ہر جذبہ پر، ہر مصلحت پر بالا تر رکھنا'' نسل انسانیت کے لیے مکمل قانون آ چکا ہے لہٰذا اس میں ترمیم یا جدید تدوین کا بیکار کام نہ کرتا۔ حلال محمد حلال ہے قیامت تک کے لئے اور حرام محمد حرام ہے قیامت تک کے لیے کیونکہ ضرورت، مجبوری، معذوری کا مکمل جائزہ لے کر قانون میں ایسی لچک رکھی گئی ہے جو حالات پر حاوی ہے لہٰذا زمانہ کے تجدد کے باوجود یہ قانون بوسیدہ نہ ہوگا۔ اور جس طرح لاکھوں سال تک دنیا آباد ہے تو دو اور دو چار ہی رہیں گے اس میں نہ ترمیم ممکن ہے نہ تنسیخ کیونکہ دو اور دو چار ایک حقیقت ہے اور حقیقت بدلا نہیں کرتی اسی طرح حقائق کے خالق نے اپنے مکمل اور غیر تجرباتی علم سے جس قانون کی تشکیل کی ہے وہ بھی ناقابل ترمیم و تنسیخ ہے۔ جس قانون نے مخالف ماحول میں گرفتار شخص کو اپنے انکار کا حکم دیا ہو (تقیہ) اس میں ترمیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ قانون معذوروں کے لئے لچک رکھتا ہے لیکن حیلے بہانے اور من مانی کرنے کے لئے بیشک کوئی لچک نہیں رکھتا بلکہ ایسے مواقع پر قانون اسلام اپنے ماننے والوں سے اپنے لیے برتری کا مطالبہ کرتا ہے۔

غرض کہ حضورؐ نے تقریر کی جس کا خلاصہ میں نے اپنے الفاظ میں درج کیا ہے اور تقریر کے بعد قانون کی برتری و بالاتری کے لیے آپ نے کہا میری موت قریب معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی کا حق میرے ذمہ باقی ہو تو وہ طلب کر لے ایک شخص نے اٹھ کر کہا آپ کا ایک تازیانہ مجھے لگ گیا تھا جو آپ اونٹ کو مار رہے تھے اس کا بدلہ چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے ذہن سے اس صورت حال کو محسوس کریں کہ حضورؐ نے مطالبۂ حق دے کر بتایا کہ عرش الٰہی سے جس کی نعلین برتر رہیں وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں بلکہ صاحب معراج نبی پر بھی قانون بالاتر ہے۔ اس سے زیادہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ آپ نے ''قانون کی بالاتری'' کو اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ ایک کلمہ گو آپ سے تازیانہ کا انتقام لینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ تقریر پیغمبر سن کر اٹھنے والا شخص نہیں اٹھا تھا بلکہ عوام میں قانون کی بالاتری کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ تقریر نمائش نہ تھی لہٰذا حضور نے دعویٰ بلا دلیل مان لیا کیونکہ شخصیت کو بچانا مقصود نہ تھا بلکہ شخصیت پر قانون کو عملاً بالاتر ثابت کرنا تھا۔ قانون کتنی برتری حاصل کر چکا تھا کہ انتقام کا مطالبہ کرنے والا کہتا ہے کہ بدلہ تب لوں گا جب تازیانہ وہی ہو جو مجھے لگا تھا۔ حضور کا تازیانہ آپ کی اکلوتی بیٹی فاطمہ کے پاس تھا۔ سلمان تازیانہ لینے بھیجے گئے اور انھوں نے جانے سے انکار نہیں کیا بلکہ چلے کیونکہ آپ صرف صحابی نہ تھے بلکہ ''رفیق مقصد'' تھے۔ جناب فاطمہ نے پوچھا

کہ بابا سفر میں جاتے وقت تازیانہ لیتے تھے آج کیوں مانگا ہے جب کمزوری ایک قدم نہیں اٹھانے دیتی ہے سلمان نے پورا واقعہ بتایا۔ بنی نے تازیانہ لاکر دے دیا یعنی جذبات اور محبت اور رشتہ پر قانون نے بالاتری حاصل کی۔ فاطمہ کو باپ سے بے انتہا محبت کے باوجود تازیانہ دینے میں ہچکچاہٹ نہ ہوئی کیونکہ آپ صرف ''رسول زادی'' نہ تھیں بلکہ جزو نبوت اور شریک کار رسالت تھیں۔ بھرے مجمع میں تازیانہ آیا۔ انتقام لینے والے کو دیا گیا۔ وہ تازیانہ لے کر اٹھا منبر تک آیا علی، سلمان، ابوذر، عمار یاسر اور باقی مسلمان اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ مادی آنکھیں منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاکر بند ہوجانا چاہتی ہیں مگر بصیرت کو آنکھوں کے سامنے ہدایت کا عالم تاب چہرہ بے نقاب آرہا ہے۔ بدلہ لینے والے نے منبر کے پاس رک کر کہا کہ جب تازیانہ لگا تھا میں برہنہ تھا حضور بھی کرتا اتار دیں۔ حضورؐ نے اپنے جسم سے پیراہن اتارا اور انسانیت کو پہنادیا۔ دل سینوں میں قریب تھا کہ پھٹ جائیں جب بدلہ لینے والا تازیانہ لے کر منبر پر چڑھ رہا تھا۔ ابر سے آفتاب جس طرح ایک دم سے نکل آتا ہے اسی رفتار سے منظر اچانک بدلا اور تازیانہ مارنے والا تازیانہ مارنے کے بجائے مہر نبوت کو بوسہ دے رہا تھا۔ اور کانوں سے صدا ٹکرا رہی تھی۔ ''میں نے مہر نبوت کا بوسہ لینے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی تھی''۔ مسلمان کھل اٹھے۔ کشت انسانیت لہلہا اٹھی مشیت مسکرا رہی تھی۔ رحمت جھوم رہی تھی قانون کی بالاتری زندہ جاوید بن چکی تھی۔ دور اور بہت دور شیطان کی سسکیاں بھی سنی جاسکتی تھیں ابھی سینوں میں دلوں کو قرار نہ ملا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری موت قریب ہے کسی کو کوئی حاجت ہو تو بتائے تاکہ اس کی حاجت برآری کے لیے دعا کردوں۔ وہ عرب جو دولت کے لالچی، حکومت و اقتدار کے بوالہوس، دنیاوی تمناؤں کے اسیر تھے ان کے کانوں سے حضور کی یہ صدا ٹکرائی۔ وہ عرب اب بھی تھے مگر مسلمان تھے یعنی انسان تھے۔ لہٰذا دنیا کے بجائے دینی حاجتیں بیان ہونا شروع ہوئیں ایک شخص نے کہا میں منافق ہوں میرے لیے ایمان کی دعا فرمائیں۔ اعتراف کی تاریخ ایسی لطیف مثالوں سے خالی ہے یا ایسی مثالیں پھر خال خال ملتی ہیں۔ حضورؐ نے اس کے لئے دعائے ایمان فرمائی۔ دوسرا شخص اٹھا۔ اس نے کہا مجھے نیند زیادہ آتی ہے۔ عبادت سے محروم رہتا ہوں۔ زبان جھوٹ کی عادی ہے بے اختیار جھوٹ بولتا ہوں، منافق ہوں۔ ''عیوب ثلاثہ'' سے نجات کی دعا فرمائی حضرت عمر سے نہ رہا گیا۔ فرمایا تم نے اپنے کو رسوا کرلیا حضورؐ نے آپ کو ڈانٹا کہ چپ رہو۔ اس کی جرأت اعتراف لائق صد ستائش ہے۔ یاد رکھو آخرت کی رسوائی سے دنیا کی رسوائی بہت آسان ہے

پھر آپ نے دعا فرمائی منبر سے اترے۔ چند دن کے بعد حضورؐ زمین پر نہ مٹنے والا اجالا چھوڑ کر آغوش زمین میں پنہاں ہوگئے۔ رسول کا سفر ختم ہوا۔ امت کا سفر شروع ہوا جو حوض کوثر پر ختم ہوگا۔ جہاں حضورؐ ہم سے اپنی عظیم امانت اسلام اور اس کے امانتدار اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں پوچھیں گے۔ صدیق و امین نبی کے پاس اسی کو جگہ ملے گی جس نے آپ کی امانتوں میں خیانت نہ کی ہوگی۔

رسول اسلامؐ کے اہم غزوات اور ان کے اسباب

علامہ سید محمد صادق مرحوم

اس تابناک حقیقت کا روشن چہرہ بے نقاب ہوکر نگاہِ بصیرت کے سامنے آچکا ہے کہ اسلام کی نشر و تبلیغ اس کے مقدس احکام کی ترویج اس کے پاکیزہ مقاصد کی اشاعت اور دنیا کے سامنے اس کے بشریت کی شب تار کو جگمگا دینے والی ٹھوس حکیمانہ تعلیمات کے پیش کرنے کا مقصد بنی نوع انسان کو انسانیت کے دلپذیر تقاضوں اور وقیع قدروں سے روشناس بنانے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ بعد میں آنے والی نسلوں کو اس پاک مقصد کے سمجھنے میں جو سانحات درپیش ہوئے ان کا بنیادی سبب بانی اسلام کے طرز عمل اور ان کا اس سلسلہ میں اٹھنے والا کوئی حکیمانہ قدم نہیں بلکہ مستقبل میں اذیت نواز اسلامی گروہوں کا اسلام کے پیش کردہ حقائق کی جانب سے روگرداں ہوکر روحانیت کی جانب سے یکسر آنکھوں کا بند کرلینا اور مادیت کی طرف متوجہ ہوجانا تھا۔

تاریخ کی نگاہوں نے بلاشبہ وہ وقت دیکھا جب اصحاب صفہ کی سادگی کے روشن نقوش رفتہ رفتہ اتنے دھندلے ہوگئے کہ قریب سے بھی دیکھنے کے بعد ان کا پہچاننا دشوار ہوگیا اور آپ کے بجائے روم و فارس کے خسروی نظام کے نقوش نے ابھر کر اسلامی روحانیت کے مقدس چہرہ کو داغدار بنادیا۔

اسلام کے روحانی کلام کا تدریجی اضمحلال اور اس کے معین کردہ حدود سے مسلمانوں کے باہر نکل جانے کا ہی یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دنیا کو اسلام کے خلاف یہ نعرہ بلند کرنے کا موقع ملا کہ اسلامی کامیابیوں کا بنیادی راز اس کی شمشیر زنی مکہ کی حدوں سے باہر نکال کر اسلام کو شرق و غرب عالم تک پہنچانا یہ اسلام کی آفاقی تعلیمات کا کام نہیں بلکہ ان خونخوار تلواروں کا کام تھا جو سلطنت اسلامی کی توسیع کے جذبہ کے تحت نیاموں سے باہر نکلی تھیں۔ اگر یہ تلواریں نہ ہوتیں تو اسلام کبھی اتنا پھلنے اور پھولنے کا موقع حاصل نہ کرپاتا۔ لیکن کیا ایسا کہنا اور سمجھنا صحیح ہوسکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ جب عالم کا افق تاریک تھا اور ضلالت کی گھٹا ٹوپ ظلمتیں افق کائنات پر چھائی ہوئی تھیں۔ کفر و زندقہ کی تیز و تند آندھیاں معاشرت انسانی کی فضاؤں کو لرزہ براندام بنائے ہوئے تھیں۔ لامذہبیت کا کہرہ ہر

طرف پھیلا ہوا تھا۔ اخلاقی اقدار کی نبضیں ڈوب چکی تھیں دنیا کے سامنے کفر والحاد کے بھیانک خط و خال کے علاوہ اور کوئی منظر باقی نہیں رہا تھا۔ اور روحانیت کے مرضِ بیمار کی تیمارداری کرنے والا گرد و پیش کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا اس وقت جزیرۃ العرب کے دل مکہ سے توحید کا نغمہ بلند ہوا۔ کوہِ فاران کی چوٹی پر نبوت کے اس آفتاب کی شعاعیں جو ساری کائنات کو ابدالاباد تک نور کی دولت سے مالا مال بنانے کی ذمہ داری لے کر آیا تھا۔ دنیا کی اکثر و بیشتر چیزیں اختلافات کی اماجگاہ رہی ہیں اور آئندہ رہ سکتی ہیں لیکن اس حقیقت سے کوئی انصاف پسند انسان انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام کی روحانی دعوت کی پشت پر بشریت کو ضلالت و گمراہی کے گہرے گڑھے سے نکال کر ملوکیت کے اوج وارتقا تک پہنچانے کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ واضح حقیقت ہے کہ جس نے اغیار تک انکار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتے کہ اسلام کے پاک مقاصد کے لئے اس وقت کا پرعصبیت ماحول انتہائی نا مناسب تھا۔ معاشرہ کے خط و خال اتنے بگڑ چکے تھے جن کی درستی کے لئے سکون و اطمینان کے طویل لمحات درکار تھے لیکن نور نگاہ اکثر بنت وہب پروردہ آغوش عبداللہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ اپنے سامنے ان کے برخلاف فتنوں اور ہنگاموں کے ان سربفلک پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے جن سے ٹکر لینے کی ہمت کرنا معمولی حوصلہ دل کا کام نہیں تھا۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو دعوت اسلامی کی راہ میں کفروشرک کے بچھائے ہوئے کانٹوں کی چبھتی ہوئی نوکیں دوسرے قدم سعی کو یقیناً آگے بڑھنے سے روک دیتیں اور محاصرہ شعب جیسے صبر آزما حالات اس کے گریبان عزم کی دھجیاں اڑا دیتے مگر اسلام کے مالی کا فولادی دیوار سے زیادہ مضبوط و مستحکم حوصلہ الحاد وشرک کی سنگین چٹانوں سے ٹکرانے کے بعد سست و مضمحل نہیں ہوا اور آزمائشوں کے اٹھتے ہوئے پرشور طوفان اس کی کشتی ہمت کو آگے بڑھنے سے ذرا بھی نہ روک سکے۔

یقیناً ظلم ہوگا کہ اگر ہم ان ناقابل شک و شبہ حالات کے لازمی تقاضوں کو نظرانداز کرکے اپنی قوت فیصلہ کو تعطل کی حالت میں چھوڑ دیں بلاشبہ اگر فکر صحیح یہی ہدایت کرتی ہے کہ مخالفت کی خون آشام تلواروں کو بہرحال بے نیام ہونے کے بعد ان کے خاطر خواہ مقاصد کی انجام دہی کے لئے آزاد چھوڑ دینا بھی کوئی قرین عقل بات ہے تو بیشک اسلامی غزوات محل اعتراض قرار دیئے جاسکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی باشعور انسان اس کی تائید کے لئے تیار نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر انسانی جسم کا کوئی حصہ تکلیف سے متاثر ہوجائے اور اس کی بقا پورے جسم کے لئے خطرہ نظر آ رہی ہو تو اس کا قطع کردینا ہی

بہتر بات سمجھی جاتی ہے کل کے تحفظ کے لئے بعض اجزاء کی قربانی کو ارباب عقل وشعور ہمیشہ اولیٰ وانسب خیال کرتے رہے ہیں۔ اسلامی غزوات کے بنیادی اسباب وعلل کی تلاش کرتے وقت اس کے فلسفہ جہاد کی بنیاد میں جو سب سے بڑا محرک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے وہ یہی کہ معاشرہ انسانی کے پیکر کے مسموم حصوں کو بقیہ غیر مسموم حصوں سے کاٹ کر علیحدہ کردیا جائے۔ بانی اسلام نے جو لڑائیاں لڑیں نہ ان کا مقصد توسیع سلطنت تھا اور نہ حصول جاہ وجلال بلکہ درحقیقت وہ نتیجہ تھیں ان پیدا شدہ جدت کا جن کی موجودگی میں ہتھیاروں کا نہ اٹھانا دعوت اسلامی کو موت کی ابدی نیند کے حوالہ کردینے کے علاوہ اور کوئی بات نہ ہوتی۔

اسلام کی سب سے پہلی اور سب سے اہم لڑائی بدر کی تھی جسے پیغمبرؐ اسلام نے از خود نہیں لڑا بلکہ انھیں لڑنے پر مجبور کردیا گیا جغرافیہ کے لحاظ سے مدینہ ایک اہم بستی کی حیثیت رکھتا تھا اور اسے تجارتی نقطۂ نظر سے اس مکہ کا رقیب سمجھا جاتا تھا جو رسولؐ اسلام کے ابتدائی عہد میں مشرکین کی راجدھانی تھی اور مصنف تاریخ اسلام وائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کے بقول یہ حقیقت بالکل ناقابل انکار ہے کہ اہل مکہ اہل مدینہ کے خلاف اپنے دلوں میں سخت ترین غم وغصہ کے جذبات رکھتے تھے اور اہل مدینہ کے خلاف وہ اس بنا پر سخت برافروختہ تھے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام اور ان کے معزز صحابہ کو جنھیں وہ باغی خیال کرتے تھے پناہ دی اور ان امور کی بنا پر اُن کے اور اہلِ مدینہ کے درمیان تلواروں کا کھنچنا اور لڑائی کی صورت کا رونما ہونا اٹل اور ناگزیر تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو مشرکین مکہ کا وہ ناروا طرزِ عمل بھی تھا جو انھوں نے مسلمانوں کے باب میں اختیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے اُن لوگوں کو المناک شدائد اور تکالیف کا نشانہ بنایا جنھوں نے ان کی مرضی کے خلاف اسلام قبول کرلیا تھا۔ اور انھیں الم انگیز اذیتیں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یہ حقیقت ہے کہ ان مسلمانوں کو جو مواقع کی بنا پر مدینہ کی طرف سفر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ مشرکین قریش کی جانب سے ہر حساس دل کو تڑپا دینے والے مصائب کی آماجگاہ بنایا گیا صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مشرکین قریش نے اپنا یہ شیوہ قرار دے لیا تھا کہ وہ اسلام کے بارے میں اور بانی اسلام کے بارے میں من گھڑت باتیں اختراع کرتے اور غلط پروپیگنڈہ کرکے ماحول کو اس کے خلاف بنانے کی سرگرم کوششوں میں مشغول رہتے تھے۔ اس سلسلے میں یوں تو بہت کچھ ہوا لیکن نسبتاً اور واقعات سے زیادہ اہم اور قابل لحاظ یہ بات ہوئی کہ مشرکین قریش کے قافلہ نے بلاوجہ مہاجرین کے اونٹوں کو چھین لیا اور اپنی طاقت کے

مظاہرے کے طور پر اُن پر قبضہ کرنے کے بعد واپس کرنے سے صاف انکار کردیا۔ ان واقعات کے پہلو بہ پہلو انھوں نے اپنے ان جذبہ بغض وعناد کی عکاسی کرنے والی حرکات کا مظاہرہ کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جن کی واضح ترین مثال خالد کا باپ ولید ابنِ مغیرہ سے جو حالت نزع میں انتہائی بے چینی اور کرب کے ساتھ رورو کر ابوجہل سے یہ کہہ رہا تھا کہ میری بیقراری کا بنیادی راز اسلام کی کامیابی کا تصور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام اور اس کی دل پذیر تعلیمات کے لئے مشرکین قریش کے نامناسب طرزِعمل نے موت و زندگی کا سوال کھڑا کردیا تھا۔ خود سوچئے کہ متعدد بار رسول اسلام کے قتل کی خفیہ سازشوں کا پکڑا جانا۔ اُن کی شمع حیات کو گل کردینے پر مخالفین کا باہمی عہدوپیمان کرنا کیا یہ چیزیں اس حقیقت پر تیز روشنی نہیں ڈالتیں کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ کون ہے جسے حضرت یاسر، عمار اور ان کی ماں کے واقعات کا علم نہ ہو۔ ان کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اس کا احساس کرکے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ ان حالات میں لڑائی کا ہونا ناگزیر تھا اور اس کی جانب سے غفلت اختیار کرنا اپنی جانب موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یقیناً رسول اسلام کی جماعت کم اور کمزور تھی اگر بانی اسلام بیدار مغزی سے کام نہ لیتے تو جس طرح مشرکین نے مہاجرین کے اونٹ اُن سے چھین لیے تھے اسی طرح ایک دن وہ بھی آ سکتا تھا جب وہ اہلِ یثرب کے سر پر آدھمکتے اور اُن کے لئے مغلوب اور مفتوح ہونے کے علاوہ اور کوئی صورتحال باقی نہ رہتی ایسی حالت میں رسول اسلام کے لیے یقیناً عقلمندی کا یہی اشارہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ ان کے لئے کب اور کہاں دشمن کو روکنا اور ٹوکنا مناسب ہوگا اور اُن کے لیے کون سے ایسے موقع کی تلاش مناسب ہوگی جہاں وہ اپنے دشمنوں کو شکست دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کی شرارتوں سے باز رہنے کا دیر تک یاد رہنے والا سبق دے سکیں۔ کیا بانی اسلام کے غزوات ناگزیر حالات کا نتیجہ تھے؟ حقیقت کو پایہ ثبوت تک یہ بات نہیں پہنچاتی کہ ان کا کفار قریش کو ان کی شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے جنگ کا تصور کرنا اس کا موقع اس وقت آیا جب دشمن کی جانب سے معاندانہ سرگرمیاں نقطۂ عروج تک پہنچ گئیں اور اس کی کوئی امید باقی نہیں رہی کہ جب تک وہ اپنی ناشائستہ حرکتوں سے باز نہ آ سکے گا۔ تمام تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ بدر کے چشمے پر اسلام کی سب سے پہلی جو لڑائی وقوع پذیر ہوئی وہ دفاعی اور صرف دفاعی تھی۔ مدینہ میں بانی اسلام کے کانوں تک یہ خبریں پہنچیں کہ قریش کا قافلہ سفر شام سے واپس آ رہا ہے اس کے پاس کثیر مال و دولت بھی ہے وہ اسلام کے

خلاف نزاعی روش میں صرف کرسکتا ہے یا اس کے اسباب فراہم کرسکتا ہے۔ بالفرض اگر ایسی خبر غلط بھی ہوتی کہ مخالف حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈھ رہا ہے تب بھی احتیاط کا تقاضہ ہونا چاہئے تھا کہ رسول اسلام آمادہ رہتے اور یہ محسوس کرتے کہ ہمیں غافل رہ کر دشمن کو کامیابی کا کوئی موقع نہیں دینا چاہئے اور کوئی ایسی صورت اختیار نہیں کرنی چاہئے جس سے فائدہ اٹھا کر دشمن کو کامیاب حملہ کرنے میں مدد مل سکے۔ جنگ بدر کے لئے رسول اسلام کی تیاری اُن کی ہوشمندی کی دلیل تھی اور اس نے آسانی کے ساتھ ابوسفیان کو اچانک حملہ کرنے کا موقع فراہم ہونے سے محروم کردیا اور اُسے مکہ سے اپنے لئے امدادی فوج منگانا پڑی۔ سرزمین بدر پر دشمن کے فوجیوں کی تعداد جو کیل کانٹے سے لیس اور لڑنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، نو سو پچاس تھی جس کے مقابل میں رسول اسلام کے صرف تین سو چودہ سپاہی تھے جن کے پاس صرف تین گھوڑے چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں اور ستر اونٹ تھے۔ ایک ایک اونٹ پر دو دو تین تین شخص تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سوار ہوتے تھے۔ رسول اسلامؐ کے اونٹ پر اُن کے شریک سواری جیسا کہ صاحب مناہج النبوت نے لکھا ہے حضرت علیؑ تھے۔ مشرکین قریش کے پاس نہ صرف یہ کہ سامان کی فراوانی تھی بلکہ انھوں نے ایسے طریقے بھی اختیار کر رکھے تھے جس سے ان کے مخالف کا دل مختلف قسم کے منفی تاثرات سے متاثر ہوسکے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مجاہدین اسلام کا جس جگہ پڑاوَ تھا وہاں پانی کی کمی تھی اور زمین اتنی نرم تھی جس میں آدمیوں اور اونٹوں کے پاوَں رانوں تک دھنس جاتے تھے۔ جبکہ دشمن کی فرودگاہ میں بہ افراط پانی کی موجودگی تھی مگر یہ اسلام کی حقانیت کی برکت تھی کہ ان تمام نامناسب حالات کے باوجود رسول اسلام کو فتح اور مشرکین کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ مؤلف تمدن اسلام نے جنگ بدر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ میں سب سے زیادہ کام کرنے والی دو ہستیاں تھیں رسول اسلام کے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب اور دوسری حمزہ ابن عبدالمطلب۔ ہاشمی دلیروں کی بے جگری اور شجاعت نے ان کے مخالفوں کے دل پر ایسی ہیبت طاری کی کہ اُن کے لئے فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا بدر کی پوری لڑائی واقعات کی چھان بین کرنے والے صاحب بصیرت انسانوں کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیتی ہے کہ اس کے مبادی کا تعلق بانی اسلام سے نہیں بلکہ اُن مخالفین سے تھا اگر اس موقع پر کسی قسم کی سستی سے کام لیا جاتا تو اسلام اپنے آگے بڑھنے کے مواقع یکسر کھو دیتا اور دنیا کو دعوتِ اسلامی سے جو عظیم منافع وفوائد حاصل ہونے والے تھے ان سے وہ محروم ہوجاتی بدر کے

بعد سب سے بڑی دوسری جنگ ۳ ہجری میں احد کی درپیش ہوئی جس کے اسباب وعلل کا استقراء ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے کہ اس لڑائی سے بانی اسلام کا کوئی دور کا تعلق بھی نہیں تھا اور اس کے ذمہ دار تمام تر مشرکین مکہ ہیں جنھوں نے غزوہ بدر سویق اور سریہ قردہ میں جو کچھ ہو چکا تھا اس کا اس جنگ کے ذریعہ سے انتقام لینا چاہا تھا، عمر ابنِ عاص کا قبائل عرب کو جمع کرنا ہندہ کے گروہ کا پندرہ اونٹوں پر سوار ہوکر قبائل عرب میں گشت لگانا اور مقتولین بدر پر گریہ زراری کرکے لوگوں میں جوش انتقام کا پیدا کرنے کے لئے یہ تمام واقعات کافی ہیں کہ یہ جنگ پیغمبر اسلام پر زبردستی لادی گئی تھی اور انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف دفاع کی حیثیت سے تھا۔

صرف بدر واحد ہی نہیں اسلام کے بقیہ تمام غزوات کی صورتحال بھی یہی تھی کہ بانی اسلام کو دفاعی طور پر میدان جنگ میں آنے کے لئے مجبور کردیا گیا تھا ورنہ خود ان کا مقصد تلوار سے کام لینا نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تلواروں کی دھاریں گردنوں کو جھکا سکتی ہیں لیکن دلوں پر قبضہ نہیں کرسکتیں۔

مکتوبات پیغمبر

مولوی محمد باقر صاحب
(مدیر اصلاح)

مکتوبات کا آغاز

خداوند عالم نے اپنے نبی کو الٰہی آداب سے سنوارا تھا اور انہیں یہ تعلیم دی تھی کہ اپنے تمام کاموں کا آغاز اس کے مبارک نام سے کیا کریں۔ اللہ کے رسول نے ان الٰہی تعلیمات پر عمل کیا اور ان کے یہی اعمال و افعال تمام خلائق کے لئے سنت و سیرت قرار پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیرو اپنے ہر کام و کلام کا آغاز اور ہر تقدیر و تحریر کی ابتداء بسم اللّٰہ سے کرتے ہیں۔

حضرت سرور کائنات آداب الٰہی کو پیش نظر رکھنے والے اور اس کے مقرر کردہ طریقہ کے پابند تھے آپ کے تمام کاموں کا آغاز خداوند عالم کے مقدس اسماء سے ہوا کرتا تھا خطوط و مکاتیب میں بھی آپ کی یہی روش تھی۔ "بسمک اللّٰھ. بسم اللّٰہ. بسم اللّٰہ الرحمٰن" لکھا کرتے اس کے متعلق آپ کی مشہور حدیث بھی ہے کہ "کل امر ذی بال لم یبدء فیہ بسم اللّٰہ فھو ابتر" ہر وہ اہم کام جس کی ابتداء بسم اللہ سے نہ ہو وہ ناتمام ہے۔ [1]

علامہ حلبی لکھتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت والے اپنے مکاتیب کے شروع میں "باسمک اللّٰھم" لکھتے تھے۔ چنانچہ پیغمبر بھی شروع شروع بسمک اللّٰھم ہی لکھا کئے چار خطوں میں آپ نے باسمک اللّٰھم لکھا پھر جب یہ آیت نازل ہوئی "بسم اللّٰہ مجریھا" [2] تو آپ خط کے شروع میں بسم اللّٰہ لکھنے لگے، پھر یہ آیت نازل ہوئی "ادعوا اللّٰہ او ادعو الرحمٰن" [3] اب آپ نے بسم اللّٰہ الرحمٰن" لکھنا شروع کیا پھر یہ آیت نازل ہوئی "انہ من سلیمان و انہ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" [4] اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ برابر "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" لکھنے لگے۔ [5]

۱- مسائل فقہیہ، ص ۲۵ ۲- سورہ ھود، آیت ۴۱ ۳- سورہ اسراء، آیت ۱۱۰ ۴- سورہ طس، آیت ۲۰
۵- سیرۃ حلبیہ، ج ۳، ۲۳

مختلف[1] معتبر و مستند کتابوں کے حوالے سے آیۂ مباہلہ کے ذیل میں بیہقی کی دلائل النبوۃ سے منقول ہے کہ سورہ طس (جس کی انه من سلیمان و انه بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم) کے نازل ہونے سے پہلے آنحضرت نے نجران والوں کو خط لکھا تو اس کے شروع میں لکھا "بسم اله ابراهیم" اور تاریخ یعقوبی[2] کا بیان ہے کہ آپ نے "بسم اللّٰه من محمد رسول اللّٰه" لکھا۔

یہ تحقیق ہے اکابر علمائے اسلام کی، لیکن اس تحقیق کے بنا پر یہ ماننا ضروری ہوجاتا ہے کہ بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم سورہ طس ہی میں نازل ہوا اس سے پہلے نہیں اور اگر پہلے نازل بھی ہوا تب بھی پیغمبر نے اسے اپنے مکاتیب کا سرنامہ نہیں بنایا جب تک قرآن میں یہ بات نہ آ گئی کہ جناب سلیمان نے اپنے مکتوب میں بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم لکھا تھا۔ جناب سلیمان والی آیت نازل ہونے کے بعد پیغمبر نے جانا کہ بسم اللّٰه سے مکتوب کا آغاز ویسا ہی مستحسن ہے جس طرح ہر چھوٹے بڑے کام کا آغاز مستحسن ہے چنانچہ پیغمبر نے بھی اپنے مکاتیب میں اسے لکھنا شروع کیا۔

لیکن اس موقع پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

کیا رسالتمآب مبعوث برسالت ہونے کے دن ہی سے نماز نہیں پڑھتے تھے اور اس نماز میں سورہ فاتحہ (جس کی پہلی ہی آیت بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم ہے جیسا کہ علمائے فریقین نے صراحت[3] کی ہے) نہیں پڑھتے تھے کیا یہ واقعہ نہیں کہ کس سورہ کا اختتام اور دوسرے سورہ کا آغاز بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم کے نزول سے جانا جاتا تھا۔[4] کیا امام جعفر صادق کا یہ قول انہوں نے نہیں سنا کہ آسمان سے جو بھی کتاب نازل ہوئی اس کی ابتدا بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم سے ہوتی تھی۔[5]

۱- درمنثور، ج ۲، ص ۳۸، بحار الانوار، ج ۲ ۲- تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۶۵

۳- علامہ ابن سعد نے طبقات، ج ۱، ص ۲۶۳ میں ملا علی متقی نے کنز العمال، ج ۵، ص ۲۴۴ میں مسعودی نے التنبیہ والاشراف ص ۳۶۵ میں ابن عبد ربہ نے عقد فرید، ج ۳، ص ۴ میں ابراہیم بن محمد شیبانی سے اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے محدث قمی رحمۃ اللہ علیہ نے سفینۃ البحار میں ذیل لفظ سماء کتاب المختصر شرح المختصر سے نقل کیا ہے کہ امام جعفر صادق سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ اسلام سے پہلے لوگ اپنے خطوط کا آغاز "باسمک اللّٰهم" سے کرتے تھے جب جناب سلیمان والی آیت نازل ہوئی تو بسم اللّٰه الرحمن الرحیم لکھنے لگے۔

۴- امام مسلم نے صحیح مسلم، ج ۲، ص ۹ میں بیہقی نے سنن، ج ۲، ص ۴۰ و ۷۳ و ۴۳ و ۶۱ میں اور ہمارے بزرگ عالی نے اپنی کتاب وسائل کے کتاب الصلوٰۃ میں یہ حدیثیں درج کی ہیں "اس کی نماز نماز نہیں جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے ہر وہ نماز جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جو ثبوت ہیں اس کا کہ سورۂ فاتحہ جزء نماز ہے۔ یہ احادیث کنز العمال، ج ۴، ص ۹۵ و ۹۶ اور مسند امام شافعی، ج ۱، ص ۷۸ و ۸۰ پر بھی مذکور ہے۔

۵- رہ گیا یہ امر کہ بسم اللّٰه سورۂ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں تو اہل بیت طاہرین کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللّٰه سورہ فاتحہ کا جزو ہے۔ رہے

حقیقت یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہر سورہ کے شروع میں نازل ہوا رسالتمآب ہر دن اور ہر رات اور ہر نماز میں اسے پڑھا کرتے اس بنا پر یہ کہنا تو ممکن ہی نہیں کہ یہ صرف سورہ طس میں نازل ہوا اور اس سے پہلے نہیں۔ لہذا علامہ حلبی کا اپنی مذکورہ بالا عبارت کے بعد فوراً ہی یہ کہنا کہ '' یہ سیاق بتاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ ان آیات کے بعد نازل ہوا کیونکہ بسم اللہ اس کے شروع میں نازل ہوا ہے۔'' صریحی طور پر غلط ہے۔ کیونکہ بسم اللہ ہر سورہ کے شروع میں نازل ہوا ہے اور رسالتمآب اپنی نماز میں سورہ طس کے نازل ہونے کے پہلے ہی سے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بسم اللہ نازل ہوا تو ہر سورہ میں لیکن رسول اللہ نے بسم اللہ سے اپنے مکاتیب کا آغاز سورہ طس کے بعد ہی شروع کیا۔ جیسا کہ علامہ حلبی کی روایت بتاتی ہے تو اس صورت میں پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ پھر سورہ ہود کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر نے "باسمک اللّٰھم" کو بدل کر بسم اللہ کیوں لکھنا شروع کیا، سورہ اسراء کے نازل ہونے کے بعد بسم اللہ الرحمن کیوں لکھنے لگے۔

اس وقت تک تو سورہ طس نازل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ مفسرین و محدثین کا بیان ہے پیغمبر نے بسمک اللّٰھم چھوڑ کر بسم اللہ یا بسم اللہ الرحمن اسی وجہ سے تو لکھنا شروع کیا تھا کہ آپ کو کلام مجید کی اتباع مقصود تھی تو جب بسم اللہ سب سے پہلے نازل ہو چکا تھا تو آپ نے پہلے ہی سے بسم اللہ کا استعمال کیوں نہیں شروع کیا سورہ طس کے نازل ہونے تک کیوں ملتوی رکھا علامہ حلبی و یعقوبی وغیرہ کے اس قول کی ہمیں کوئی مناسب وجہ نظر نہیں آتی اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں

←

فقہاء نے اس بات میں ضرور اختلاف کیا ہے کہ بسم اللہ خود مستقل ایک آیت ہے۔ یا آیت کا جزو ہے لیکن اس میں کسی نے بھی تامل نہیں کیا کہ ہے بہرحال سورہ فاتحہ کا جزو، ہمارے ائمہ طاہرین نے نماز میں بسم اللہ نہ پڑھنے والے کو بہت ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے۔ ''ان لوگوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو چھپایا خدا کی قسم انہوں نے اللہ کے بہترین ناموں کو چھپایا۔''

کسی پوچھنے والے نے آپ سے پوچھا کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں یہ سورہ فاتحہ کی سب سے افضل آیت ہے۔ (اصول کافی، تہذیب وسائل وغیرہ) غیر امامیہ کی رائیں اس کے متعلق مختلف ہیں بعض سورہ فاتحہ کا جزو قرار دیتے ہیں بعض نہیں ان کی کتب احادیث میں بے شمار حدیثیں ملتی ہیں جو اس کے جزو فاتحہ ہونے کی شاہد ہیں علامہ سید شرف الدین عاملی خالب ثراہ نے اپنی کتاب مسائل فقہیہ ص ۱۹ سے ۲۷ تک میں بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام کے بیان کردہ احادیث مستدرک امام حاکم سے نقل کی ہیں اور بسم اللہ کے جزو فاتحہ ہونے پر بہت ہی تفصیلی بحث کی ہے سورہ فاتحہ سے بسم اللہ کو ساقط کرنے والے سب سے پہلے امیر معاویہ ہیں جب نماز تمام ہوئی تو ہر طرف سے مسلمانوں نے پکار کر کہا معاویہ تم نے نماز میں چوری کی ہے یا بھول گئے۔ مسند امام شافعی، ج ۱، ص ۵۰

بحار، ج ۱۹، ۵۹ مسائل فقہیہ ص ۸۱ و سنن بیہقی، ج ۲، ص ۴۲، و ۴۳ کنز العمال، ج ۴، ص ۳۰، مسائل بحار الانوار، ج ۱۹، ص ۵۹

کہ ان کے قلم سے لغزش ہوگئی واقعہ یہی ہے کہ پیغمبر حسب آداب وتعلیمات الٰہی اپنے تمام افعال کی ابتداء بسم اللہ ہی سے کرتے تھے اور خطوط کا آغاز بھی اسی سے۔

پیغمبر کے جن خطوط میں بسم اللّٰہ مذکور نہیں یا تو راویوں کی بے پروائی کا شکار ہوئے یا نقل کرنے والوں نے اختصار کی بناء پر ان خطوط میں بسملہ ذکر نہیں کیا۔

وہ چار خطوط جن میں پیغمبر نے "باسمک اللّٰھم" سے ابتداء کی اس کا علم ہمیں نہ ہوسکا حلبی نے اپنی سیرت کا حوالہ ضرور دیا ہے مگر ہم نے پوری سیرت چھان ڈالی وہ خطوط ہمیں نہیں ملے۔ اگر حلبی کا یہ کہنا صحیح مان بھی لیا جائے کہ پیغمبر نے شروع شروع چار خط "بسمک اللّٰھم" کی ابتداء سے لکھے تو اس صورت میں سوال ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ میں جب پیغمبر اور مشرکین کے نمائندہ سہیل بن عمرو کے درمیان عہد نامہ لکھا جارہا تھا اور پیغمبر نے اس عہدنامہ کی ابتداء بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم سے کی تھی تو سہیل نے یہ کیوں کہا کہ آپ اس طرح لکھئے جس طرح آپ کے آباد اجداد لکھتے آئے ہیں یہ کیوں نہ کہا کہ آپ خود جس طرح اب تک لکھتے رہے اس طرح لکھئے۔

بسملہ کے بعد پیغمبرؐ کیا لکھتے تھے

بسملہ کے بعد پیغمبر یہ فقرہ لکھا کرتے تھے۔ "من محمد رسول اللّٰہ الی فلاں یعنی محمد رسول اللّٰہ کی طرف سے فلاں شخص کے نام یا من محمد رسول لفلاں یعنی محمد رسول اللّٰہ کی طرف سے فلاں کے لئے یا ھذا کتاب من محمد النبی لفلاں یہ خط محمد نبی کی طرف سے ہے فلاں کے لئے یا ھذا ماکتبہ النبی محمد لفلاں یہ وہ خط ہے جو نبی خدا محمد نے فلاں کو لکھا۔

اس کے بعد لکھتے "سلم انت تم سلامت رہو کبھی لکھتے سلام علیک تم پر سلامتی ہو کبھی لکھتے سلام علی من امن باللّٰہ سلام ہو اس پر جو اللہ پر ایمان لائے کبھی یہ لکھتے ھذا ما اعطی محمد رسول اللّٰہ لفلاں یہ وہ خط ہے جو محمد رسول اللہ نے فلاں کو دیا۔ کبھی لکھتے۔ احمد اللّٰہ الیک احمد الیک اللّٰہ یعنی خداوند عالم کی حمد وستائش تمہاری طرف ہدیہ بھیج رہا ہوں یہ ایک سلام و دعا کا اسلوب تھا۔ اس زمانہ کے لوگ اپنے مکاتیب کے شروع میں عموماً لکھا کرتے پیغمبر خدا کا دستور تھا کہ ہر خط میں (بسم اللّٰہ کے بعد) شان نبوت کی تعظیم اور منصب رسالت کے احترام کی بناء پر اپنے ہی نام سے خط کا آغاز کرتے کیونکہ جس طرح دوسروں پر پیغمبر کی عظمت و جلالت کا احترام واجب تھا خود

آنحضرت کے لئے بھی لازم تھا کہ اپنی شان کو بلند و بالا سمجھیں خود پسندی اور بڑائی جتانے کے لئے نہیں بلکہ منصب کی اہمیت اور وضع الشی فی محلّہ کی حیثیت سے پیغمبر کے علاوہ دوسرے لوگ جب پیغمبر کو خط لکھتے تو پہلے پیغمبر کا نام لکھتے پھر اپنا نام اسی شان رسالت کی تعظیم کی بنا پر

خالد بن ولید نے آپ کو لکھا "لمحمد النبی من خالد بن الولید"۔[1]

مقوقس نے آپ کو لکھا "لمحمد بن عبد الله من المقوقس"۔[2]

قیصر نے آپ کو لکھا "الی احمد رسول اللّٰہ لبشر به عیسیٰ"۔[3]

نجاشی نے لکھا "الی محمد رسول الله من النجاشی"۔[4]

پیغمبرؐ خدا کے پہلے بھی اس کا رواج تھا اور بعد میں بھی یہی دستور رہا کہ خط جس کے نام لکھا جاتا وہ اگر کوئی بڑا آدمی ہوتا تو پہلے اس کا نام لکھا جاتا بعد میں اپنا مگر پیغمبر نے یہ روش چھوڑ کر خطوط کی ابتداء اپنے نام سے کی چنانچہ جب پیغمبر نے شہنشاہ ایران کے نام خط لکھا اور کسریٰ نے دیکھا کہ بجائے اس کے کہ خط کی ابتداء میرے نام سے ہوتی پیغمبر نے اپنے نام سے کی ہے غصہ سے بے قابو ہوگیا اور اس نے آپ کا خط چاک کر ڈالا! قیصر کے بھائی نے جب پیغمبر کا خط قیصر کے نام پڑھا اور دیکھا کہ پیغمبر نے پہلے اپنا نام لکھا ہے تو اس کے غیظ و غضب کی بھی انتہا نہ رہی اور چاہا کہ آپ کے نوشتے کو پھاڑ ڈالے مگر قیصر نے منع کیا اور کہا کہ تم یا تو چھوٹے درجہ کے احمق یا بڑے درجہ کے دیوانے ہو میں نے ابھی خط کو دیکھا بھی نہیں اور تم اسے پھاڑ ڈالنا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم محمد اگر واقعی خدا کے رسول ہیں تو انہیں چاہئے بھی یہی کہ میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھیں۔

پیغمبر نے جو طریقہ اختیار کیا اسی طریقہ پر آپ کے بعد کے خلفاء بھی گامزن رہے۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ جب امام حسن نے زیاد بن ابیہ کو خط لکھا اور خط میں اپنے نام سے ابتداء کی تو زیاد کو بہت ناگوار گذرا اور اس نے بہت دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے انتہائی گستاخانہ انداز میں آپ کو جواب دیا امام حسن نے وہ خط اٹھا کر معاویہ کے پاس بھیج دیا۔ معاویہ نے زیاد کو لکھا حسن نے اپنے نام سے خط میں ابتداء اپنی برتری کی بناء پر کی ہے اور اس سے تمہاری شان نہیں گھٹتی لیکن شرط یہ ہے کہ تم غور سے دیکھو۔[5]

۱۔ طبری، ج ۲، ص ۳۸۵، جمہرۃ الرسائل، ج ۱، ۶۱ ۔ ۲۔ سیرۃ حلبیہ، ج ۲، ص ۲۸۱ زینی و حاشیہ سیرۃ حلبیہ، ج ۳، ۷۱، جمہرۃ الرسائل، ج ۱، ص ۴۹
۳۔ یعقوبی، ج ۲، ص ۶۲ ۔ ۴۔ طبری، ج ۲، ص ۲۹۴، اعلام الوری، ص ۳۰، جمہرۃ الرسائل، ج ۱، ص ۳۷، سیرۃ حلبیہ، ج ۲، ص ۲۷۹، سیرۃ زینی و حلان، ج ۳، ص ۶۸ ۔ ۵۔ شرح نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۳

خلفاء ثلاثہ اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں حکام و اعلیٰ افسران جب بارگاہ خلافت میں خط لکھتے تو پہلے خلیفۂ وقت کا نام لکھتے جیسے خالد بن ولید نے خلیفۂ اول کو لکھا۔

لعبد اللّٰہ ابی بکر خلیفة رسول اللّٰہ من خالد بن الولید۔ ۱

ابوعبیدہ بن الجراح نے لکھا "لعبد اللّٰہ ابی بکر خلیفة رسول اللّٰہ"۔ ۲

نصر بن حجاج نے خلیفۂ دوم کو لکھا "لعبد اللّٰہ عمر امیر المومنین من نصر بن الحجاج ابن ابی الحدید"۔ ۳

ابوعبیدہ نے لکھا "لعبد اللّٰہ عمر امیر مومنین من ابی عبیدہ"۔ ۴

ہاشم مرقال نے امیر المومنین کو لکھا: "لعبد اللّٰہ امیر المومنین من ہاشم ابن ابی الحدید"۔ ۵

محمد بن ابی بکر نے لکھا "ابی عبد اللّٰہ امیر المومنین من محمد ابن ابی بکر ابن ابی الحدید"۔ ۶

عبد اللہ بن عباس نے لکھا "لعبد اللّٰہ علی امیر المومنین من عبد اللّٰہ بن عباس ابن ابی الحدید"۔ ۷

اسی قسم کے اور بہت سے خطوط ہیں جو حکام و ولاۃ نے خلفائے وقت اور سلاطین زمانہ کو لکھے ہر خط کا اسلوب یہی ہے کہ پہلے مکتوب الیہ کا نام ہے، بعد میں اپنا۔

ان حقائق و شواہد کے ہوتے ہوئے عقد فرید ۸ کی یہ عبارت کتنی حیرت انگیز ہے کہ "اسی مسلمان پیغمبر کے نام خطوط لکھتے اور خط کی ابتدا اپنے نام سے کرتے منجملہ ان لوگوں کے جنہوں نے اپنے مکتوب کا آغاز اپنے نام سے کیا ابوبکر علاد بن حضرمی ہیں اسی طرح اور دیگر صحابہ و تابعین میں یہی طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ ولید بن عبد الملک تخت نشین خلافت ہوا اس نے فرمان جاری کیا۔ کہ خلیفہ وقت کو اس طرح خط نہ لکھا جائے جس طرح عام افراد ایک دوسرے کو لکھتے ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت علامہ ابن عبدربہ پر ہے کہ وہ تاریخ پر پورا عبور رکھتے اور متعدد کتابوں کے مؤلف ہونے کے باوجود کیسے ایسی بات لکھ گئے جو حقائق کے بالکل برعکس ہے غالباً ان کے پیش نظر

۱- جمہرۃ رسائل العرب، ج۱، ص ۱۵۴ ۲- جمہرۃ رسائل العرب ج۱، ص ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۸۷ و ۱۹۰ ۳- ج ۳، ص ۹۹
۴- جمہرۃ رسائل العرب، ج۱، ص ۱۹۰ ۵- ج ۳، ص ۲۹۱ ۶- ج ۲، ص ۳۰ ۷- ج ۲، ص ۳۵، کنز العمال، ج ۳، ص ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۶۷، جمہرۃ رسائل العرب ۸- (ج ۳، ص ۴) اور سنن کبریٰ بیہقی (ج۱، ص ۱۲۹، و ۱۳۰)

بعض صحابہ و تابعین کے کچھ خطوط تھے جو ایسے اشخاص کے نام لکھے گئے جنہیں ابن عبدربہ بزرگ اور محترم سمجھتے تھے اور ان اشخاص کا نام ان کے خیال میں پہلے لکھنا ضروری و لازم تھا۔ لیکن لکھنے والوں نے مکتوب الیہ پر اپنی برتری جتانے کے لئے اپنا نام پہلے لکھا ابن عبدربہ نے اپنے ان قابل احترام اشخاص کی حمایت کرتے ہوئے لکھ دیا کہ صحابہ کرام بھی پیغمبر کو جب خط لکھتے تو پہلے اپنا نام لکھتے بعد میں پیغمبر کا ہم نے بہت تلاش و جستجو کی مگر ہمیں حضرت ابوبکر اور ابو العلاء کے وہ خطوط کسی کتاب میں نہ ملے جن میں انہوں نے اپنے نام سے ابتداء کی تھی۔ ایک اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ ملا علی متقی نے کنز العلما[1] میں ابوہریرہ سے روایت کی کہ وہ ابتداء اپنے بڑوں کے نام سے کرتے تھے تم میں سے جو کوئی خط لکھے اسے چاہئے کہ اپنے نام سے ابتداء کرے۔ کنز العلما میں یہ بھی ہے کہ معاذ نے حضرت عمر کو خط لکھا تو پہلے اپنا نام لکھا۔

یہ سارے اقوال حقیقت و واقعہ کے بالکل برعکس ہیں ہم اوپر صراحت سے ذکر کر چکے ہیں کہ پیغمبر خدا خود جس کسی کو خط لکھتے تو اپنے نام سے ابتداء کرتے اور جب دوسرے افراد پیغمبر کو خط لکھتے تو وہ بھی پہلے آنحضرت ہی کا نام لکھتے اسی کنز العمال میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ ابوموسیٰ کے کاتب نے ابوموسیٰ کی جانب سے حضرت عمر کو خط لکھا اس خط میں ابوموسیٰ کا نام پہلے لکھا حضرت عمر کا بعد میں حضرت عمر نے ابوموسیٰ کو لکھا کہ اپنے کاتب کو ایک کوڑا مارو اور اسے برخواست کردو۔

آپ کے خطوط کی بلاغت

زمانہ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں عربی زبان بالکل صحیح اور غلطیوں سے پاک تھی، اس وقت کے عربوں کی زبان بھی عربی تھی، جملوں کی ترتیب اور فقروں کی تکمیل میں ان کا اسلوب بھی عربی تھا اور اپنی تحریر و تقریر بول چال، اشعار و خطوط سبھی چیزوں میں وہ خالص عرب ہوا کرتے اس لئے کہ ابھی تک غیر ملکیوں اہل فارس و روم و ترک و دیلم کے باشندوں سے ان کا میل جول نہ ہوا تھا نہ خود انہیں باہر آنے جانے کا موقع ملا تھا۔

حضرت رسالتمآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کے انتقال کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور دھڑا دھڑ غیر ممالک اسلامی دائرۂ سلطنت میں آتے گئے لونڈیوں اور غلاموں کی کثرت ہوگئی۔ تو غیر ملکیوں کے میل جول کی وجہ سے ان کا مزاج بھی بدلا۔ زبان بھی بدلی اور تحریر و تقریر میں

۱۔ کنز العلما، ج۵، ص ۲۲۶، حدیث ۴۶۸۹ ۲۔ کنز العلما، ج۵، ص ۲۴۳

بھی فرق آ گیا خلافت بنی امیہ و بنی عباس میں تو یہ فرق پوری طرح سے نمایاں ہوا عربوں کی خالص زبان میں بے شمار الفاظ فارس و روم کے آ گئے اسی طرح ان کی کتابت کا اسلوب بھی بدل گیا۔

زمانہ پیغمبر کے عرب، ایجاز و اختصار اور فضول باتوں سے پرہیز کرنے کو بلاغت بلکہ بلند ترین بلاغت سمجھتے تھے بلاضرورت طول دینا ان کے نزدیک بلاغت کے خلاف بلکہ عیب تھا ملاحظہ کیجئے۔ قیس بن ساعدہ ایادی اور جناب ابوطالب کے خطبے اکثم بن صیفی وغیرہ کے کلمات پیغمبر کے خطبے، امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے خطبات اور مختصر مختصر فقرے آپ دیکھیں گے کہ الفاظ کم سے کم اور معانی کا دریا کروٹیں لے رہا ہے۔ یہی کیفیت ان حضرات کے خطبوں کی بھی تھی اور یہی ان کے خطوط کی بھی۔ خطوط میں ان کا اولین مطمح نظر یہ ہوا کرتا کہ بغیر کسی قافیہ بندی یا طول سے کام لئے مطلب واضح کر دیا جائے۔

پھر اس سادگی کو بھی پیش نظر رکھئے جو اس وقت عربوں کی خصوصیت تھی وہ اپنے خطوط کی ابتدا و انتہا میں کوئی خاص اہتمام ملحوظ نہیں رکھتے تھے ہم بطور نمونہ اکثم بن صیفی کا خط نقل کرتے ہیں جو انہوں نے پیغمبر خدا کو لکھا تھا۔ یہ اکثم زمانہ جاہلیت کے مشہور ارباب فصاحت میں سے تھے۔

"بسمک اللّٰھم من العبد الی العبد فابلغنا ما بلغک فقد اتانا عنک خبر لاندری ما اصله فان کنت اریت فارنا و ان کنت علمت فعلنا و اشرکنا فی کترک و السلام۔"

خداوند عالم کے نام سے بندۂ خدا کی طرف سے بندہ خدا کی طرف آپ کو جو باتیں پہنچی ہیں ہمیں بھی بتایئے آپ کے متعلق ہمیں ایک خبر ملی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی اصل کیا ہے اگر آپ کچھ دکھائے گئے ہیں تو ہمیں بھی دکھایئے اور اگر آپ کو کچھ باتیں بتائی گئی ہیں تو ہمیں بھی بتایئے اور اپنے خزانہ میں ہمیں شریک بنا لیجئے[1] دیکھئے کتنی بے تکلفی سے انہوں نے اپنا مطلب واضح کیا ہے اور کیسی سادگی ہے۔

پیغمبر کے خطوط میں بلاغت کے متعدد پہلو ملتے ہیں۔

۱- ضرورت پر اکتفاء کی جائے اور اصول مطالب بیان کر دیئے جائیں جزئیات سے قطع نظر کی جائے۔

۲- صرف اتنے الفاظ استعمال کئے جائیں کہ مخاطب کے ذہن میں مفہوم آسانی سے آ جائے نہ

۱- کنز الفوائد، ص ۲۴۹

الفاظ کے استعمال میں کوئی تکلف برتا جائے اور نہ قافیہ بندی ہو۔

۳۔ ضرورت تفصیل کی اگر نہ ہو تو جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لیا جائے۔ دیکھئے کتنا بلیغ خط آپ نے ہمدان والوں کو لکھا تھا۔ اسلم تسلم اسلام قبول کیا تو دنیا و آخرت کی سلامتی نصیب ہوگی۔ اور تہدید بھی کہ بصورت عدم قبول اسلام تمہاری سلامتی ضمانت نہیں۔

ایک فقرہ آپ کا یہ بھی تھا کہ "و اعلم ان دینی سیظهر الی منتهی الخف و الحافر" اور یہ جان لو کہ عنقریب میرا دین سارے دین کو ڈھک لے گا۔

۴۔ اگر مکتوب الیہ، عرب کا رہنے والا ہے تو اس کے لئے پر شوکت الفاظ پرشکوہ عبارت اور بلیغانہ اسلوب کا استعمال اور اگر مکتوب الیہ غیر عرب ہو تو اس کے لئے سہل سے سہل الفاظ تا کہ عربی سے معمولی واقفیت کا آدمی بھی اسے پڑھ لے۔

۵۔ خط کا آغاز و اختتام دونوں سیدھے سادھے لفظوں میں ہوتا تھا کسی قسم کی عبارت آرائی نہ ہوتی بسملہ سے خط کی ابتدا کرتے جو مقصد ہوتا وہ لکھتے اور سلام پر ختم کر دیتے یا یہ تحریر فرماتے "السلام علی من اتبع الهدی"

۶۔ اپنے لئے ضمیر ہمیشہ مفرد کی استعمال کرتے جیسے میں میرے لئے میرے پاس آیا میرے یہاں پہنچا اور مکتوب الیہ کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرتے جو سامنے موجود شخص کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں غرض کہ پیغمبر کے خطوط تمام تکلفات و قیود سے خالی اور سادگی کا بہترین نمونہ ہوتے تھے اور بس اتنا ہی لکھتے جتنے سے مقصد کی وضاحت ہو جائے نہ خواہ مخواہ کا طول دیتے اور نہ اتنا اختصار کرتے کہ مطلب ہی واضح نہ ہو پیغمبر کے بعد یہ شان باقی نہ رہی ایرانیوں کا رنگ مسلمانوں پر غالب آ گیا اور شاہان بنی امیہ و بنی عباس کے عہد میں عبارت آرائی اور بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال عام ہو گیا۔

نادر خطوط کی بلاغت

حضرت رسالتمآب نے جس وقت اعلان رسالت کیا اس وقت اہل عرب کی فصاحت و بلاغت اپنے عروج پر تھی شعر و سخن میں باہمی مقابلے ہوتے، خطابت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں ہوتیں پیغمبر خدا کی حیثیت ان ستاروں کے درمیان ماہتاب کی تھی آپ فصاحت کا سر، بلاغت کا معدن اور فصیحوں کے سردار اور بلاغت کے امام تھے۔

آپ سب سے زیادہ فصیح اللسان سب سے شیریں زبان تھے، الفاظ آپ کے بہت ہی درست، لب ولہجہ بہت ہی صاف اور طرز استدلال بہت کم ہوتا انداز خطاب سب سے بڑھ کر، آپ کی زبان سے جو فقرہ بھی نکلتا وہ تائید الٰہی اور عنایت ربانی کا مظہر ہوتا بنی نہد سے باتیں کرتے دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہم آپ ایک باپ کی اولاد پھر کیا بات ہے کہ عربوں کے وفود سے آپ کو ایسی باتیں کرتے دیکھتے ہیں جن میں سے اکثر ہماری سمجھ میں نہیں آتیں'' آپ نے فرمایا میرے پروردگار نے مجھے ادب کی تعلیم دی اور بہترین تعلیم دی اور میں نے بنی سعد میں تربیت پائی ہے۔[1]

آنحضرت ہر قسم کے لوگوں کو ان کی زبان میں خطاب کرتے شہری شخص کو جب مخاطب کرتے تو بہت سہل اور شیریں زبان میں جسے معمولی استعداد کا شخص بھی آسانی سے سمجھ لے۔ جب کسی بدوی کو خطاب کرتے تو دشوار الفاظ استعمال میں لاتے علامہ زینی حلان سیرت محمدیہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔[2]

رسالتمآب ہر قوم سے اس کی اپنی زبان میں گفتگو کرتے اور اسی کی زبان میں خط لکھتے۔ پیغمبر کی بلاغت کا یہ بھی ایک پہلو تھا کہ آپ ہر اجنبی زبان والے کے ساتھ اجنبی زبان میں گفتگو کرتے اور بلیغ زبان والوں کے ساتھ ان کی بلیغ زبان میں شہریوں سے ایسی زبان میں جو تیل سے زیادہ نرم اور بارش سے زیادہ صاف و شفاف ہوتی اور بدوی عربوں سے ایسی زبان میں جو تلوار سے زیادہ تیز اور چٹانوں سے زیادہ بلند ہوتی۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم تمام خلائق کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے سرخ و زرد، سپید اور سیاہ و عربی اور عجمی ہر ایک کے لئے خداوند عالم نے اتمام حجۃ کی غرض سے پیغمبر کو ہر زبان کی تعلیم اور ہر قوم کے محاورات سے پوری آگاہی بخشی تھی ارشاد الٰہی ہے۔"و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه"۔[3]

حضرت خاتم النبیین تمام بنی نوع انسان کے لئے نبی مقرر ہو کر آئے تھے۔ "و ما ارسلناک الا کافة للناس" یہی وجہ تھی کہ خداوند عالم نے آپ کو تمام زبانیں تعلیم فرمائی تھیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جب جناب بلال پیغمبر خدا کی خدمت میں آئے تو انہوں نے حبشی زبان میں آپ سے گفتگو کی (اره بره کنکوة کوی کری منذره) حاضرین میں سے کوئی سمجھ نہیں پایا پیغمبر خدا ہی نے بتایا کہ

۱- مقدمہ نہایہ ابن اثیر، زینی بر حاشیہ سیرت حلبیہ، ج ۳، ص ۹۶ و ۸۴ ۲- حاشیہ حلبیہ، ج ۳، ص ۸۳ ۳- سورہ ابراہیم، آیت ۴

بلال کا مطلب کیا ہے؟

صاحب مواہب لکھتے ہیں پیغمبر کی خصوصیات میں یہ بات شامل تھی کہ آپ ہر زبان کے لوگوں سے ان کی زبان میں گفتگو فرماتے۔ اہل عرب میں مختلف قبائل تھے ہر قبیلہ کی زبان اور محاورات اسالیب کلام اور ترکیب الفاظ علیحدہ تھی لہذا آنحضرت کا ہر قوم سے ان کے محاورات اور ترکیب الفاظ کے موافق کلام کرنا مخل فصاحت نہیں بلکہ فصاحت کی بلند ترین قسموں میں سے ہے۔ اگرچہ آپ کے بعض الفاظ ہمیں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی اجنبیت وغرابت ہمارے لحاظ سے ہے لیکن جن لوگوں کی زبان میں بات کہی گئی ان کے یہاں وہی فصیح ہے دیہاتی عربوں کی زبان خود ان کے لحاظ سے فصیح ہے وہ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان نہ بولتے اگر کوئی دوسرا ان کی زبان سنتا تو وہ ایسی ہی غیر زبان معلوم ہوتی جیسی عربوں کے نزدیک اہل عجم کی زبان۔ پیغمبر کا ہر قوم وقبیلہ کی زبان پر قادر ہونا ربانی قوت اور عطائے ربانی کے سبب تھا۔ کیونکہ آپ تمام خلائق کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سیاہ وسرخ سب کے لئے اسی وجہ سے خداوند عالم نے آپ کو تمام زبانوں کی تعلیم دی ارشاد الٰہی ہے: "و اما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه" لہذا جب خداوند عالم نے آپ کو سب کے لئے مبعوث کیا تو سب زبانیں بھی تعلیم کیں کہ آپ ہر شخص کو اس کی زبان میں تعلیم دے سکیں یہ چیز آپ کے معجزات میں سے تھی آپ نے بعض حبش کے رہنے والوں سے زبان حبشی میں اور بعض اہل فارس سے ان کی زبان فارسی میں گفتگو فرمائی تھی۔[۱]

آپ کے کسی صحابی نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کس قدر فصیح ہیں؟ آپ سے زیادہ ہم نے کسی کو فصیح نہیں پایا۔ آنحضرت نے فرمایا میں کیوں نہ سب سے بڑھ کر فصیح رہوں جب کہ میری ہی زبان میں بہت فصیح وواضح عربی زبان ہے قرآن مجید نازل ہوا۔

دوسری روایت میں ہے کہ سب سے بڑھ کر فصیح ہونے میں میرے لئے کیا مانع ہے جب کہ میں تمام عربوں کے درمیان فصیح تر ہوں اور قرآن میری ہی زبان میں نازل ہوا ہے۔[۲]

علامہ ابن عساکر علامہ زینی، حلان اور حافظ ابونعیم ناقل ہیں کہ حضرت عمر نے رسول اللہ سے کہا یا رسول اللہ آپ ہم لوگوں سے کتنا زیادہ فصیح ہیں حالانکہ آپ نے ہم لوگوں میں پرورش نہیں پائی۔

۱۔ زینی وحلان بر حاشیہ سیرت حلبیہ، ج ۳، ص ۸۸ شفا وشرح شفا قاضی عیاض، ج ۱، ص ۱۷۵ تا ۱۹۹

۲۔ بحار الانوار، ج ۶، ص ۲۳۰، شرح شفائے قاضی عیاض، ج ۱، ص ۱۹۵

آنحضرت نے فرمایا۔ جناب اسمٰعیل کی زبان مٹ چکی تھی۔ جبرئیل اسے میرے پاس لے کر آئے اور میں نے اسے حفظ کرلیا۔

جی ہاں! سطور بالا میں ہم نے عرض کیا ہے کہ پیغمبر خدا چونکہ تمام بنی آدم یعنی کالے، گورے اور عربی وعجمی ہر ایک کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اس لئے آپ عرب اور غیر عرب سب کی زبانوں سے واقف تھے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔" و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه" مورخین و محدثین نے بھی صراحت کی ہے کہ پیغمبر خدا نے ہر شخص سے اس کی زبان میں گفتگو فرمائی لیکن آپ نے شاہان عجم جیسے قیصر وکسریٰ ونجاشی وغیرہ کو جب بھی خطوط لکھے تو عربی زبان ہی میں لکھے حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہر ایک کو اس کی زبان میں خطوط لکھتے اس صورت میں پیغمبر کی معجزانہ شان بھی ظاہر ہوتی اور یہ بات باہمی الفت ومودت کی افزائش کا باعث بھی قرار پاتی لیکن پیغمبر کے ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملت اسلامیہ کی شان وشوکت کی حفاظت پیغمبر کے مدنظر تھی اور ان کے مستقل قوم اور عظیم المرتبت ہونے کا اظہار پیش نظر تھا دیکھئے آج بھی ترقی یافتہ قومیں اپنی زبان کو دنیا میں پھیلانے اور ترویج دینے کے لئے کتنی کوشاں ہیں چاہتی ہیں کہ ہماری زبان عالمی زبان بن جائے پیغمبر خدا کی نظر اسلام اور اس کی ہمہ گیر صلاحیتوں پر تھی آپ جانتے تھے کہ ایک دن سارے عالم پر اسلامی پرچم لہرا کر رہے گا لہٰذا ضروری ہے کہ قرآن کی زبان بھی ہمہ گیر بن جائے تمام عالم میں اس کی اشاعت ہو جس طرح آپ سارے بنی آدم کے لئے نبی مبعوث ہوئے تھے اسی طرح قرآن مجید دنیا کی تمام اقوام وملل کے لئے دستور حیات تھا لہٰذا قرآن کی عظمت، اس کی ہمہ گیر دعوت، پیغمبر خدا کا ہر فرد بشر کے لئے نبی ہونا، مقتضی تھا کہ آپ جس کو بھی خط لکھیں اسے عربی ہی میں لکھیں۔

پیغمبر خدا لکھتے تھے یا نہیں

حضرت سرور کائنات لکھواتے تھے اور کاتب لکھتے تھے خود آنحضرت اپنے ہاتھوں سے نہیں لکھتے تھے جیسا کہ آپ کے بعد خلفائے اسلام کاتبوں کو لکھواتے اور خود بہت ضرورت کے وقت لکھتے تھے۔ کتب تاریخ وسیرت سے ہمیں کسی ایسے موقع کا پتہ نہیں چلتا کہ پیغمبر خدا نے اپنے دست مبارک سے خطوط لکھے ہوں صرف غزوہ حدیبیہ کے موقع پر صحیح بخاری وغیرہ میں یہ روایت ملتی ہے کہ جب صلحنامہ

آپ کے اور سہیل بن عمرو کے مابین لکھا جارہا تھا اور حضرت علی نے "من محمد رسول اللہ" لکھ دیا تھا۔ اور سہیل نے اعتراض کیا تھا تو آپ نے حضرت علی سے وہ نوشتہ لے کر رسول اللہ کا لفظ کاٹ دیا تھا اور محمد بن عبد اللہ کی لفظ لکھ دیا تھا۔ علامہ مجلسی نے بحار میں جامع الاصول سے جو صحاح ستہ کا خلاصہ ہے براء بن عازب کی یہ حدیث لکھی ہے کہ:

رسول اللہ نے وہ کاغذ لے لیا اور آپ کو اچھی طرح لکھنا نہیں آتا تھا آپ نے اس نوشتہ میں لکھا، یہ وہ عہد نامہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے کیا۔

امام احمد نے بھی اس حدیث کی روایت کی ہے۔[1]

پیغمبر خدا لکھنا جانتے تھے یا نہیں اس کے متعلق جمہور مسلمین کا مسلک یہ ہے کہ پیغمبر لکھنے سے نابلد تھے اس کے ثبوت میں کلام مجید کی چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ "و ماکنت تتلوا من قبله من کتاب و لاتخطه بیمینک اذا لارتاب المبطلون" اے پیغمبر اس سے پہلے نہ آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل شک وشبہ میں پڑ جاتے۔

لیکن یہ دلیل صحیح نہیں اس لئے کہ آیت صرف یہ بتاتی ہے کہ نزول قرآن اور اپنے مشن میں کامیاب ہونے کے پہلے آپ لکھتے پڑھتے نہ تھے لیکن نزول قرآن کے بعد بھی آپ کی یہی کیفیت رہی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔

دوسری آیتیں یہ پیش کی جاتی ہیں "الذین یتبعون النبی الامی" وہ لوگ جو امی پیغمبر کی اتباع و پیروی کرتے ہیں: "آمنوا باللہ و رسوله النبی الامی" ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے امی رسول پر۔

لیکن یہ دونوں آیتیں بھی پیغمبر کے قرائت و کتابت سے نابلد ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ امی کے معنوں میں شدید اختلاف ہے اتنے معنی امی کے علماء نے لکھے ہیں۔

۱۔ جو نہ لکھ سکتا ہو نہ پڑھ سکتا ہو۔

۲۔ امی کا مطلب ہے ام القری یعنی مکہ کا رہنے والا۔

۳۔ امی سے مراد عرب والے ہیں اس لئے کہ وہ اچھی طرح کتابت کرنا نہیں جانتے تھے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: "بعث فی الامیین رسولا منهم"

۴۔ امیین سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں کوئی نبی معبوث نہیں ہوا یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلہ کی

۱۔ مسند، ج ۴، ص ۲۹۸

ہے اور نبی امی سے مراد وہ نبی ہے جو ایسی امت میں مبعوث ہوا جس میں پہلے کوئی نبی نہیں آیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے معانی ہیں، لہٰذا جب لفظ امی کے اتنے معانی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ امی سے مراد ان پڑھ لیا جائے دوسرے معانی نہ لئے جائیں جن کے قرائن بھی زیادہ ہیں۔

اس بارے میں اہل بیت علیہم السلام سے کئی حدیثیں مروی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ پیغمبرؐ سے متعلق دوسروں کے بہ نسبت زیادہ واقف وخبیر تھے۔

۱- صدوق نے علل میں بسلسلہ نادر روایت کی ہے کہ جعفر بن محمد صوفی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا فرزند رسول پیغمبر کو امی کیوں کہا گیا آپ نے پوچھا لوگ کیا کہتے ہیں جعفر نے عرض کی لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ پیغمبر اچھی طرح لکھنا نہیں جانتے تھے امام نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں بھلا یہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے درانحالیکہ ارشاد خداوند عالم ہے هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم أیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة" تو جب پیغمبر انپڑھ تھے تو انہیں تعلیم کیونکر دیتے تھے خدا کی قسم رسول اللہ ۷۲ یا ۷۳ زبانیں پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے امی آپ کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ مکہ کے رہنے والے تھے اور مکہ امہات القری سے ہے ارشاد الٰہی ہے۔

لتنذر ام القری و من حولها.

اسی مضمون کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی مروی اور بحار الانوار، علل الشرائع، اختصاص اور بصائر الدرجات میں منقول ہے۔

۲- امام جعفر صادق سے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر خدا پڑھنا جانتے تھے لکھنا نہیں۔

۳- امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ منجملہ ان احسانات کے جو خداوند عالم نے پیغمبر خدا پر فرمائے یہ بھی ہے کہ آپ پڑھے تھے مگر لکھتے نہ تھے جب ابوسفیان فوج کشی کے ارادہ سے احد کی طرف بڑھا تو جناب عباس نے خط لکھ کر پیغمبر خدا کو اس کی اطلاع دی جس وقت قاصد خط لے کر آیا اس وقت پیغمبر مدینہ کے کسی باغ میں تھے آپ نے وہ خط پڑھا لیکن اصحاب کو نہیں بتایا ان سے کہا کہ تم لوگ شہر میں چلو جب وہ لوگ شہر میں آ گئے تب پیغمبر نے انہیں آگاہ کیا اہل سنت کے یہاں مروی ہے کہ:

"پیغمبر خدا نے اس وقت تک انتقال نہیں کیا جب تک لکھنے پڑھنے نہ لگے شعبی سے اس روایت کا

۱- تفسیر درمنثور، ج ۳، ص ۱۳۱، شعبی والا جملہ مجلسی نے بحار میں نقل کیا ہے

ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا درست ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو بھی ایسا ہی بیان کرتے سنا ہے''۔[۱]

یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ پیغمبر خدا پڑھنا ضرور جانتے تھے جو کچھ اختلاف ہے وہ اس میں کہ کتابت بھی جانتے تھے یا نہیں۔ تمام روایتوں کو جمع کرنے کی صورت میں یہی ہے کہ نزول قرآن کے بعد پیغمبر لکھنا بھی جانتے تھے اور پڑھنا بھی مگر آپ نے کبھی لکھا نہیں اور غزوہ حدیبیہ کے متعلق جو روایت مذکور ہے کہ پیغمبر نے معاہدہ صلح اپنے ہاتھ سے لکھا تو یہ ان روایتوں کے معارض ہے جسے تقریبا تمام مورخین نے نقل کیا ہے اور اس میں مذکور ہے کہ پیغمبر نے نہیں لکھا۔

علامہ مجلسی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں'' بھلا کیونکر ممکن ہے کہ وہ شخص جو علوم اولین و آخرین کا عالم ہو وہ یہ نہ جانتا ہو کہ یہ نقوش ان حروف کے لئے وضع کئے گئے ہیں'' الف'' ایسے لکھا جاتا ہے اور'' ب'' ایسے جو خداوند عالم کی عنایتوں کی بدولت اس پر قادر ہو کہ قمر کو شق کردے بلکہ اس سے بھی بڑی چیز وہ حروف لکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا کاغذ اور تختی پر فقرے تحریر نہیں کرسکتا۔

لیکن علامہ مجلسی کے اس جملہ پر ہمیں تأمل ہے یہ ٹھیک ہے کہ خداوند عالم اگر چاہتا ہے تو جس طرح شق قمر پر اس نے پیغمبر کو قدرت دی کتابت عنایت کرتا لیکن سوال یہ ہے کہ خدا نے یہ چاہا بھی یا نہیں ہوسکتا ہے کہ خداوند عالم پیغمبر کے لئے کتابت پسند نہ کرتا ہو جس طرح شان اعجاز پیدا کرنے اور اتمام حجت کے خاطر اس نے پیغمبر کے لئے شعر کہنا پسند نہ کیا بات یہ ہے کہ اہل بیت طاہرین سے جو روایتیں اس باب میں مذکور ہیں ان میں سے کوئی روایت یہ نہیں بتاتی کہ پیغمبر نے خود اپنے دست مبارک سے کچھ لکھا ہو۔"و اهل البيت او دی بما فی البيت" اہل بیت سے بڑھ کر حال پیغمبر کو کون زیادہ جان سکتا ہے۔

کاتبان خطوط

خداوند عالم نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کو جب رسالت پر مبعوث فرمایا اور قرآن مجید ان پر نازل کیا تو پیغمبر کو ضرورت ہوئی ایسے کاتب کی جو وحی بھی لکھتا جائے اور دیگر خطوط وغیرہ بھی جب تک آپ مکہ میں مقیم رہے یہ ضرورت، وحی کی کتابت تک محدود رہتی، وہاں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں یہ خدمت انجام پاتی رہی ممکن ہے بعض دوسرے مسلمان بھی اس خدمت میں شریک رہے ہوں جنہیں کتابت سے واقفیت تھی دس برس اسی طرح گذرے جب پیغمبر

ہجرت کر کے مدینہ آ گئے مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور آس پاس کے قبائل سے تعلقات و روابط بڑھنے لگے تو ضرورت ہوئی کہ کئی کئی اشخاص لکھنے پڑھنے کی غرض سے معین کئے جائیں یہی وجہ ہوئی کہ کاتبوں کی کافی تعداد ہوگئی اور ہر شعبہ کے لئے ایک کاتب مقرر ہوا اور ہر کاتب کے لئے ایک مددگار ہم مورخین کی کتابوں سے ان کی مختصر فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں۔

علی ابن ابی طالب علیہ السلام

زیادہ تر وحی آپ ہی لکھا کرتے تھے وحی کے علاوہ دیگر خطوط وغیرہ بھی آپ لکھتے، جب پیغمبر کسی سے معاہدہ کرتے تو عہد نامہ اور جب کسی سے صلح کرتے تو معاہدہ صلح علی لکھا کرتے آپ پیغمبر کے مبعوث برسالت ہوتے ہی اسلام لائے تھے۔ اور آپ نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔

ابی ابن کعب انصاری خزرجی

یہ بھی وحی لکھا کرتے۔ سیرت حلبیہ مناقب اسد الغابہ اصابہ واقدی سے روایت ہے کہ پیغمبر کے مدینہ آنے کے بعد سے سب سے پہلے جس نے وحی کی کتابت کی وہ یہی ہیں (سیرت حلبیہ) تاریخ یعقوبی و تاریخ کامل میں بھی انہیں کاتبوں میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت عمران کی بڑی تعریفیں کیا کرتے اور مشکل مسئلے پوچھتے یہ استیعاب ج-ا میں ہے کہ ابی ابن کعب ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے زید بن ثابت سے پہلے کتابت وحی کی خدمات انجام دیں زید بن ثابت کے ساتھ بھی کتابت کرتے تھے۔

زید بن ثابت انصاری خزرجی

یہ بھی کاتب وحی تھے۔ (اسد الغابہ مناقب شہر بن آشوب) اصابہ میں ہے کہ یہ وحی لکھتے تھے اور دیگر خطوط وغیرہ بھی مناقب میں ہے کہ یہ وحی ابی ابن کعب کے ساتھ اور بادشاہوں کے نام خطوط عبد اللہ بن ارقم کے ساتھ لکھا کرتے۔

اسد الغابہ میں ہے کہ جب ابی بن کعب موجود نہ ہوتے تو زید بن ثابت لکھتے محدثین کا بیان ہے کہ پیغمبر کے پاس سریانی زبان میں خطوط آیا کرتے پیغمبر نے زید کو حکم دیا اور انہوں نے یہ زبان سیکھی کتاب التنبیہ والاشراف میں ہے کہ یہ بادشاہوں کو خطوط لکھا کرتے۔

یعقوبی و حلبی نے انہیں کاتبوں میں شمار کیا ہے۔ پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے غزوہ خندق

تھا کیونکہ اس سے پہلے کے غزوات میں وہ کمسن تھے۔

اسد الغابہ میں ہے کہ جب پیغمبر مدینہ تشریف لائے تو زید کی عمر ۱۱ سال کی تھی اور یہ عثمانی تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ صفین وجمل وغیرہ میں شریک نہ ہوئے اور خلیفۂ اول کے دور خلافت میں انہوں نے قرآن کی کتابت کی۔

عبد اللہ بن ارقم

یہ بھی آنحضرت کے کاتب تھے منقول روایت کے مطابق عبداللہ بادشاہوں کے نام خط اور قبالے لکھا کرتے تھے۔

کتاب التنبیہ والاشراف میں ہے کہ یہ لوگوں کے معاملات ان کی دستاویزیں وغیرہ لکھتے۔

اسد الغابہ میں ہے کہ پیغمبر نے جب ان سے کتابت کا کام لینا شروع کیا تو ان پر پورا بھروسہ کرنے لگے ان پر یہاں تک اطمینان ہوگیا کہ جب یہ آنحضرت کی طرف سے کسی بادشاہ کو خط لکھتے تو پیغمبر حکم دیتے کہ مہر لگا کر خط بند کردو پڑھوا کر سنتے بھی نہیں تھے اصابہ میں بھی عبد اللہ بن زبیر سے اسی مضمون کی روایت منقول ہے۔

یہ فتح مکہ کے سال مسلمان ہوئے خلیفۂ سوم کے دور خلافت میں بیت المال کے سرپرست یہی تھے بعد میں اختلافات پیدا ہوئے جس پر انہوں نے استعفا دے دیا خلیفہ نے انہیں ۳۰ ہزار درہم دینے چاہے انہوں نے قبول نہ کیا کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔

علاء بن عقبہ

یہ بھی کاتب تھے (مناقب) یہ قبالے لکھا کرتے کتاب التنبیہ والاشراف اور اصابہ میں ہے کہ قرض کی دستاویزیں اور تمام عقود و معاملات لکھا کرتے۔ اسد الغابہ میں ہے کہ پیغمبر نے ان سے بھی بعض اوقات کتابت کی خدمت لی ہے۔

زبیر بن عوام اور جہم بن الصلت

یہ دونوں زکوۃ کا حساب لکھا کرتے (کتاب التنبیہ والاشراف مناقب) زبیر بارہ یا ۱۲ برس کے سن میں اسلام لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت کرکے گئے غزوہ بدر اور دیگر غزوات میں بھی شریک ہوئے علامہ ابن حجر اور ابن اثیر نے انہیں کاتبوں میں ذکر نہیں کیا اور نہ ان لوگوں میں ان کا نام لکھا ہے جو

کتابت سے واقف تھے۔ ابن اثیر نے ابی کے حالات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ کہ یہ بھی کبھی کبھی لکھا کرتے جہم فتح خیبر کے سال مسلمان ہوئے۔

خدیفہ بن یمان

یہ کھجور کی زکوٰۃ کا حساب لکھا کرتے مناقب و کتاب التنبیہ والاشراف کے مطابق یہ پیغمبر کے رازدار صحابی تھے پیغمبر نے انہیں منافقین کے نام بتائے تھے۔ امیر المومنین کے خاص محبین میں سے تھے۔

معیقیب بن ابی فاطمہ

یہ مال غنیمت کا حساب لکھتے کتاب التنبیہ و الاشراف اسد الغابہ میں بسلسلۂ حالات ابی مذکور ہے کہ معیقیب بھی منجملہ ان لوگوں کے ہیں جن سے پیغمبر نے کتابت کا کام لیا..... اسد الغابہ میں ہے کہ یہ ابتدائی مرحلہ میں اسلام لائے انہوں نے دو ہجرتیں کیں، پہلے حبشہ کی طرف، پھر مدینہ کی طرف۔

خالد بن سعید

ضرورت کے وقت پیغمبر ان سے بھی کتابت کا کام لیتے اسی طرح مغیرہ بن شعبہ اور حصین بن نمیر سے بھی کتاب التنبیہ و الاشراف یہ خالد سابقین مسلمین میں سے تھے تیسرا یا چوتھا نمبر اسلام لانے والوں میں ان کا ہے پیغمبر خدا نے انہیں صدقات یمن کی وصولی پر عامل مقرر کیا تھا۔ پیغمبر کی رحلت تک اسی منصب پر سرفراز رہے۔

حنظلہ بن ربیع

مذکورہ بالا افراد کی عدم موجودگی میں کتابت کی خدمت یہ انجام دیتے تھے۔ کتاب التنبیہ والاشراف، تاریخ یعقوبی اور تاریخ کامل میں کاتبان رسول کے زمرہ میں ان کا بھی نام مذکور ہے۔

ان مذکورہ بالا اشخاص کے علاوہ بعض دوسرے افراد بھی ہیں جن سے ایک یا دو مرتبہ کتابت کی خدمت لی گئی۔ مورخین و محدثین نے ان کے نام بھی اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں بعض نے تو ۴۲ر افراد تک گنتی پہنچا دی ہے۔ ہم ان لوگوں کے نام ذکر کرتے ہیں جنہیں مورخین نے کاتبوں میں شمار کیا ہے۔

۱- **عبد اللہ بن سعد ابی سرح قرشی عامری:** علامہ ابن اثیر نے اسد الغابہ اور تاریخ کامل میں ابن حجر نے اصابہ میں ابن عبد البر نے استیعاب میں اور دیگر مورخین و محدثین نے بھی اسے کاتبان رسول

میں ذکر کیا ہے فتح مکہ کے پہلے مسلمان ہوا پھر مرتد ہوکر مکہ چلا گیا جب مکہ فتح ہوا تو پیغمبر نے حکم دیا کہ عبد اللہ بن سعد ابن ابی سرح جہاں ملے قتل کر ڈالا جائے چاہے خانہ کعبہ کے پردوں کے نیچے ہی کیوں نہ ہو۔ عبد اللہ نے بھاگ کر حضرت عثمان کی پناہ لی کیونکہ یہ ان کا رضاعی بھائی تھا حضرت عثمان نے اسے چھپا دیا۔ جب امن و امان قائم ہوگیا اور اطمینانی فضا ہوگئی تو اسے لے کر پیغمبر کی خدمت میں آئے اور رسول اللہ سے اس کی جان بخشی کی درخواست کی رسول اللہ بہت دیر تک خاموش رہے پھر آپ نے کہا اچھا جاؤ معاف کیا جب حضرت عثمان واپس چلے گئے تو آنحضرت نے اپنے ارد گرد کے صحابہ سے کہا میں اتنی دیر جو خاموش رہا وہ اسی لئے کہ تم میں سے کوئی بڑھ کر اسے قتل کر ڈالتا۔ پھر یہ عبد اللہ دوبارہ مسلمان ہوا اور اس وقت تک ٹھیک رہا جب تک حضرت عثمان خلیفہ نہ ہوئے اور انہوں نے اسے مصر کا حاکم نہ مقرر کیا۔ مصر کا حاکم مقرر ہونے پر اچھی طرح کھیل کھیلا۔

۲- **ابوبکر بن ابی قحافہ:** تاریخ کامل اور سیرت حلبیہ میں ان کا بھی کاتب رسول ہونا مذکور ہے۔

۳- **عمر بن خطاب:** تاریخ کامل اور سیرۃ حلبیہ میں ان کا کاتب رسول ہونا مذکور ہے۔

۴- **عثمان بن عفان:** تاریخ کامل سیرت حلبیہ تاریخ یعقوبی اسد الغابہ مناقب میں مذکور ہے کہ یہ بھی کاتب رسول تھے۔

۵- **عامر بن فہیرہ:** حضرت ابوبکر کے غلام یہ سیاہ رنگ اور حضرت عائشہ کے مادری بھائی طفیل بن عبد اللہ کے غلام تھے رسول اللہ کے دارا رقم میں آنے کے پہلے غلامی کی حالت میں مسلمان ہو چکے تھے انہیں اپنے اسلام کی وجہ سے جانکاہ مصائب بھی اٹھانے پڑے حضرت ابوبکر نے انہیں خرید کر آزاد کیا یہ جنگ بدر و احد دونوں میں شریک تھے جنگ بئر معونہ میں شہید ہوئے ۴ھ میں (اصابہ اسد الغابہ) علامہ حلبی نے انہیں بھی کاتبان رسول میں ذکر کیا ہے۔

۶- **ثابت بن قیس بن شماس:** انصار کے خطیب بھی تھے اور رسول اللہ کے بھی۔

۷- **معاویہ بن ابی سفیان:** حلبی و یعقوبی نے انہیں بھی کاتبان رسول میں ذکر کیا ہے۔

علامہ حلبی لکھتے ہیں:

معاویہ اور زید بن ثابت پیغمبر کی خدمت میں ہمہ وقت کتابت وحی وغیرہ کے لئے موجود رہتے ان دونوں کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔

کامل اور اسد الغابہ میں ہے کہ معاویہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے پیغمبر کے یہاں

کتابت کی خدمت انجام دی۔

کتاب اصابہ میں مدائنی سے منقول ہے کہ زید بن ثابت وحی لکھا کرتے اور معاویہ رسول اللہ کی طرف سے قبائل عرب کو خطوط لکھتے تھے۔

۸- **مغیرہ بن شعبہ:** حلبی و یعقوبی نے انہیں بھی کاتبان رسول میں ذکر کیا ہے غزوہ حدیبیہ کے لئے مسلمان ہوئے اور غزوہ حدیبیہ میں موجود بھی تھے۔

۹- **خالد بن ولید:** حلبی نے انہیں بھی کاتبان رسول میں ذکر کیا ہے اسد الغابہ میں انہیں ان لوگوں میں شمار کیا گیا ہے جنہوں نے کتابت کی خدمت انجام دی۔ تاریخ کامل میں ہے کہ یہ ۸ھ میں مسلمان ہوئے۔ اسد الغابہ میں ہے کہ ان کے اسلام میں اختلاف ہے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ غزوہ حدیبیہ کے بعد اور فتح خیبر کے پہلے مسلمان ہوئے بعض کا کہنا ہے کہ یہ ۸ھ میں مسلمان ہوئے۔ اصابہ میں ہے کہ یہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے اور پیغمبر نے بنی ہمدان اور بنی حارث کی طرف انہیں بھیجا۔ بعض لڑائیوں میں انہیں سپہ سالار مقرر کیا۔ ان لڑائیوں میں ان سے جو ناروا باتیں ظہور میں آئیں ان سے پیغمبر کی بیزاری تقریباً سبھی مورخین نے ذکر کی ہے۔

۱۰- **علاء بن حضرمی:** حلبی نے سیرت حلبیہ میں ابن اثیر نے تاریخ کامل میں انہیں بھی کاتبوں میں شمار کیا ہے۔ مناقب میں مذکور ہے کہ ایک دو مرتبہ کتابت کی خدمت انہوں نے بھی انجام دی۔

۱۱- عمرو بن عاص: یعقوبی و حلبی نے کاتبان رسول میں شمار کیا ہے۔ اسد الغابہ میں ان کا شمار ان لوگوں میں کیا گیا ہے جنہوں نے ایک دو مرتبہ یہ خدمت انجام دی۔ یہ خالد کے ساتھ ۸ھ میں مسلمان ہوئے اور اسی سال پیغمبر نے انہیں جیفر شاہ عمان کے پاس بھیجا پیغمبر کے انتقال تک یہ واپس نہ ہوئے۔

۱۲- **عبد اللہ بن رواحہ:** حلبی نے انہیں کاتبان رسول میں شمار کیا ہے۔ اسد الغابہ میں ان لوگوں کے زمرہ میں ان کا ذکر ہے جنہوں نے ایک دو مرتبہ یہ خدمت انجام دی۔

۱۳- **محمد بن مسلمہ:** حلبی نے انہیں کاتبان رسول میں شمار کیا ہے اسد الغابہ میں ان لوگوں کے زمرہ میں ان کا ذکر ہے جنہوں نے ایک دو مرتبہ یہ خدمت انجام دی۔

۱۴- **شرجیل بن حسنہ:** یعقوبی نے انہیں کاتبان رسول میں شمار کیا ہے اور مناقب اور اسد الغابہ میں ان لوگوں کے زمرہ میں ان کا ذکر ہے جنہوں نے ایک دو مرتبہ یہ خدمت انجام دی۔ یہ بہت پہلے

مسلمان ہوئے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور فتح خیبر کے سال مدینہ واپس ہوئے۔

۱۵- **معاذ بن جبل:** یعقوبی نے انہیں کاتبان رسول میں شمار کیا ہے۔

۱۶- **عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی سلول:** حلبی نے انہیں کاتبوں میں شمار کیا ہے اصابہ و استیعاب میں ہے کہ دو مرتبہ انہوں نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

۱۷- **ابان بن سعید:** کامل میں انہیں کاتبوں میں شمار کیا گیا ہے یہ پیغمبر کی طرف سے بحرین کے عامل تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت تک اسی منصب پر فائز رہے جب رسول اللہ کا انتقال ہوا تو یہ اور ان کے بھائی وہاں سے واپس آئے اور حضرت ابوبکر کی خدمت میں اپنا استعفاء پیش کر دیا حضرت ابوبکر نے منظور نہ کیا اور کہا تم لوگ رسول کے مقرر کردہ عامل ہو۔ ان لوگوں نے کہا رسول اللہ کے بعد ہم کسی کی طرف سے گورنری کی خدمت انجام نہیں دیں گے۔ ان لوگوں کے علاوہ اور بھی کچھ افراد نے کتابت کی خدمت انجام دی مورخین نے خصوصیت کے ساتھ ان کا کوئی ذکر نہیں کیا بعض کے نام ہم آگے چل کر خطوط کے ذیل میں ذکر کریں گے۔

حضرت رسالتمآب کے انتقال کے بعد صحابۂ کرام بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے گئے جنہیں تھوڑے دن بھی آپ کی صحبت کے نصیب ہوئے تھے وہ بڑی عظمت و احترام کے مالک سمجھے گئے اور جو لوگ پیغمبر کی زندگی میں کسی خدمت پر مامور تھے جیسے زکوٰۃ کی وصولی، لشکر کی افسری، کسی شہر کی حکومت، کسی قوم و قبیلہ کا قاضی ہونا یا اور دوسرے مشاغل و مناصب ان کی عظمت و جلالت کا پوچھنا ہی کیا؟ مسلمان انہیں بڑی تقدیس کی نظروں سے دیکھتے ان کی صحابیت کو ان کے تقدس و پاکیزہ نفسی کا ثبوت اور ان کی عصمت کی دلیل سمجھتے ان صحابہ کے افعال جیسے بھی رہے ہوں اس سے مسلمانوں کو بحث نہ ہوتی۔

قیامت اس وقت ہوئی جس وقت دنیا کے بھوکے اور جاہ و منصب کے حریص افراد نے پیغمبر کی صحبت کو عوام کے بہکانے اور نادان مسلمانوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹنے کا ذریعہ بنالیا۔ انہوں نے صرف پیغمبر کی صحابیت ہی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ پیغمبر کی زندگی میں خدمات جلیلہ کی انجام دہی اور بڑے بڑے عہد و مناصب پر فائز رہنے کے مدعی ہوئے جو شخص پیغمبر کی صحبت میں ایک سال یا ایک مہینہ رہا یا جس نے صرف ایک مرتبہ پیغمبر کو دیکھا یا صرف ایک مرتبہ آپ سے کوئی حدیث سنی وہ صحابیت کے مرتبہ کا مالک بن بیٹھا اور جس نے پیغمبر کی طرف سے صرف ایک یا دو خط لکھے وہ اپنے کو کاتبان پیغمبر

میں شمار کرنے لگا بلکہ کاتب وحی ہونے کا مدعی ہوا اتنا ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ یہاں تک دعویٰ کیا جانے لگا کہ ہم ہر وقت پیغمبر کی خدمت میں کتابت کے لئے حاضر رہتے ہمارا کوئی کام ہی نہ تھا سوا اس کے۔

ہم چند افراد کا بطور نمونہ ذکر کرتے ہیں باقی کا انہیں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱- عمرو بن عاص ۸ ھ میں مسلمان ہوئے، پیغمبر نے انہیں اسی سال جیفر شاہ عمان کے پاس بھیج دیا پیغمبر کی زندگی تک یہ وہیں رہے آنحضرت کے انتقال کے بعد ان کی وہاں سے واپسی ہوئی پھر یہ کہاں سے کاتب بن گئے ان کو موقع ہی کہاں ملا کہ یہ خدمت انجام دیتے۔[۱]

۲- خالد بن ولید ۸ یا ۷ ھ میں پیغمبر کے رحلت سے تین برس پہلے مسلمان ہوئے، پیغمبر نے اسی وقت سے انہیں باہر بھیجنا شروع کردیا۔ بنی حرث بن کعب کی طرف گئے ہمدان واکیدر کی طرف گئے بنی جذیمہ اور عمرو بن معد یکرب کے مقابلہ کو گئے۔ انہیں کہاں سے کتابت کی فرصت اور موقع نصیب ہوا کہ کاتبان پیغمبر میں شمار کئے جائیں۔[۲]

۳- حضرت ابوبکر وعمر کو بھی لوگوں نے کاتبان پیغمبر میں شمار کیا ہے حالانکہ کسی کتاب میں بھی ان کا لکھا ہوا ایک خط بھی موجود نہیں جرجی زیدان مسیحی مورخ کا کہنا تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر لکھنا جانتے ہی نہ تھے، چنانچہ شروع زمانہ اسلام میں مکہ کے جو مسلمان کتابت سے واقف تھے ان کی فہرست سے حضرت ابوبکر کا نام غائب ہے۔

۴- حضرت عثمان کو بھی کاتبان رسول میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ تاریخ کامل اسد الغابہ میں بسلسلہ حالات ابی ابن کعب ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا گیا ہے جنہوں نے کبھی کبھار یہ خدمت انجام دی۔[۳]

۵- مغیرہ بن شعبہ کو بھی کاتبان رسول میں شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ جنگ خندق کے سال مسلمان ہوئے اور شاید ہی ایک دو مرتبہ کتابت کی خدمت ان سے لی گئی ہو۔[۴]

۶- سب سے بڑھ کر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان کو بھی لوگوں نے کاتبان رسول میں شمار کیا ہے بلکہ ان لوگوں میں گنا ہے جو ہر وقت پیغمبر کی خدمت میں کتابت کے لئے حاضر وموجود رہتے علامہ حلبی سیرت میں لکھتے ہیں: ''بعض لوگوں کا بیان ہے کہ معاویہ اور زید بن ثابت

۱- دیکھئے تاریخ کامل، ج ۲، ص ۱۸۷ اسد الغابہ سیرت زینی دحلان بر حاشیہ سیرت حلبیہ، ج ۳، ص ۷۵ طبقات کبریٰ، ج ۱، ص ۲۶۲ اصابہ شرح ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۱۱۲ ۲- اصابہ، ج ۱، ص ۴۱۳ تاریخ کامل، ج ۲، ص ۸۷ اسد الغابہ، ج ۳، ص ۹۳ علامہ ابن اثیر نے ان لوگوں کا رد بھی کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خالد غزوہ حدیبیہ کے قبل مسلمان ہوئے تھے پھر ان کے اعمال قبیحہ وافعال شنیعہ بھی ذکر کئے ہیں۔

۳- تاریخ کامل، ج ۲، ص ۱۱۹ ۴- اسد الغابہ، ج ۳، ص ۴۰۶ اصابہ، ج ۴، ص ۴۵۲ ۵- سیرت حلبیہ، ج ۳، ص ۳۶۴

ان لوگوں میں سے تھے جو پیغمبر کی خدمت میں کتابت کا کام کرنے کے لئے ہر وقت حاضر رہتے وہ وحی بھی لکھتے اور دیگر خطوط و فرامین وغیرہ بھی ان دونوں کا سوا لکھنے کے اور کوئی کام ہی نہ تھا''۔

حالانکہ یہ معاویہ فتح مکہ کے سال مسلمان ہوئے یہ اور ان کے باپ ابوسفیان مولفۃ القلوب میں سے تھے انہوں نے اگر کتابت کی خدمت انجام بھی دی تو صرف چند مہینے، اور یہ صرف کچھ خطوط لکھا کرتے تھے ایک دن ٹال مٹول کی اور کھانا کھانے کا بہانہ کیا پیغمبر خدا نے فرمایا خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے۔[1] لوگوں نے ان کو بھی کاتبان رسول میں قرار دیا بلکہ ڈھنڈورے پیٹے گئے کہ یہ کاتبان وحی میں سے تھے اور ہر وقت پیغمبر کی خدمت میں کتابت کے لئے موجود رہتے۔

واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے سال ابوسفیان کی منت سماجت اور عباس عم پیغمبر کی سفارش پر پیغمبر خدا نے معاویہ سے کچھ خطوط وغیرہ لکھنے کا کام لیا اور انہوں نے شاید ہی دو چار مہینے خطوط لکھے ہوں۔ لیکن جب امیر المومنین کی شہادت کے بعد مملکت اسلامیہ کے بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھے تو ان کے وظیفہ خواروں اور خریدے ہوئے لوگوں نے انہیں آسمان پر چڑھا دیا اور کاتبان وحی قرار دینے لگے اتنا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اور تمام کاتبان رسول پردے میں چلے گئے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا لے دے کے بس ایک معاویہ تھے جن کا چرچا ہر زبان پر تھا یہی کاتب خطوط و فرامین تھے یہی کاتب وحی تھے اور یہی ہر وقت پیغمبر کی خدمت میں کتابت کی خدمت انجام دینے کے لئے موجود رہتے کہ نہ معلوم پیغمبر کو کس وقت کیا لکھوانے کی ضرورت پیش آجائے علامہ ابن اثیر نے تو کمال یہ کیا ہے کہ حضرت علی کو صرف معاہدے اور صلحنامے لکھنے والا قرار دیا ہے آپ کے کاتب وحی ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام مکہ میں دس برس تک وحی لکھا کئے اس وقت نہ تو ابی ابن کعب تھے، نہ محمد بن مسلمہ تھے، نہ زید بن ثابت، نہ معاویہ، نہ عمرو عاص، نہ مغیرہ، نہ عبد اللہ بن ارقم، نہ ثابت بن قیس نہ ان جیسے دوسرے لوگ۔

علامہ ابن عبد ربہ عقد فرید میں بسلسلہ فن کتابت تحریر کرتے ہیں:

''اس فن کے ماہرین میں سے علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں آپ کو جو فضل و شرف اور رسول اللہ سے قرابت حاصل تھی وہ ظاہر ہے آپ وحی کی کتابت کرتے، پھر اس کتابت کے بعد آپ تک خلافت بھی پہنچی عثمان بن عفان بھی وحی لکھتے جب علی اور عثمان نہ ہوتے تو ابی بن کعب اور زید بن

۱۔ اسد الغابہ، ج ۴، ص ۳۸۶ نصائح کافیہ علامہ ابن عقیل وغیرہ

ثابت لکھتے اگر ان میں سے بھی کوئی نہ ہوتا تو کوئی اور لکھتا''۔[۱]

علامہ بن عبد ربہ نے صراحت کردی کہ کاتب وحی صرف دو شخص تھے علی ابن ابی طالب اور عثمان بن عفان جب یہ دونوں موجود نہ ہوتے تب ابی بن کعب وغیرہ یہ خدمت انجام دیتے اسی سے آپ دوسرے اشخاص کے متعلق اندازہ لگاسکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کے مرنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ کی طرف نت نئی جھوٹی باتیں کثرت سے منسوب کی جانے لگیں جیسا کہ خود پیغمبر پیشین گوئی بھی فرما گئے تھے ستکثر علی القالة میرے متعلق باتیں بنانے والے عنقریب کثرت سے ہوجائیں گے۔ یا ستکثر علی الکذابة مجھ پر جھوٹ باندھنے والے عنقریب بہت سے ہوجائیں گے۔[۲]

ہوا بھی ایسا ہی کہ پیغمبر کی آنکھ بند ہوتے ہی کذب و افتراء کی بہتات ہوگئی۔ ہر شخص اپنے بارے میں اپنے اپنے قبیلہ کے بارے میں اپنے حکام کے بارے میں فضیلت و بزرگی کا مدعی ہوا۔ کسی نے اپنے متعلق دعویٰ کیا کہ پیغمبر نے مجھے مال خراج جمع کرنے پر مقرر کیا تھا کسی نے کاتب رسول ہونے کا دعویٰ کیا اور اسی قسم کے بہت سے دعوے۔ کچھ لوگوں نے تو اپنے بزرگوں کی طرف ایسی ایسی فضیلتیں بھی منسوب کیں جن کا خود ان بزرگوں نے کبھی دعویٰ بھی نہ کیا بلکہ شاید ان کے ذہن میں خطور نہ ہوا ہوگا۔ جیسے حضرت ابوبکر و عمر کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ یہ بھی کاتبان رسول میں سے تھے۔ حالانکہ ان دونوں حضرات نے اپنی زندگی بھر اس کا دعویٰ نہیں کیا یہ تو ان کی محبت میں حد سے زیادہ گذرے ہوئے لوگوں کا طبع زاد ہے۔

حضرت ابوبکر و عمر و عثمان اور بعض دوسرے افراد جیسے مغیرہ بن شعبہ، زید بن ثابت، خالد بن ولید اور انہیں جیسے دوسرے لوگوں کے کاتبان رسول ہونے کو سب سے زیادہ جو چیز مشکوک بناتی ہے وہ یہ ہے کہ امیر المومنین کی شہادت اور معاویہ کے تسلط و اقتدار قائم ہوجانے پر مسلمانوں نے خلفائے ثلاثہ کی افضلیت کے اعتقاد کو دین و ایمان کا اصل اصول بنالیا تاکہ حضرت علی اور ان کی اولاد جو حقیقی وارثان نبوت و امامت تھے پس پردہ ہوجائیں۔ اور عوام کی نظریں ان پر نہ پڑیں معاویہ ہی کے زمانہ سے اس عقیدے کی ابتدا ہوئی کہ خلفائے ثلاثہ حضرت علی سے افضل تھے۔ اور رفتہ رفتہ یہ عقیدہ بنیادی عقیدہ بن گیا۔ روایتیں گڑھنے والوں نے اس عقیدہ کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے خلفائے ثلاثہ کے

۱- عقد فرید، ج ۳، ص ۵ ۲- کنز العمال، ج ۵، ص ۲۳۹، مستدرک، ج ۱، ۱۰۳ مقدمہ صحیح مسلم وغیرہ

فضائل و مناقب میں خوب خوب حدیثیں ایک سے بڑھ کر ایک امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبد اللہ بن احمد کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد بزرگوار سے حضرت علی اور معاویہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا یہ سمجھ لو کہ علیؑ کے دشمن بہت زیادہ تھے ان بے شمار دشمنوں نے بہت سر مارا کہ علیؑ کا کوئی عیب مل جائے مگر ان کی ذات بالکل بے داغ نظر آئی چار و ناچار وہ ایک ایسے شخص کی طرف جھک پڑے جو علیؑ سے برسر پیکار رہا تھا۔ ان لوگوں نے از راہ مکر و فریب اس شخص کی مدح و ثنا میں مبالغہ کی انتہا کر دی۔

شاہان وقت کے نام

ذی قعدہ ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ سے فارغ ہوکر رسول خدا شاداں و فرحاں مدینہ واپس آ گئے کیونکہ یہ صلح درحقیقت پیغمبر کی شاندار کامیابی اور بہت بڑا معرکہ تھی اسی صلح کے بعد لوگ جوق جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ کچھ دور رس نظریں رکھنے والے تو پیغمبر کی طرح ہشاش و بشاش تھے کچھ غضبناک و اندوہگین لیکن اپنا غم و غصہ چھپائے ہوئے انہیں ہمت نہ تھی کہ پیغمبر کی مخالفت کرسکیں چاہے پیغمبر کے رعب و جلال سے مرعوب ہوکر یا از راہ طمع یا اپنی بے بسی کے احساس کی بناء پر پیغمبر نے اندازہ کیا کہ یہی وہ وقت رسالت کی ہمہ گیر تبلیغ اور عرب و عجم، کالے گورے اقوام کو اسلام کی طرف بلانے کے لئے مناسب وقت ہے، تاکہ حجت تمام اور خلائق پر خدا کی رحمت مکمل ہو۔

اسی وقت آپ نے شان عرب و عجم روساء قبائل، عیسائی پادریوں، مجوسی پیشواؤں اور گورنران و حکام وغیرہ کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں خدا کی وحدانیت اور اسلام کی طرف دعوت دی تھی آپ نے روم و فارس و حبشہ اور قبطہ کے بادشاہوں سے ابتدا کی اور ایک دن میں چھ خطوط لکھ کر چھ قاصدوں کے ہمراہ روانہ کئے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں:

''پیغمبر نے شاہان وقت کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام کی طرف دعوت دی تھی ایک دن میں چھ شخص ان خطوط کو لے کر روانہ ہوئے یہ واقعہ ماہ محرم ۷ ہجری کا ہے ان میں سے ہر شخص اس ملک کی زبان سے واقف تھا جہاں اسے بھیجا گیا تھا''۔[1]

۱۔ طبقات سعد، ج ۱، ص ۸۵۲

خطوط کی تاریخ

اس امر میں مورخین کے درمیان شدید اختلاف ہے کہ وہ قاصد ۶ ہجری میں روانہ ہوئے یا ۷ ہجری میں یا یہ واقعہ صلح حدیبیہ اور آپ کے انتقال کے درمیانی عرصہ کا ہے۔

واقدی کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ۶ ہجری کا ہے اور مسعودی نے بھی اس بیان کی تائید کی ہے۔[۱]

بعض روایات[۲] میں مذکور ہے کہ یہ واقعہ ۷ ہجری کا ہے طبری نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے غزوہ حدیبیہ کے بعد اور اپنے انتقال سے پہلے کی درمیانی مدت میں کچھ اصحاب کو مختلف سمت دعوت اسلام کے لئے روانہ کیا۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کا ہے۔ ابن ہشام نے سنہ کی تعیین نہیں کی۔[۳]

ابن حجر نے اصابہ میں بسلسلہ حالات دحیہ بن خلیفہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۶ ہجری کے آخر یا ۷ ہجری کے شروع کا ہے۔

غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ رسالت مآب نے صلح حدیبیہ کے بعد شاہان وقت اور رؤسا قبائل وغیرہ کو لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آپ کی رحلت تک جاری رہا خطوط بھیجنے کی ابتدا صلح حدیبیہ سے واپسی کے بعد ہی ہوئی۔ ۶ ہجری کے آخر یا ۷ ہجری کے شروع میں چونکہ ۶ھ کے آخر اور ۷ ھ کے شروع میں زیادہ فاصلہ نہیں اس لئے مورخین صحیح طور پر تعیین نہ کر سکے۔

قاصدوں کو نصیحت

بہر حال ۶ ہجری کے آخر میں روانگی خطوط ہوئی ہو یا ۷ھ کے شروع میں پیغمبر خدا نے ایک دن اپنے اصحاب سے کہا کہ کل تم اکٹھا ہو کر علی الصباح میرے پاس آؤ دوسرے دن نماز صبح سے فارغ ہو کر پیغمبر مصلی پر بیٹھے ہوئے مختصر تسبیحات اور دعاؤں میں مشغول رہے پھر اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں سے چند افراد کو اپنا قاصد بنا کر بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کی طرف روانہ کیا اور ارشاد فرمایا:

''بندگان خدا کے بارے میں خدا کا خیال رکھنا کیونکہ جس شخص کے سپرد لوگوں کے کچھ امور ہوں اور وہ شخص ان لوگوں کی خیرخواہی نہ کرے تو خداوند عالم اس پر جنت حرام قرار دے گا جاؤ اور ایسا نہ

۱- تاریخ کامل، ج ۲، ص ۸۰؛ مروج الذہب، ج ۲، ص ۲۹۶

۲- کتاب التنبیہ والاشراف ص ۲۵۵؛ ابوالفدا، ج ۱، ص ۱۴۸؛ طبقات ابن سعد

۳- سیرۃ ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۷۸

کرنا جیسا حضرت عیسیٰ کے قاصدوں نے کیا تھا۔

لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ حضرت عیسیٰ کے قاصدوں نے کیا تھا آنحضرت نے ارشاد فرمایا: حضرت عیسیٰ نے اپنے قاصدوں کو اسی امر کی دعوت دی تھی۔ جس امر کے لئے میں نے تم لوگوں کو دعوت دی ہے تو جن لوگوں کو حضرت عیسیٰ نے نزدیک و پاس روانہ کیا تھا وہ تو راضی رہے اور انہوں نے حکم کو تسلیم کیا اور جن لوگوں کو دور دراز بھیجا گیا تھا انہیں شاق گذرا اور انہوں نے سستی کی۔ حضرت عیسیٰ نے اس کی شکایت بارگاہ احدیت میں کی دوسرے دن سستی کرنے والوں بلکہ تمام قاصدوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ وہ اس قوم کی زبان بولنے لگے۔ جس قوم کی طرف بھیجے گئے تھے''۔[1]

طبقات ابن سعد وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا کے قاصدوں کی بھی کیفیت ویسی ہی ہوگئی ان میں کا ہر شخص اس قوم کی زبان بولنے پر قادر ہوگیا جس قوم کی طرف اسے بھیجا گیا تھا۔

مہر کا استعمال

جب پیغمبر نے خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کیا حضور یہ بادشاہ اور رؤساء قبائل اس وقت تک کوئی خط پڑھتے ہی نہیں جب تک اس پر مہر نہ ہو اسی دن پیغمبر نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں تین سطروں میں محمد رسول اللہ نقش تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تینوں سطریں نیچے سے اوپر کی طرف پڑھی جاتی تھیں سب سے نیچے کی سطر میں محمدؐ اس کے اوپر رسول اس کے اوپر اللہ اسی مہر سے آپ نے خطوں کو مزین کیا غالباً خط بند کرنے کے بعد کوئی نم چیز مٹی وغیرہ جیسی رکھ کر مہر کردی جاتی تھی بغیر اس مہر کو توڑے اس خط کا پڑھنا ممکن نہ ہوتا ایسا اس لئے کیا جاتا تھا تاکہ مکتوب الیہ کے علاوہ دوسرا کوئی شخص مضمون خط سے واقف نہ ہو۔

چنانچہ ایک ہی دن میں آپ نے روم و فارس کے شہنشاہوں حبشہ و قبط کے بادشاہوں حارث بن ابی شعر غسانی بادشاہ شام اور ہوذۃ بن علی بادشاہ یمامہ کو خطوط لکھے۔

ان تمام خطوط کا مفہوم ایک تھا اگرچہ الفاظ مختلف رہے ہوں کیونکہ سبھی خطوط کا واحد مقصود توحید اور اسلام تھا اور لب لباب خداوند عالم کا یہ ارشاد: یا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم الا نعبد الا الله و لانشرك به شيئاً و لا يتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون الله

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۴، ص ۲۷۸، ۲۷۹، شرح شفا ملا علی قاری، ج ۱، ص ۲۴۱، طبقات کبریٰ، ج ۱، سیرت حلبیہ ج ۳، ص ۲۷۲، سیرۃ زینی دحلان، ج ۳، ص ۵۷، کنز العمال، ج ۵، ص ۳۲۶ تا ۳۲۷

فان تولوا فقولوا اشهدوا۔

نیز ان خطوط کے مفہوم میں اور آپ کی اس آواز کے مفہوم میں جو آپ نے اعلان رسالت کے دن بلند کی تھی قولوا لا اله الا الله تفلحوا کوئی فرق نہیں یہی وجہ ہے کہ آپ ان خطوط میں نہ تو جنگ کا کوئی اشارہ پائیں گے نہ جزیہ کا کوئی ذکر، پیغمبر کا اصل مقصد اقوام وملل کے شعور کو بیدار کرنا اور حق اور حقیقت کی طرف انہیں متوجہ کرنا تھا تاکہ کسی کو کہنے سننے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

پیغمبر کی اس آواز کا مقصد تمام انسانوں کو ایک معبود حقیقی کی طرف مدعو کرنا تھا جس کی حقیقت ہر انسان کی فطرت میں رائج ہے یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں کے دل سالم اور شعور بیدار تھے انہوں نے فوراً لبیک کہی ۔ بڑے بڑے بادشاہوں نے اس آواز کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ قیصر ہو یا نجاشی یا مقوقس یا دوسرے بڑے اشخاص دو ایک کو چھوڑ کر سبھی نے یا تو اسلام قبول کیا یا جواب میں معذرت لکھ بھیجی۔ اپنی حکومت وسلطنت کی طمع میں وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

آپ پیغمبر کی اس آواز کو یاد کیجئے جو آپ نے مجمع قریش میں بلند کی تھی قولوا لا اله الا الله تفلحوا اور کچھ دن گذرنے کے بعد پھر اسی آواز کو سنئے جس میں آپ نے شاہان دنیا کو خداوند تعالی کی طرف دعوت دی ہے تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم آپ دیکھیں گے کہ پہلی آواز مکہ کے پہاڑوں سے بلند ہوکر کانوں سے ٹکرائی تھی تو یہ دوسری آواز شاہان عرب وعجم کے محلوں سے ٹکرائی اور پہلی آواز نے مکہ میں ایک ہیجان اور روحانی انقلاب پیدا کردیا تھا۔ جس کے ساتھ ظاہری و مادی انقلاب بھی لپٹا ہوا تھا اور ۷ھ کی آواز نے عرب وعجم کے زندہ شعور کو بیدار کیا۔ وہ فوراً ہی اس آواز کے آگے جھکنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے لبیک کہی اور دوسروں نے صلح کرلینا مناسب سمجھا عزت واحترام سے بھرے ہوئے خطوط جواب میں لکھے تحفہ تحائف بھیجے اور اپنی مجبوریاں ظاہر کیں۔

قیصر کے پاس جب خط پہونچا اور اس کے بھائی نے اس خط کو پھینک دینے کا مشورہ دیا تو قیصر نے کہا:

''کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ میں ایسے شخص کا مکتوب پھینک دوں گا جس کے پاس ناموس اکبر آیا ہے''۔

ابوسفیان سے کہا تم محمد کو جیسا بتا رہے ہو اگر واقعاً وہ ویسے ہی ہیں تو بے شک وہ نبی ہیں ان کا اقتدار قائم ہوکر رہے گا اور وہ ہماری زمین تک قابض ہوجائیں گے۔ روم کا بڑا پادری آنحضرت کا خط پڑھنے کے بعد کلیسا میں آیا لوگوں کا ہجوم تھا اس نے کہا: ''اے روم والو! ہمارے پاس احمد کا

نوشتہ آیا ہے وہ ہمیں خداوند عالم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خداوند عالم وحدہ لاشریک ہے اور احمد رسول خدا ہیں''۔

مقوقس نے آپ کا خط پڑھ کر کہا: ''میں نے اس نبی کے متعلق غور کیا میں نے دیکھا کہ وہ ایسے کام کا حکم نہیں دیتے جسے لوگ پسند کرتے ہیں اور ایسے کام سے روکتے نہیں جسے لوگ مرغوب سمجھتے ہیں میں نے انہیں نہ تو گمراہ جادوگر پایا اور نہ جھوٹا کاہن''۔

قیصر کی طرف سے عمان (شام کے ایک شہر) کے گورنر فروہ نے حضرت کو اپنے اسلام قبول کرنے کی اطلاع دی جب شاہنشاہ روم کو اس کی خبر ملی تو اس نے گرفتار کرلیا اور اس سے توبہ کرائی فروہ نے توبہ کرنے سے انکار کیا شاہ روم نے اسے قتل کردیا۔

ہوذہ بن علی شاہ یمامہ نے لکھا: ''کتنی اچھی اور نفیس بات کی طرف آپ نے دعوت دی ہے''۔

جیفر اور عبد فرزان جلندی بادشاہ عمان نے قبولیت اسلام کی خبر پیغمبر کو دی۔

منذر بن ساوی شاہ بحرین نے بھی اسلام قبول کیا اور اس کا اسلام پسندیدہ ہوا۔

شاہان حمیر اور نجران کے پادریوں نے بھی اسلام قبول کیا شاہ ایران کے گورنر بحرین و یمن حضرت کے رئیس ایلہ اور یہود کے بادشاہوں میں سے بعض نے اسلام قبول کیا بعض نے جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔

نجاشی نے اپنے ایمان لانے کی خبر دی اسی طرح اور بھی بہتوں نے پیغمبر کی دعوت اسلام قبول کی اور حق کے سامنے اپنا سر جھکایا۔

کتنی اثر انگیز یہ صدا تھی اور کتنا شیریں یہ کلام تھا اور کتنے پاکیزہ وہ خطوط تھے جن میں توحید کا کلمہ اور حق کی طرف دعوت دی گئی۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام، پیغمبر کی توصیف میں فرماتے ہیں:

آپ نے نصیحت و خیرخواہی کی حد کردی سیدھے راستے پر گامزن رہے حکمت اور موعظہ حسنہ کی طرف دعوت دی۔

آپ کی طرف نیکوکاروں کے دل مڑ گئے۔ نگاہیں اٹھ گئیں۔ آپ کی وجہ سے کینے دفن ہوئے عداوتیں مٹ گئیں اور بھائیوں جیسی محبت پیدا ہوگئی۔

پیغمبر عظیم الشان کی سیرت و شخصیت
قرآن، نہج البلاغہ اور مغربی مفکرین کی نظر میں

پروفیسر شاہ محمد وسیم

پیغمبر عظیم الشان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اقدس، ان کے اوصاف، اور اوج کمالات و تعلیمات کے بارے میں دنیا کے نامور مصنفین اور مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے، اور اب تک لکھا جا رہا ہے۔ جس نے بھی انہیں، بشرط حق و انصاف، سمجھا اور ان کی رہبری اور تعلیمات کے سرچشمۂ ہدایت سے فیضیاب ہونا چاہا اسے گوہر مراد مل گیا۔ خاتم المرسلین کے معنی و مطالب اس بات کے متقاضی ہیں کہ رشد و ہدایت، رہبری و تعلیمات اور نمونہ ہائے عمل ایسے ہوں کہ ہر دور کا انسان اور ہر ہر دور کے تقاضوں کا احاطہ کئے ہوئے ہوں۔

آیئے! دیکھیں حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرم کی ذات اقدس کی توصیف کس طرح بیان فرمائی ہے:

خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اقدس کے بارے میں حضرت علیؑ نے فرمایا کہ: ''آپ کو اللہ نے اس وقت بھیجا کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ رکا ہوا تھا اور ساری امتیں مدت سے پڑی سو رہی تھیں اور فتنے سر اٹھا رہے تھے اور سب چیزوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور دنیا بے رنگ و نور تھی۔ اس کی فریب کاریاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس وقت اس کے پتوں میں زردی دوڑی ہوئی تھی اور پھلوں سے نا امیدی تھی۔ پانی زمین میں تہہ نشین ہو چکا تھا۔ ہدایت کے مینار مٹ چکے تھے۔ ہلاکت و گمراہی کے پرچم کھلے ہوئے تھے اور دنیا والوں کے سامنے کڑے تیوروں سے اور تیوری چڑھائے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ اس کا پھل فتنہ تھا اور اس کی غذا مردار تھی۔ اندر کا لباس خوف و ہراس اور باہر کا پہناوا تلوار تھی.....''۔[1]

یہ وہ وقت تھا: ''جب لوگ حیرت و پریشانی کے عالم میں گم کردہ راہ تھے اور فتنوں میں ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ نفسانی خواہشوں نے انہیں بھٹکا دیا تھا اور غرور نے بہکا دیا تھا۔ اور بھرپور جاہلیت نے

۱- نہج البلاغہ، خطبات ۷-۸، مرتبہ سید انصار حسین، احباب پبلشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۱

ان کی عقلیں کھوئی تھیں اور حالات کے ڈانواں ڈول ہونے اور جہالت کی بلاؤں کی وجہ سے حیران و پریشان تھے......''۔[۱]

اللہ نے آپ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ''روشنی کے ساتھ بھیجا اور انتخاب کی منزل میں سب سے آگے رکھا تو ان کے ذریعہ سے تمام پراگندگیوں اور پریشانیوں کو دور کیا اور غلبہ پانے والوں پر تسلط جمالیا۔ مشکلوں کو سہل اور دشواریوں کو آسان بنایا۔ یہاں تک کہ دائیں بائیں افراط و تفریط کی سمتوں سے گمراہی کو دور ہٹایا''۔[۲]

''...... دنیا اپنی لذتوں میں اس وقت تمہارے لئے شیریں و خوشگوار ہوئی اور اس وقت تم اس کے تھنوں سے دودھ پینے پر قادر ہوئے جب کہ اس سے پہلے اس کی مہاریں جھول رہی تھیں اور اس کا تنگ ہل رہا تھا یعنی اس کا کوئی سوار اور دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا جو اس کی باگیں اٹھاتا اور اس کا تنگ کستا......''۔[۳]

مائیکل ایچ ہارٹ Michael H. Hart جو ایک امریکی مصنف ہیں اور محتاج تعارف نہیں ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''دنیا کے مؤثر ترین افراد میں محمدؐ کو سرفہرست رکھنے میں میرے انتخاب سے بعض قارئین کو تعجب ہوسکتا ہے اور بعض اس انتخاب پر سوال اٹھاسکتے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں محمدؐ وہ فرد واحد ہیں جو مذہبی اور غیر جانبدارانہ Secular دونوں سطح پر نہایت ہی کامیاب تھے''۔[۴]

جان ڈیونپورٹ John Devenport رقمطراز ہیں کہ: ''درحقیقت اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ تمام جانے مانے قانون ساز افراد اور فاتحین میں سے کسی ایک کا بھی نام سوائے محمدؐ کے نہیں لیا جاسکتا ہے، جس کی سوانح حیات زیادہ معتبر طور پر اور تمام تر تفصیلات کے ساتھ لکھی گئی ہے''۔

مندرجہ بالا باتوں پر صدق دل سے غور و فکر کریں تو خود بخود گلہائے عقیدت نچھاور کرنے کا دل چاہے گا، مگر حق سے منہ موڑنے اور مغایرت برتنے کی بات اور ہے، کیونکہ یہ وہ عمل ہے کہ جو انسان کو راہ صدق و صفا سے جدا کردیتا ہے اور واضح دلیل سے اسے بے بہرہ کردیتا ہے۔ لہذا تعجب نہیں تو اور کس بات کا اظہار کیا جائے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عظیم المرتبت ذات اعلیٰ کے لئے اگر

۱- نہج البلاغہ، خطبہ ۹۳، مرتبہ سید انصار حسین، احباب پبلشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۳۲۲ ۲- ایضاً، خطبہ ۲۱۱، ص ۴۵۸

۳- ایضاً، خطبہ ۱۰۳، ص ۳۴۹

4- The 100: A Ranking of the Most Influential Persons In History, New York, U.S.A., 1978, p. 33

کوئی یہ سوال کرے کہ اس محمدؐ نے دنیا کو نیا کیا دیا؟[1]

ذیل میں اسی سوال کے جواب میں مختصراً عرض کیا جائے گا:

۱- انجیل میں موجود ہے کہ: ''مگر میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں، تمہارے لئے یہ مفید ہے کہ میں چلا جاؤں کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ طرفدار تمہارے پاس نہ آئے گا.....''[2] اور یہ کہ'' جب وہ حق کی جان آ جائے گا تو وہ تمہیں کل سچ کی تعلیم دے گا، کیونکہ وہ خود اپنے اختیار سے نہ بولے گا، بلکہ جو کچھ سنے گا، وہ بولے گا، اور وہ چیزیں جو ہونے والی ہیں، وہ ان کا اعلان کرے گا''۔[3]

انجیل کی مندرجہ بالا آیات پر غور وفکر کریں تو حق پسند کہہ اٹھیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان الفاظ کو معنی و مطالب عطا کرتا ہوا کون آیا اور وہ بھی اس طرح کہ قرآن نے اسے یہ کہہ کر پکوایا کہ:

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى وہ تو اپنی خواہش نفسانی سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔

۲- عفت و پاکدامنی جناب مریم(س) کا ذکر کریں تو انجیل نے گواہی دی ہے کہ جناب مریم(س) باکرہ Virgin Mary عفت مآب، نیک اور پاکدامن تھیں۔ مگر قرآن نے بات آگے بڑھائی۔ غور طلب ہے کہ اگر قرآن انجیل کا چربہ ہوتا تو اسے وہی سب اور اسی طرح کہہ کر خاموش ہوجانا چاہئے تھا، جس طرح انجیل میں کہا گیا ہے اور بات کو سچ اور حق کی رو سے آگے نہیں بڑھانا چاہئے تھا مگر چونکہ قرآن خدا کی آخری اور مکمل مقدس دینی کتاب ہے اس لئے پیغام و تعلیمات کو تو مکمل ہونا ہی تھا۔ لہذا اس ضمن میں بھی مسئلہ کو واضح طور سے بیان کرکے عفت جناب مریم(س) کی گواہی قرآن نے اس طرح دی کہ جب وہ اس بچہ کو اپنی گود میں لئے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا کہ اے مریم! تم نے تو یقیناً بہت برا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ ہی برا آدمی تھا، نہ تیری ماں ہی بدکار تھی، تو پھر قرآن نے بیان کیا کہ:

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ۔ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا. قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا.[4]

۱- جیسا کہ کچھ عرصہ قبل پوپ بینڈکٹ Pope Benedict نے بھی کسی دوسرے کے حوالہ سے اپنے انداز میں کہا تھا۔

2- St. John, Old Testament in the Douny Challoner, London, 1951, Chapter 16, Verse 7

3- Ibid, Chapter 16, Verse 13

۴- سورہ مریم، آیات ۲۹-۳۰

تو مریم(س) نے اس بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ جو پوچھنا ہو اس سے پوچھ لو تو وہ لوگ بولے بھلا ہم گود کے بچہ سے کیوں کر بات کریں اس پر وہ بچہ قدرت خدا سے بولا: میں بے شک خدا کا بندہ ہوں، مجھے اسی نے کتاب انجیل عطا فرمائی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے۔

اس طرح قرآن نے انجیل کے بیان کو مکمل اور واضح طور سے بیان کر کے عصمت و طہارت جناب مریم(س) کی گواہی دی۔ اور اس طرح دنیائے انسانیت، عیسائیت سمیت، کے لئے محمدؐ کے وسیلہ سے مدلل انداز میں اپنا پیغام پہونچایا۔ لہذا حضرت عیسیٰ اور ان کی مادر گرامی کی عصمت کی گواہی کو قرآن نے آنحضرتؐ کے وسیلہ سے عام کیا۔

۳۔ جب مغرب ان تصورت میں ڈوبا ہوا تھا کہ خدا کا حق خدا کو اور بادشاہ کا حق بادشاہ کو دے دو، تو اس کی رو سے سلاطین کج کلاہ ہر چیز کے مالک بن بیٹھے، تسلط بے جا قائم کرنے اور استحصال سے بھی نہ گھبرائے۔ ایسے میں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آواز قولوا لا اله الا الله ان تفلحوا کہو کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے، تاکہ فلاح پاؤ نے خدا کی بندگی کا مژدہ سنایا۔ اس آواز نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا، کمزوروں اور مجبوروں کو پیغام حیات ملا۔ حریت ضمیر انسانی کا پیغام عام ہوا، کچلے ہوئے اور بے سہارا لوگوں نے ہمت سے کام لیا اور ان میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی۔ اب حاکم بھی پابند اصول و ضوابط اور جواب دہ نظر آنے لگے کہ پیغمبر اسلامؐ نے آیات قرآنی کی روشنی میں حاکم اور محکوم دونوں کو مسئولیت کے ساتھ خدا کے حضور لا کھڑا کیا۔ اب حاکم اور رعایا دونوں کو پابند حکم الٰہی رہ کر جواب دہ ہونا ہے کہ قرآن کا اعلان ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ اور حکام اور فیصلہ کرنے والوں کو یہ کہہ کر ذمہ دار قرار دیا گیا ہے کہ:

اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ انسانوں میں وحدت و باہمت کو پیغمبر اسلام نے یہ کہہ کر جاری و ساری کیا کہ الناس کاسنان المشط لوگ مثل کنگھی کے دانتوں کے ہیں

۴۔ اب ہم ان حقائق علمی اور سائنسی نکات پر غور کر سکتے ہیں، جنہیں آنحضرتؐ نے قرآن کی زبان میں اور خود اپنی حدیثوں میں بیان فرمایا ہے اور جن کی رو سے دنیا کو نئے رموز و حقائق سے آگاہ کیا ہے، چاہے زمانہ ان تک اب پہونچ گیا ہو یا کہ آئندہ پہونچ پائے۔

الف: مارس بکیل Maurice Buckaille کی مشہور زمانہ کتاب Bible,Science and Qur'an انجیل سائنس اور قرآن ہے، جس میں اس فرانسیسی عالم نے اپنی سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ بتایا ہے

کہ نطفہ کے قرار پانے اور اس کی نشو ونما او رتولید کے بارے میں جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے وہ سچ ہے اور جو کچھ موجودہ انجیل میں بیان ہوا ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔

مارس بکیل کے علاوہ پروفیسر کیتھ ایل مور Prof. Keith L. Moore نے جو کناڈا میں ٹورنٹو یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور جن کا شمار علم تشریح اور جنین شناسی کی سرزمین میں دنیا کے مانے جانے سائنسدانوں میں ہوتا ہے، ان کی کتاب The Developing Human کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں دمام، سعودی عربیہ میں ساتویں میڈیکل کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ:

''میرے لئے یہ نہایت ہی خوشی کی بات ہے کہ میں نے قرآن میں دیئے گئے، انسان کے نشو ونما کے بیان کی وضاحت کی۔ جس کی وجہ سے مجھ پر یہ آشکار ہوا ہے کہ یہ تفصیلات محمدؐ پر خدا نے نازل فرمائی ہیں، کیونکہ یہ سب علمی معلومات متعدد صدیوں پہلے تک منکشف نہ ہوسکی تھیں۔ اس نے مجھ پر ثابت کیا کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں''۔[۱]

ب: اسی طرح ڈاکٹر جولیہ سمپسن Dr. Joe Leigh Simpson نے، جن کا تعلق بیلر کالج آف میڈیسن، ہوسٹن، ٹیکساس، Baylor College of Medicine, Houston, Texas امریکہ سے ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مندرجہ ذیل دو حدیثوں کا مطالعہ کیا:

۱) تم میں سے ہر ایک میں تمہاری خلقت کے سبھی اجزاء کو ایک ساتھ تمہاری ماں کے رحم میں چالیس دنوں میں یکجا کردیا جاتا ہے''۔[۲]

۲) اگر جنین Embrayo پر بیالیس راتیں گذر جاتی ہیں، تو اللہ اس پر ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کو ہیئت دیتا ہے اور اس کی سماعت، بینائی، جلد، گوشت اور ہڈیوں کو بناتا ہے.....''۔[۳]

ڈاکٹر سمپسن Dr. Simposon کا کہنا ہے کہ'' اس طرح یہ دونوں حدیثیں پیغمبر کے اقوال جن کو مندرج کیا گیا ہے، ہمیں چالیس دن سے پہلے کا ایک مخصوص ٹائم ٹیبل جنین کے مخصوص نشو ونما کے لئے مہیا کراتی ہیں..... یہ حدیثیں ان سائنسی معلومات کی وجہ سے حاصل نہیں کی جاسکتی تھیں، جو اس وقت موجود تھیں''۔

1- www.Islam-guide.com

۲- صحیح مسلم، حدیث ۲۶۴۳، صحیح بخاری، حدیث ۳۲۰۸ ۳- صحیح مسلم، حدیث ۲۶۴۵

پ: موجودہ دور میں Theory of Plate Tetonics نے یہ ثابت کیا ہے کہ پہاڑ زمین کو استحکام بخشتے ہیں۔ یہ نظریہ ۱۹۶۰ کی دہائی میں دنیا کے سامنے عصر جدید کے سائنسدانوں کی کد و کاوش کے نتیجہ میں واضح طور سے سامنے آیا، اور وہ اسے سمجھنے لگے۔

اسی طرح تاریخ سائنس [History of Sciences] ہمیں بتاتی ہے کہ یہ نظریہ کہ پہاڑوں کی جڑیں بھی گہری ہوتی ہیں، ۱۸۶۵ء میں سرجارج ایری [Sir George Airy] نے داخل کیا تھا، جب کہ قرآن دنیا کو یہ پہلے ہی بتاچکا تھا اور آنحضرتؐ اس کا اعلان کر چکے تھے:

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاءُ بَنٰهَا. رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا. وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا. وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا. اَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَ هَا وَ مَرْعٰهَا. وَ الْجِبَالَ اَرْسٰهَا. مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ.[1]

بھلا تمہارا پیدا کرنا اشد تھا یا آسمان کا کہ اس نے اس کو بنایا، اس کی چھت کو خوب اونچا رکھا، پھر اسے درست کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور دن کو اس کی دھوپ نکالی۔ اور اس کے بعد زمین کو پھیلایا، اسی میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ دیا۔ یہ سب سامان تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدہ کے لئے ہے۔

اور یہ کہ وَ اَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ.....[2] اور اسی نے زمین میں بھاری بھاری پہاڑوں کو گاڑ دیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ زمین تمہیں لے کر جھک جائے!

زمین و آسمان، پہاڑ، چاند و سورج اور پانی کی خلقت کے بارے میں مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے:

''.....ابھی وہ آسمان دھوئیں ہی کے شکل میں تھے کہ اللہ نے انہیں پکارا تو فوراً ان کے تسموں کے رشتے آپس میں مل گئے۔ اس نے ان کے بند دروازوں کو بستہ ہونے کے بعد کھول دیا..... اس نے فلک کے سورج کو دن کی روشن نشانی اور چاند کو رات کی دھندلی نشانی قرار دیا ہے اور انہیں ان کی منزلوں پر چلایا ہے اور ان کی گزرگاہوں میں ان کی رفتار مقرر کردی ہے تاکہ ان کے ذریعہ سے شب و روز کی تمیز ہوسکے اور انہی کے اعتبار سے برسوں کی گنتی اور (دوسرے) حساب جانے جاسکیں۔ اور پھر یہ کہ اس نے آسمانی فضا میں اس فلک کو آویزاں کیا اور اس میں اس کی آرائش کے لئے متے متے

۱۔ قرآن، سورہ النازعات، آیات ۲۷-۳۳ ۲۔ قرآن، سورہ النحل، آیت ۱۵

موتیوں ایسے تارے اور چراغوں کی طرح چمکتے ہوئے ستارے آویزاں کیے......"۔۱

"اللہ نے زمین کو تہ و بالا ہونے والی مہیب لہروں اور بھرپور سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں کے اوپر پاٹا، جہاں موجیں موجوں سے ٹکرا کر تھپیڑے کھاتی تھیں اور لہریں لہروں کو ڈھکیل کر گونج اٹھتی تھیں...... چنانچہ اس متلاطم پانی کی طغیانیاں زمین کے بھاری بوجھ کے دباؤ سے فرو ہوگئیں...... اور زمین اس طوفان خیز پانی کے گہراؤ میں اپنا دامن پھیلا کر ٹھہر گئی اور...... جب اس کے کناروں کے نیچے پانی کی طغیانی کا زور و شور سکون پذیر ہوا، اور اس کے کاندھوں پر اونچے اونچے اور چوڑے چکلے پہاڑوں کا بوجھ لد گیا تو اللہ نے اس کی ناک کے بانسوں سے پانی کے چشمے جاری کردیئے جنہیں دور و دراز جنگلوں اور کھدے ہوئے گڑھوں میں پھیلا دیا۔ اور پتھروں کی مضبوط چٹانوں اور بلند چوٹیوں اور پتھریلے پہاڑوں سے اس کی حرکت میں اعتدال پیدا کیا۔ چنانچہ اس کی سطح کے مختلف حصوں میں پہاڑوں کے ڈوب جانے اور اس کی گہرائیوں کی تہہ میں گھس جانے اور اس کے ہموار حصوں کی بلندیوں اور پست سطحوں پر سوار ہوجانے کی وجہ سے اس کی تھرتھراہٹ جاتی رہی اور اللہ نے زمین سے لے کر فضائے بسیط تک پھیلاؤ اور وسعت رکھی اور اس میں رہنے والوں کے سانس لینے کو ہوا مہیا رکھی اور اس میں بسنے والوں کو ان کی تمام ضروریات کے ساتھ ٹھہرایا۔ پھر اس نے چٹیل زمینوں کو کہ جن کی بلندیوں تک نہ چشموں کا پانی پہونچ سکتا ہے اور نہ نہروں کے نالے وہاں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ رکھتے ہیں، یونہی نہیں رہنے دیا، بلکہ ان کے لئے ہوا پر اٹھنے والی گھٹائیں پیدا کیں، جو مردہ زمین میں زندگی کی لہریں دوڑا دیتی ہیں اور اس سے گھاس پات اگاتی ہیں۔ اس نے ابر کی بکھری ہوئی چمکیلی ٹکڑیوں اور پراگندہ بدلیوں کو یکجا کر کے ابر محیط بنایا۔ اور جب اس کے اندر پانی کے ذخیرے حرکت میں آگئے اور اس کے کناروں پر بجلیاں تڑپنے لگیں اور برق کی چمک سفید ابروں کی تہوں اور گھنے بادلوں کے اندر مسلسل جاری رہی تو اللہ نے انہیں موسلا دھار برسنے کے لئے بھیج دیا...... اللہ نے افتادہ زمینوں سے سرسبز کھیتیاں اگائیں اور خشک پہاڑوں پر ہرا بھرا سبزہ پھیلا دیا...... اللہ نے ان چیزوں کو لوگوں کی زندگی کا وسیلہ اور چوپایوں کا رزق قرار دیا ہے......"۔۲

یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب Dr. William W. Hay جو امریکہ میں Collorado یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، قرآن میں دی ہوئی اور وحی کی منزل میں پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ

۱- نہج البلاغہ، خطبہ ۸۹، مرتبہ سید انصار حسین، احباب پبلشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۳۱۰-۳۱۱ ۲- ایضاً، خطبہ ۸۹، ص ۳۱۵-۳۱۸

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیان کی ہوئی سمندروں سے متعلق معلومات پر گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ: ''میں اسے نہایت ہی دلچسپ پاتا ہوں کہ اس طرح کی معلومات قدیم کتاب مقدس قرآن میں موجود ہیں''۔ اور یہ پوچھے جانے پر کہ قرآن کہاں سے آیا انہوں نے کہا کہ: ''بلاشبہ میں یہ تصور کرتا ہوں کہ اس کا نازل کرنے والا مقدس خدا ہے''۔[1]

ت: ڈاکٹر ٹی۔وی۔ این پرسود Dr. T.V.N. Persaud پروفیسر علم تشریح، منیٹو بایونیورسٹی، وننیپگ، منیٹو با، کناڈا Manitoba University, Winnipeg, Manitoba, Canada سے جب قرآن کے ان معجزات کے بارے میں پوچھا گیا جن پر انہوں نے ریسرچ کی ہے، تو انہوں نے کہا: ''جس طرح مجھے بتایا گیا ہے، محمدؐ ایک بہت غریب انسان تھے..... اور ہم بارہ دراصل چودہ سو سال قبل کے بارے میں بات کر رہے ہیں..... ان کی تعلیمات میں بے شمار حقائق پنہاں ہیں اور ڈاکٹر مور Dr. Moore کی طرح، میرے ذہن میں بھی کسی طرح کی کوئی ہچکچاہٹ یہ ماننے میں نہیں ہے کہ یہ الوہی الہام یا وحی ہی ہے جس نے ان محمدؐ سے اس طرح کے بیانات دلوائے''۔[2]

انسانی معاشرہ کو لیجئے کہ اگر لوگوں کے دل ایک دوسرے سے کشیدہ ہوں اور دوستی اور ہمدردی بظاہر تو نظر آئے، مگر اصلاً مفقود ہو، انسان انسان کے ساتھ بے اعتباری کی فضا میں جی رہا ہو تو سوائے ذہنی تناؤ کے اور کیا ہاتھ آئے گا؟ ایسے میں پیغمبر اسلامؐ کے ان الفاظ پر غور کیجئے اور ان پر عمل کیجئے تو ایک بہترین معاشرہ قائم و دائم ہوسکتا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ الناس کاسنان المشط لوگ مثل کنگھی کے دانوں کے ہیں اور یہ کہ انما الاعمال بالنیات ہر عمل نیت پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا اگر ہر انسان ایک دوسرے کو مثل کنگھی کے دانہ کے سمجھے اور خلوص نیت کے ساتھ ایک دوسرے سے معاملات کرے اور طرز معاشرت کو جلا بخشے تو دکھ میں ڈوبی ہوئی اور کراہتی ہوئی انسانیت کو کرہ ارض پر آزادانہ سانس لینے کا حق مل جائے گا اور سارا عالم مربوط طور پر ترقی کرتا ہوا گامزن نظر آئے گا۔ یہ بھی محمدؐ کا پیغام ہے۔

آج دنیا لاکھ انکار کرے، مگر وہ پیغام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حق و سچ کو ماننے لگی ہے۔ جیسے جیسے سائنس اور دوسرے علوم ترقی کرتے جائینگے قرآن، حدیث اور ان کا پیغام دنیا والوں کی سمجھ میں آتا جائے گا۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک ہی آیت جس کو زبان صدق و صفا سے

1- www.Islam-guide.com 2- Ibid

آنحضرت نے دنیا کے سامنے پیش کیا، اہل علم و دانش کی توجہ مبذول کرنے کے لئے کافی ہے:

آپ نے وحی کی منزل میں خدا کے پیغام کو مقام عبرت اور نصیحت میں یہ کہہ کر پہونچایا:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً......۱ آج کے دن ہم تیرے بدن کو بچادیں گے تاکہ وہ تیرے بعد والوں کے لئے نشانی عبرت بنے۔

فرعون اور فرعون والے غرق رودِ نیل ہوئے تھے، فرعون کی لاش کو باقی رکھا گیا تھا، جیسا کہ محمدؐ کی زبانی قرآن کا اعلان ہے۔ زمانہ آگے بڑھتا رہا۔ جب اہرام مصری کی قدیم زبان میں پائی گئی تحریروں کو پڑھنے کی صلاحیت دنیا کو حاصل ہوگئی تو فرعون کی لاش کی شناخت ہوگئی۔ اس طرح پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کو قرآن کی حقانیت اور موسیٰؑ سے نبرد آزما ہونے والے ظالم فرعون کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا پیغام دے کر سرپھرے ظالم حکمرانوں کو ان کے انجام سے باخبر کیا ہے۔

حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "تم نے اپنے سے پہلے لوگوں کے جو گرنے کی جگہیں دیکھی ہیں، ان سے عبرت حاصل کرو کہ ان کے جوڑ بند الگ الگ ہوگئے، نہ ان کی آنکھیں رہیں اور نہ کان، ان کا شرف و قارمٹ مٹا گیا، ان کی مسرّتیں اور نعمتیں جاتی رہیں......"۔۲

خاتم المرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عظمت و منزلت کو سمجھنے اور قرآن و احادیث کی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے عقل و علم اور معرفت درکار ہیں کہ: "اللہ نے اپنے رسولؐ کو چمکتے ہوئے نور و روشن دلیل، کھلی ہوئی راہ شریعت اور ہدایت دینے والی کتاب کے ساتھ بھیجا...... اللہ نے آپ کو مکمل دلیل، شفا بخش نصیحت اور پچھلی جہالتوں کی تلافی کرنے والا پیغام دے کر بھیجا اور ان کے ذریعہ سے شریعت کی نامعلوم راہیں آشکار کیں اور غلط سلط بدعتوں کا قلع قمع کیا اور قرآن و سنت میں بیان کئے ہوئے احکام واضح کئے......"۔ ۳

وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم سب بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر قرآن و احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے، سرگرم تحقیق و عمل ہوں، خاص کر وہ حکومتیں، افراد اور ادارے جو کلمۂ توحید میں یقین رکھتے ہوئے اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، سب کا حق ایک دوسرے پر ہے، اس طرح کہ نہ تو کوئی سرحد، نہ کالے گورے کا

۱- قرآن، سورۂ یونس، آیت ۹۲

۲- نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۹، مرتبہ سید انصار حسین، احباب پبلشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۳۸۳

۳- ایضاً، خطبہ ۱۵۹، ص ۳۸۲

فرق، نہ کوئی اونچ نیچ اور نہ شاہان کج کلاہ کی انا اور غرور بے جا انسان کی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود کو روک پائے۔ تحقیق کی روشنی میں عمل ہو اور ترقی ہو کہ انسان کب سے صلح و آشتی، امن و امان اور خوشحالی کی آرزو لئے دامن امید پھیلائے شاہراہ انسانیت پر سر نہوڑائے کھڑا ہے!

آیئے! پیغمبر رحمت کی تعلیمات کو سمجھیں، اور اس پر عمل کریں، اسے ایک دوسرے کو بتلائیں کہ کامیابی و کامرانی کا حصول ہو اور درد کا مداوا بھی۔

معجزات رسولؐ، جدید تصورات کی روشنی میں

ڈاکٹر سید محمود الحسن صاحب رضوی

موجودہ دور کا انسان شعوری و ذہنی حیثیت سے ارتقا کی جس بلند منزل تک پہنچ چکا ہے اس میں مذہبی تصورات کے بہت سے پہلو بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ سائنس، نفسیات اور علم و دانش کے مختلف موضوعات کے مطالعہ کی وسعت نے ہر عمل کی وضاحت، اس کے اسباب و علل اور اس کے عناصر کے وجود کے بارے میں غور و فکر کو بنیادی جگہ دے دی ہے اور جدید ذہن کسی روحانی اور عالم خاکی سے بالاتر طاقت پر اعتقاد رکھنے کے بعد بھی مذہب کے بعض تصورات پر یقین کرنے میں مشکوک نظر آتے ہیں چاہے وہ کھل کر ان سے اختلاف نہ کرسکیں۔ ''معجزہ'' بھی ایسا ہی ایک مسئلہ ہے جس کے مطالعہ کے بغیر کسی مذہب کے ارتقاء کو جاننے میں دشواری ہوگی کیونکہ اس کے ذریعہ مذہبی اشاعت کے سلسلے میں بڑے بڑے کام لئے گئے، اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کسی نہ کسی شکل میں ہر مذہبی رہنما نے اسے اپنایا۔ یہاں تک کہ کسی مذہب کا وجود بغیر معجزات کے آگے نہیں بڑھ سکا۔ مذاہب کی اشاعت کے ابتدائی دور میں ہر اُس عمل پر یقین کرلیا جاتا تھا جو انسانی عقل سے باہر ہو۔ اس لئے ہر مذہب کے بانی کو کسی نہ کسی منزل پر اس کو کام میں لانا پڑا لیکن آج کل معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں ہر عمل کی وضاحت ضروری سمجھی جانے لگی ہے، کسی عمل کی وجہ بتائے بغیر مقصد کی اشاعت کی طرف قدم نہیں بڑھایا جاسکتا اور حقیقت یہ ہے کہ آج جب کہ جدید فلسفہ کی روشنی میں مادیت زیادہ شدت سے جڑ پکڑتی جارہی ہے لوگوں کی بڑی تعداد کے ذہنوں میں یہ نظریہ مضبوطی سے جڑ پکڑتا جارہا ہے کہ مادّے سے الگ کسی غیر مادّی چیز کا وجود نہیں ہے، بہت سے لوگ شدت سے اس خیال کے مبلغ ہیں کہ انسانی زندگی کی ہر ذہنی و نفسیاتی سرگرمی بھی مادّی عمل ہی کی ایک شکل ہے جو دماغ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں جب تک ان بنیادوں کی وضاحت نہیں ہوتی جن سے یہ واضح ہوسکے کہ معجزات اپنے دور کے سماجی و معاشرتی حالات سے کتنا گہرا تعلق رکھتے تھے، اس وقت تک ان پر یقین دلانا بہت دشوار ہوگا اور اسی طرح اس سلسلے میں

ذہنی کشمکش کو دور کیا جاسکتا ہے۔

علماء اور فلاسفۂ اسلام کے لحاظ سے معجزہ اس امر عادت شکن کا نام ہے کہ جو محیر العقول ہونے کے ساتھ کسی نبی یا امام کی جانب سے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جائے اور جس کا انجام عام آدمی کے بس میں نہ ہو'۔ چنانچہ جدید سائنس کی بہت سی ایجادات حیرت خیز ہونے کے باوجود معجزہ کی تعریف میں نہیں آسکتیں کیونکہ ان کے آلات اور مشینی تنظیم کو سمجھنے کے بعد ہر باشعور انسان اسے بنا سکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جب معجزہ کے لیے عقل و دانش کی حیرت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے حیرت حقیقیہ مراد ہوتی ہے۔ اضافی حیرت تک محدود ہونا کافی نہیں ہے چونکہ یہ عمل انسانی طاقت سے باہر ہوتا ہے جو ہر دور کے انسان کے لئے اتنا ہی محیر العقول ہوتا ہے جتنا اس وقت تھا جب کہ وہ معجزہ ظاہر کیا گیا، یہ کسی منزل پر رد نہیں کیا جاسکتا نہ کبھی کوئی دوسرا اس کو انجام دے سکتا ہے۔

رسولؐ خدا کو جس معاشرتی اور سماجی زندگی سے سابقہ پڑا اس میں ایک طرف جہالت کا دور دورہ تھا، دوسری طرف توہم پرستی اپنی بلند ترین منزل پر تھی۔ پرانے رسوم و رواج اور عقائد کی پابندیوں سے خود کو الگ کرنے کے لئے لوگ کسی منزل پر تیار نہ تھے اور انھیں چیزوں کا نتیجہ تھا کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہ کرسکتے تھے۔ ان حالات میں وہ ہر اس چیز کے قائل اور مطیع ہوجاتے تھے کہ جن کے اعمال ان کی عقل وفہم سے دور ہوں۔ اطاعت کا یہ تصور اس قدیم سلسلہ کی ایک کڑی تھا جس میں مفکرین زیادہ تر نامعلوم چیزوں سے الجھتے رہے۔ انھوں نے یہ سوال کبھی نہیں اٹھایا کہ نظام فطرت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کیوں ہوتا ہے بلکہ داخلی توہمات کو ایک ایسے ہم آہنگ نظام میں مربوط کرلیا تھا جس میں ہر قسم کے ان ہونی اعمال کی اطاعت لازمی جز بنی ہوئی تھی۔ ساحری اور جادوگری کو اہم حیثیت حاصل تھی اور اس کا نتیجہ تھا کہ ہر دور میں پیغمبروں کو حقانیت کی تبلیغ کے لیے معجزات کا سہارا لینا پڑا۔ قوم عرب کے نئی نسل کے افراد اپنے آبائی خیالات کے ذخیروں کو کسی قیمت پر اپنے سے جدا کرنے کو تیار نہ تھے، ان کے معتقدات جو ان کے آباؤ اجداد سے چلے آئے تھے ان کو قیمتی ورثہ سمجھ کر سینوں سے لگائے بیٹھے تھے۔ بادیہ نشینوں کے اس ماحول میں خوں ریزی، قصاص طلبی، صیدافگنی اس اعتقاد کا ایک اہم عنصر تھی جس میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے یہ تمام فرائض انجام دینا ضروری سمجھ لیا گیا تھا۔ ان حالات میں جب کوئی فرد ایسی آواز بلند کرنے کی طرف قدم اٹھائے جو سارے افراد کو جھنجھوڑ کر رکھ دے تو اس کو حقانیت، الٰہی قوت اور اپنے عزم و استقلال پر اتنا بھروسہ

ہونا چاہئے کہ کسی خوف و خطر کے احساس کے بغیر اپنے مقصد کی تکمیل میں بڑھتا جائے۔ اسی عظیم مقصد کو ساتھ لے کر رسولؐ یہ طے کر کے آگے بڑھے کہ تہذیب کے زنگ آلودہ جواہرات میں نئی آب و تاب پیدا کردیں، روحانیت کی طاقت سے لوگوں کو روشناس کرائیں۔ اخلاقی قوت کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے روشن کردیں اور جادو اور ساحری سے بھری ہوئی اس فضا میں ایسے معجزات پیش کریں جس کے سامنے اس دور تک کے تمام ساحروں کے سحر جھوٹے پڑ جائیں، عاقلوں کو حیرت ہوجائے، لوگوں کے ذہنوں پر تیرگی چھا جائے اور یہی اثرات تھے جس نے ثابت کردیا کہ اس کی رسالتؐ کا دائرہ عظمت تمام انبیائے سابقین کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے جس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اسلامی تصورات کی اشاعت اور اس کی تبلیغ میں جو معجزہ سب سے زیادہ اثرانداز ہوا وہ قرآن مجید ہے، رسولؐ نے جب وحدانیت کا اعلان کیا تو اس وقت اہل عرب کو اپنی شاعری، زبان اور فصاحت و بلاغت پر سب سے زیادہ فخر تھا، جذبات کی مصوری، خیالات کی صفائی، مضامین کی سادگی، تشبیہات و استعارات کی نزاکت اور فرضی مرصع کاری پر ان کو ناز تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی فصاحت و بلاغت آج تک اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ان حالات میں ان کے ذہن وشعور میں انقلاب لانے کے لئے ایسی ہی زبان سے کام لیا جاسکتا تھا جس کا اظہار ان کی طاقت سے باہر ہو۔ چنانچہ رسولؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی تھا کہ اگر وہ اس کتاب کے ساتھ نہ آتے تو ان کے جذبۂ برتری کو دبانا مشکل تھا۔ اس دور کی سماجی زندگی کا دوسرا اہم پہلو ''شجاعت'' تھا۔ بچوں کو ابتدا سے تیر وتلوار کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بہادری سے جان دینا یا دشمن کو میدان جنگ سے پیچھے بھگانا شہرت ومقبولیت کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ عورتوں تک میں مارنے مرنے کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ وہ لڑائی میں مقابلہ کے لئے مردوں کو اُکسا کر میدان میں بھیجتی تھیں۔، جنگ میں مردوں کے قتل ہو جانے پر فخر کرتی تھیں، میدانِ جنگ میں ہمت دلانے والے نغمے گاتی تھیں، بزدلی کے خلاف طعنے دیتی تھیں، بدلہ لینے کے لیے جوش و ولولہ ابھارتی تھیں، ان حالات میں رسول کو ایسے فرد کی ضرورت بھی تھی جو شجاعت، جوانمردی اور اپنے جنگی کارناموں سے دوسروں کو بے بس کردے۔ رسول خدا کا یہ معجزہ ہی تھا کہ انھوں نے علیؑ جیسے بہادر اور شجاع کو منتخب کرکے اپنے ساتھ لیا جن کے مقابلہ پر عرب کا کوئی فرد نہیں آسکتا تھا۔ عرب میں زبان دانی اور شجاعت کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ مردوں کے لیے دو چیزوں کو ضروری سمجھا گیا تھا۔ ایک

''دل'' جو دشمن کا پوری طرح مقابلہ کر سکے۔ دوسرے ''زبان'' جس کے اظہار سے دوسروں کو متاثر کر سکے۔ ایک مشہور عربی شاعر نے اسی لیے ایک شعر میں ان خیالات کا اظہار کیا کہ:

''ہر آدمی آدھا زبان ہے آدھا دل ہے، اگر یہ دو چیزیں نہیں ہیں تو وہ انسان نہیں گوشت و خون کا لوتھڑا ہے''۔

چنانچہ اسی لیے رسولؐ نے قرآن کے ساتھ علیؑ کی شخصیت کو اسلام کے لیے ضروری سمجھا جس کے اجماع نے عربوں پر بہت بڑے معجزے کا کام کیا۔ اس کے بعد نہ عربوں کو قرآن جیسا فصاحت و بلاغت کا نمونہ مل سکا نہ انہیں علیؑ جیسی شجاعت دکھائی پڑی۔ اسی لیے کسی نے لکھا ہے کہ'' قرآن کے آگے علمائے عرب کے سر خم ہو گئے اور علیؑ کے آگے شجاعان عرب سرنگوں ہو گئے، اس کی گفتار کی پکار زمانے میں ہے تو ان کی تلوار کی جھنکار سارے عالم میں گونج رہی ہے''۔ ایک نے صامت رہ کر اعجاز پیدا کیا دوسرے نے اپنے عمل اور جسمانی انداز پر چنانچہ جب رسولؐ خدا نے یہ فرمایا کہ:

''علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ''۔

تو یہ سارے عالم کے لیے ایک کھلا ہوا اعلان تھا کہ اگر اسلام کی اشاعت میں قرآن کریم کی اہمیت کا اقرار کیا جاتا ہے تو کسی منزل پر حضرت علیؑ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب قرآن نے ساری دنیا کو چیلنج کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اگر کسی کو اس پر شک ہے تو وہ اس کے کسی ایک سورہ کا مقابل لے آئے تو اس نے سارے عالم کو بے بس کر کے یہ یقین دلایا کہ یہ ایسا کلام ہے جو ان کی ذہنی رسائی سے بلند اور انسانی طاقت سے باہر کی چیز ہے۔ اس طرح قرآن مجید معجزہ کا عظیم ترین نمونہ بن کر سامنے آیا لیکن عرب اس بلندی فصاحت سے شکست کھانے اور لاشعوری طور پر احساس شرمندگی کے بعد ایک ایسا نمونہ بھی چاہتے تھے جو ان کی شجاعت و بہادری کے غرور کو چکنا چور کر دے اسی جذبہ کو شکست دینے کے لیے رسولؐ کی دور بین نظر علیؑ کا انتخاب کر کے سامنے لائی جن کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ سے خود بخود ظاہر ہے کہ وہ'' نبوت کی تلوار اور ان کی رسالتؐ کے لیے ایک معجزہ ہیں''۔

حقیقت پسند اور اہل نظر افراد کے لیے یہی دو معجزات ثبوت حق کے لیے کافی تھے اور ایک بڑی تعداد اس سے متاثر ہو کر وحدانیت پر اعتقاد لے آئی لیکن عرب جہالت تو ہم پرستی اور فرسودہ روایات کے ماحول میں جس شدت سے جکڑے ہوئے تھے اس میں بعض ایسے محیر العقول مظاہر کی اور ضرورت تھی جو ان کے قدیم اعتقادات کو متزلزل کر دے چنانچہ رسولؐ اسلام نے بعض مواقع پر جب

ضرورت سمجھی تو ایسے معجزات پیش کیے جن کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ رسولؐ جانتے تھے کہ انھوں نے جس مقصد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے وہ اتنا مضبوط اور حقیقت آمیز ہے کہ اس کے لیے کسی ظاہرداری کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے معجزات کا ظہور ایسے ہی مواقع پر کیا گیا جہاں مخالفین کو یقین دلانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تھا۔ رسولؐ نے عربوں کی انفرادی، سماجی اور اعتقادی زندگی کو بغور دیکھا تھا، ان کی ذہنیت کے تمام گوشوں اور ان کی شعوری اور غیر شعوری کمزوریوں سے واقف تھے، ان کے مزاجوں کو بدلنے، ان میں انقلاب لانے اور ان پر قابو حاصل کرنے کے لیے رسولؐ کی دانشوری نے ان تمام مراحل کو بخوبی سمجھ لیا تھا جن کے ذریعہ انھیں اپنے تکمیل مقصد کی طرف قدم بڑھانے میں مدد ملی۔ ہر منزل پر خدائی طاقت کے اظہار سے وقتی طور پر ان افراد کو خوف زدہ اور مرعوب تو کیا جا سکتا تھا لیکن سحر و جادوگری پر یقین رکھنے والی اس جماعت کی ذہنیت کو بدلنے کے لیے رسولؐ کی وسیع النظری نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کے فرسودہ اور کھوکھلے عقائد کی معمولی بنیادوں کو بھی دلوں سے نکال دیا جائے، اسی وقت ان کو اپنے مقصد کی تکمیل میں کامیابی مل سکتی ہے چنانچہ یہ احساس ہوتے ہوئے بھی کہ وہ عظیم ترین اور کامل ترین مذہب کی تبلیغ کرنے جا رہے ہیں انھوں نے معجزات کو ہی اپنا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ محض مخصوص حالات میں ان کو پیش کرنے پر اکتفا کی۔

جناب رسالت مآب کے جو معجزات زیادہ شہرت رکھتے ہیں ان کے مطالعہ سے ایک طرف اس دور کی قوم عرب کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے دوسری طرف رسولؐ کی اس عظمت اور وسیع النظری کا جس نے ان کے دلوں کو فتح کرنے کے لیے کسی جبر و طاقت کا استعمال کرنے کے بجائے ہمدردی، محبت، ایثار اور خلوص کو مقدم ٹھہرایا۔ ایک معجزہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ قریش کا ایک گروہ رسولؐ خدا کے پاس آیا اور کہا کہ ہم ایک بات کہیں اگر آپ اس کو کر دکھلائیں گے تو ہم آپ کو نبی مان لیں گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپ اس پورے درخت کو اپنے سامنے بلا لیجئے، رسولؐ کو یہ احساس تھا کہ اس کے باوجود وہ لوگ نیکی کی طرف راغب نہیں ہوں گے لیکن یہ کہہ کر کہ ''اے درخت اگر تو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور تجھ کو یقین ہے کہ میں خدا کا رسولؐ ہوں تو زمین سے اپنی جڑوں سمیت الگ ہو کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جا''۔ اُس وقت درخت کو اپنے قریب بلا لیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ درختوں میں بھی خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی عظمت کا کتنا احساس ہے۔ محض اسی بات پر اکتفا

نہیں کی بلکہ ان لوگوں نے کہا کہ اس درخت کے دو ٹکڑے کر دیجئے۔ رسولؐ کے حکم سے وہ دو حصوں میں بٹ گیا، پھر ایک حصّہ وہیں قائم رہا۔ دوسرا نصف حصہ اپنی جگہ پر واپس کر دیا۔ بعد میں دوسرے حصے کو بھی حکم دے کر دوبارہ مل جانے کو کہا اور اس طرح وہ درخت پھر مکمل شکل میں نظر آنے لگا۔

اسی طرح ایک دوسرے معجزے میں یہ ظاہر کیا کہ ایک عرب شکاری ایک جنگلی گوہ کو پکڑ کر رسولؐ کے سامنے لایا اور کہنے لگا کہ اگر یہ جانور آپ کی رسالت کی گواہی دیدے تو میں ایمان لے آؤں گا۔ رسولؐ خدا نے اس جانور کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ تو کس خدا کی عبادت کرتا ہے۔ گوہ نے جواب دیا: اس خدا کی، آسمان پر جس کا عرش ہے، زمین پر جس کی حکومت ہے، جنت میں جس کی رحمت ہے اور جہنم میں جس کا عذاب ہے، رسولؐ خدا نے فرمایا کہ بتا میں کون ہوں؟ اس نے جواب دیا کہ ''آپ خدا کے رسولؐ اور خاتم الانبیاء ہیں۔ جس نے آپ کی تصدیق کی اس نے فلاح پائی اور جس نے انکار کیا وہ تباہ ہوا''۔

محض یہی نہیں کہ رسولؐ خدا کے حکم دینے کے بعد حیوانات، جمادات اور نباتات نے آپ کی عظمت کا اقرار کیا بلکہ بہت سے ایسے مواقع بھی نظر آتے ہیں جہاں ان عناصر نے خود بخود خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔ جب حضرت علیؑ ایک مرتبہ یمن تشریف لے گئے ایک بڑا مجمع شہر سے باہر آن کر ان کو دیکھنے آیا تو حضرت علیؑ نے وہاں کے حجر و مدر کو بہ آواز بلند رسولؐ کا سلام پہونچایا۔ اس کے جواب میں پتھروں اور سنگریزوں سے آواز آئی۔ یہ دیکھ کر اہل یمن ایمان لائے۔ اسی طرح ایک مرتبہ رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ سے ایک مٹھی سنگریزے لئے جب اسے ہاتھ میں لیا تو اس سے خدا کی وحدانیت اور رسول کی حقانیت کی آواز آئی۔ رسولؐ کی عظمت اور ان سے عقیدت کا اظہار نباتات و جمادات کے ذریعہ بعض جگہوں پر ایسی مستقل شکل میں ظاہر ہوا کہ ان کے اثرات خاندان نبوت اور اہل بیتؑ کی ہر خوشی و غم کے موقع پر ظاہر ہوتے رہے۔ جب رسولؐ خدا نے ایک مرتبہ کسی جھاڑی میں کلّی کر دی تو وہ سرسبز و شاداب ہو کر روشن ہو گئی۔ اس سے ایک درخت میں ایسے پھل لگ گئے جو خوشبو میں عطر اور ذائقہ میں شہد کے برابر تھا۔ ان پھلوں میں ایسی تاثیر پیدا ہو گئی کہ شدید سے شدید پیاس و بھوک فوراً مٹ جاتی تھی، بیمار اسے کھا کر شفا پاتے تھے۔ درخت کے یہ اثرات اس وقت تک قایم رہے جب تک رسولؐ خدا زندہ تھے لیکن ذات رسولؐ سے اس کی عقیدت کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اس میں خزاں کے آثار شروع ہو گئے، پھلوں

اور پھولوں میں کمی آنے لگی۔ شہادت حضرت علیؑ کے بعد وہ خشک ہو کر محض تنے کی شکل میں باقی رہ گیا اور لوگوں نے ایک دن یہ بھی دیکھا کہ اس تنے سے خون ابل رہا ہے، یہ یوم عاشورہ تھا جس دن امام حسینؑ اور اصحاب نے شہادت پائی اور اس طرح اس درخت نے خاندان رسولؐ کی بہار وخزاں کے ہر دور کی گواہی دے کر عوام کو یہ احساس دلایا کہ اس خاندان سے گہری وابستگی ہی زندگی کی نشاندہی ہے۔

قارئین نے معجزۂ شق القمر، معجزۂ روشمس اور اسی طرح کے بہت سے مشہور معجزات کی اہمیت کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کر لیا ہوگا جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے البتہ ان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ رسولؐ کو آفاق و کائنات کی تمام اشیاء کے حرکات وسکنات پر جس قدر قدرت حاصل تھی وہ ان کی عظمت کی گواہی وثبوت کے بہت بڑے نمونے ہیں جس نے آج کی ترقی یافتہ ذہنوں کو بھی حیرت زدہ کر کے بے قابو و بے بس بنا دیا ہے۔

رسولؐ اسلام نے جس طرح مذہب اسلام کے اصولوں کے اعلان سے مذہبی، تہذیبی اور ذہنی ارتقا کی بلند ترین شکل پیش کر دی۔ اسی طرح ''شب معراج'' جب اس بلندی پر پہونچے جہاں جبرئیل کے قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے تو اس وقت انسانی ذہنوں کی بلند ترین منزل بھی ختم ہوگئی۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ'' پاک ہے وہ ذات جو لے گئی بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک'' اگر ایک طرف الٰہی طاقت کی بلندی کا احساس دلاتا ہے تو دوسری طرف اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہر دور کے انسانوں کو رسولؐ کی شخصیت کی عظمت، رفعت و بلندی اور ان کی قربت خداوندی کا اقرار کئے بغیر نہ بن پڑے۔ مختلف جنگوں کے دوران یا دشمن سے مقابلہ کے ہر موقع پر بھی ایسے بہت سے معجزات رونما ہوئے جس نے مخالفین کے دلوں میں رسولؐ خدا کی تعلیمات کو پیوست کر دیا اور وہی ان کی نبوت کے ثبوت کے لیے بہت کافی تھے۔ مثلاً جنگ خیبر میں ۱۴ ہزار مسلح یہودیوں کے دلوں میں قلیل التعداد نہتے مسلمانوں کا خوف و رعب طاری ہو جانا، خیبر سے واپسی پر گہرے پانی سے سارے لشکر کا ایسے گزر جانا کہ جانوروں تک کا پیر نم نہ ہوا۔ دشمنوں کی اس سازش کا پتہ دے دینا کہ انہوں نے کھانے میں زہر ملا دیا ہے۔ یہ تمام ایسی طاقت کا مظہر ہے جس کی عظمت سے آج تک کا کوئی بشر انکار نہیں کر سکا۔

یہاں اُن تمام معجزات اور محیر العقول کارناموں کا ذکر کرنا مقصود نہیں ہے جو رسولؐ اسلام کی زندگی میں ظاہر ہوئے نہ ان کو بیان کرنا ممکن ہے۔ ان کی روزانہ زندگی کے معجزات سے ہر ذی علم واقف ہے مثلاً آپ کی پیدائش کے موقع پر ایوان کسریٰ کے کنگروں کا گرنا۔ بحیرۂ ساوہ کا خشک ہو جانا، ایران

کے آتش کدہ کا خاموش ہوجانا، آسمان پر شہاب ثاقب کا نمودار ہونا۔ اس طرح نظام قدرت میں حیرت خیز تبدیلیاں اس چیز کا پیش خیمہ تھیں کہ حیات وکائنات کے نظام میں کوئی بڑی تبدیلی اور کسی بڑے ثقافتی انقلاب کی بنیاد پڑنے والی ہے۔ اس کے بعد جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ رسولؐ مقبول کے سر پر ہر جگہ ابر سایہ کیے رہتا ہے، دلدل اور نم زمینوں پر بھی ان کے قدموں کے نشانات نہیں بنتے ہیں۔ اس کے برخلاف سخت پتھروں پر نشان قدم نمودار ہو جاتے ہیں تو اس دور کے افراد کے لئے یہ کہہ دینا آسان نہیں رہ گیا کہ یہ سب جادوگری اور ساحری ہے اور انہیں ان تعلیمات کی خوبیوں کا اقرار کرنا پڑا رسولؐ مقبول جن کو لے کر آگے بڑھے تھے اور جس نے ہر شعبۂ حیات میں وحدانیت کا جادو پھونک دیا۔

آج نسل انسانی اپنے ذہنی ارتقاء کی بلند منزلوں کی طرف قدم بڑھا رہی ہے، سائنس کے کرشمے زندگی کے بہت سے پیچیدہ اور دبے ہوئے عناصر کی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں، آج انسان آفاق کے ہر عنصر پر اپنے ذہن کے ذریعہ قابو پاتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ایک طرف روحانی طاقت کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹتی جا رہی ہے دوسری طرف جنگ کے خوفناک اور بھیانک بادلوں کی گونج سے ساری انسانیت امن کی آواز بلند کر رہی ہے۔ اس منزل پر اسلامی دانشوروں کے سامنے یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ ایک طرف اسلام کی عظمت اور اس کے حصول کی اشاعت کے ذریعہ امنِ عالم کی تحریکوں کو مضبوط بنائیں دوسری طرف اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے لوگوں کے دلوں سے یہ شکوک دور کریں کہ جدید سائنسی ایجادات کے بعد اسلامی معجزات میں کسی قسم کی کمتری کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔

رسولؐ اسلام نے جن معجزات کو پیش کیا وہ آج بھی انسانی دنیا کو حیرت زدہ کیے ہوئے ہیں اور کسی دور میں بھی وہاں تک ان کے ذہنوں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اسلامی عقائد اور جدید سائنسی ترقی میں کبھی تضاد نہیں تھا نہ کبھی ہوگا۔ سائنس داں ہر بلند منزل تک پہونچنے کے بعد بھی اس منزل تک نہیں پہونچ سکتے جن کا تعلق الٰہی قوت سے ہے۔ انسان بہت سی چیزوں میں آج بھی روحانی عظمت کا قائل ہے اور ہمیشہ اس کے آگے سرِتسلیم خم کرتا رہے گا اور رسولؐ کے معجزات کا جاننا اسی لئے ہر منزل پر ضروری ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کے ذہنی کارنامے الٰہی قوت ہی کا عطیہ ہیں اور اس کے مقابلہ میں ہمیشہ بے بس و مجبور رہیں گے۔

کاروان اخلاق کا پڑاؤ

سید کاظم رضا

انسانوں کی زندگی جس طرح ایک زمین پر ایک سورج کی روشنی ایک حرارت میں مشترکہ طور پر سانس لیتی آنکھ کھولتی اور ملتی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ایک ایسا کامل و مکمل ضابطہ زندگی بھی ہو جس کے برتنے پر باہمی تعلقات خوشگوار تر ہوتے جائیں جس کے بعد رنگ و نسل و قوم وطن کے جھگڑے بکھیڑے نہ پیدا ہوسکیں سارے انسان ایک ملت ایک وحدت میں سموئے دکھائی دیں ظاہر ہے ایسا ضابطہ جو اس انداز اور اس صفت کا ہو اس کی تدوین و ترتیب انسان کے بس کا کام نہیں انسان بڑی محنت سے ایک مکان بناتا ہے بظاہر اس کے استحکام میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا پھر بھی اس کی حیات چند روزہ ہوتی ہے اللہ کی بنائی زمین تو رہ جاتی ہے لیکن انسان کا بنایا مکان نہیں رہتا۔ انسان دوسرے انسان کے لئے دستور بناتا ہے لیکن وہ ایسا آئین ہوتا ہے جو ہمہ وقت بدلتا رہتا ہے یہ ترمیم و تنسیخ بتاتی ہے کہ دستور سازی انسانی کام نہیں بلکہ اس کا کام ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے ضابطہ حیات اس کی طرف سے معین ہونا چاہیے جو خالق فطرت ہے۔ جس نے ناپ تول کر انسان کا مزاج اور اس کی طبیعت بنائی ہے جسمانی امراض کا علاج آج اسی ڈھنگ سے ہوتا ہے کہ پہلے جانچ ہوتی ہے جانچ میں جس عنصر کی کمی یا زیادتی نظر آتی ہے اس کو پھر اعتدال پر لانے کی تدبیر کی جاتی ہے۔

روحانی امراض کی تشخیص اور اس کا علاج اس سے بھی دشوار تر ہے۔ اس لئے کہ نہ مرض مادی ہے اور نہ مادی تدابیر اس میں کارآمد ہیں۔ تشخیص سے تدبیر تک سارا کارخانہ نظر سے اوجھل ہوتا ہے قانون سازی اگر دنیا والوں کے حوالے ہوتی ہے تو اس میں دانستہ یا نادانستہ غلطی ضرور ہوتی ہے اور کوئی سائنٹفک طریقہ اس غلطی کو روک نہیں سکتا ہے جب کہ عملی کاموں میں ہزار احتیاط پر بھی کبھی مثلاً کوکوکولا کی بند بوتل سے کوئی کیڑا اور بناسپتی کے بند ڈبوں میں چھپکلی یا مرا ہوا چوہا نکل ہی آتا ہے۔ جب مادی موٹے کاموں کا یہ حال ہے تو انسانی ضابطۂ اخلاق اور وہ بھی انسان کو سمجھے بغیر یعنی روح کے انکار کے ساتھ جو مرتب ہوگا کس قدر ناکارہ ہوگا۔ اس کا اندازہ موجودہ انسانوں کی بے چینی سے لگایا جاسکتا ہے۔ جب کہ ہر قوم کے اعلیٰ دماغوں نے مل کر قومی اور بین الاقوامی قانون بنائے

ہیں۔ البتہ صحیح ضابطہ زندگی صرف مذہب پیش کرسکتا ہے۔ چنانچہ دین اور اسلام کا مقصد یہی ہے کہ ایسا جامع اور حیات بخش ضابطہ اخلاق پیش کیا جائے جو بہرصورت سب کے لئے یکساں اور مفید ہو اور ان ہاتھوں سے پیش کیا جائے جن سے کسی قسم کی خطا کا امکان بھی نہ ہو نیز پیش کرنے والے کی زندگی ہر طرح کیل کانٹے سے درست ہو جو سراپا آئین اور ضابطہ کی تصویر ہو جس کے کردار کی اثر خیزی دوسرے مثالی نمونے تیار کرسکے۔

ممکن ہے کہ ایک سوچنے والا یہ سوچے کہ جب دین مکمل اخلاقی ضابطہ ہے تو ایک دیندار اور مسلمان اخلاقی پستی میں کیوں مبتلا نظر آتا ہے۔ اور ایک بے دین و دہریہ اخلاق کے لحاظ سے کیوں بہتر معلوم ہوتا ہے اور بے دین اخلاق میں بہتر مگر جہنمی اور دیندار اخلاق میں کمزور مگر جنتی آخر یہ کس عدالت کا فیصلہ ہے یہ سوچنا بجا نہیں لیکن فیصلہ کی درمیانی کڑیاں غایب ہونے سے نتیجہ غلط برآمد کیا گیا ہے۔ مجرم بہر طور مجرم ہے خواہ دیندار ہو یا بے دین نیکی بہرحال نیکی ہے خواہ دیندار سے ہو یا بے دین سے جرم کی سزا اور نیکی کی جزا دونوں کے واسطے یکساں ہونے کے باوجود دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک قانون مانتا ہے مگر جرم کا مرتکب ہوا دوسرا قانون کو سرے سے مانتا ہی نہیں۔ قانون کے منکر کو ترحم کی اپیل کرنے کی بھی گنجایش نہیں ہوتی لیکن قانون کے اقرار کرنے والے کے لئے قطعی گنجایش ہے کہ وہ اپنے کیے کے بھگتنے کے مستحق ہونے کے باوجود ترحم کی اپیل کرسکے اور ترحم خسروانہ کے باعث جنت نصیب ہو مگر منکر قانون اپنے افکار کی پاداش میں جہنم کا نوالہ بنے گا۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔

ایک دوسرا سوال یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب انسانی اخلاق کسی قوم وقبیلہ مذہب وملت کی ذاتی اور خصوصی جاگیر نہیں ہیں بلکہ انسان کی طبیعت میں خود پیدا ہوتے ہیں کیونکہ انسان بحیثیت انسان چند قوتوں کا مالک ہے۔ نفس ناطقہ انسان کے ساتھ دو اور طاقتیں دفاع اور کشش کی ہیں جن کو اصطلاح میں قوت غضبہ، قوت شہویہ کہتے ہیں جن کا کام پسندیدہ اور نفع بخش ضروریات زندگی کا فراہم کرنا اور زندگی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہوں ان کو راستہ سے ہٹانا ہے آخری دو طاقتیں انسان کے علاوہ جانوروں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن بے عقل ہونے کی بناء پر اعتدال پر باقی نہیں رہتی ہیں جانور جانور ہی ٹھہرا اپنا پرایا نیک بد جو ملا سمیٹ کر چٹ کر گیا مالک اور دشمن کو پہچانے بغیر سینگ چلادی پنجے اور لات ماردی کاٹ کھایا مار ڈالا زخمی کردیا انسان میں نفس ناطقہ نے ان پر کنٹرول کیا

اپنے ماتحت رکھ کر ان کو بے راہ رو ہونے سے بچایا نفس ناطقہ اور ان دونوں طاقتوں کے صحیح امتزاج سے اخلاق کی چار جنم ماتائیں (امہات الاخلاق) حکمت، عفت، شجاعت، عدالت کے اوصاف پیدا ہوئے بے شمار اخلاقی نسل پیدا ہوئی اور پھیلی یوں اس نامور خاندان انسانیت کی قدروں میں اضافہ کیا غرض کہ جب اخلاق مشترک انسانی دولت ہیں پھر اس کو کسی دین سے کیونکر وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے دین اور حسن خلق دو الگ چیزیں نہیں ہیں حُسن خُلق ہی دین ہے جو انسان کو فضایل سے آراستہ اور رذایل سے پاک کرتا ہے۔ دین ایک ہے اور بس ایک جس کو خدا نے بندوں کی لئے پسند فرمایا جو انسان کی طبیعت سے پوری موافقت رکھتا ہے جس کو خالق فطرت نے خود شناسی اور خدا شناسی کے لئے معصوم ہستیوں کے ذریعہ دنیا میں بھیجا اور بندوں تک پہونچا انسان کی کارستانی سے دین کی یکتائی میں فرق نہیں آیا قرآن میں اگر اپنا کلام ملادیا جائے تو ملاوٹ خود بول اٹھتی ہے دوسرے ادیان کی خامیاں اور اسلام کی خوبیاں بتاتی ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے دوسرے مذاہب کی خامی اور اسلام کی خوبی کو بیان کرنا اس وقت مقصود نہیں پھر بھی اشارے کے طور پر اتنا کہنا ہے کہ بعض مذاہب میں نسلی تفریق ذات کی اونچ نیچ چار ذاتیں اور ہر ذات کے لئے علیحدہ علیحدہ جبری قانون جس میں سرمو فرق نہیں ہوسکتا۔ جیو ہتیا کی ناممکن العمل ممانعت وغیرہ بعض میں تین ایک اور ایک تین کا الٰہی تصور یہ منطقی خامیاں نہیں تو کیا خوبیاں ہیں یہ باتیں صاف بتلاتی ہیں کہ یہ عقیدے انسان کی آپ اپنی اُپج ہیں بر خلاف اس کے اسلام میں ایک بھی ایسی بات نہیں پائی جاتی جسے عقل باور نہ کرے یا فطرت کو انکار ہو۔ دین حسن خلق نبی کا نام ہے۔ یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں حضور اکرم سرکار دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں آنے کی غرض یہی بیان کی ہے کہ میں خدا کی جانب سے اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ کاروان اخلاق کے طویل سفر کو جو جناب آدم سے شروع ہوا تھا اس کو آخری منزل تک پہونچا دوں۔ (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) اس ارشاد کا صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ دین اخلاق کا مکمل ضابطہ جس کی تکمیل اور آخری تدوین میرے ذریعہ ہوگی۔ اس ارشاد کی تفسیر نفس رسول امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمائی دین کی پوری تفصیل کو دو جملوں میں سمیٹ کر بیان فرمایا۔

اللہ کے احکام کی برتری اور بندوں پر مہربانی کرنا دین ہے۔ آج دنیا اپنی عقلمندی سے یہی سمجھتی ہے کہ علم دین اور ہے اور علم اخلاق اور ہے شاید اس بنا پر کہ پابند مذہب اور لامذہب دونوں میں

اخلاقی نشانات پائے جاتے ہیں لیکن یہ مشاہدہ نادانی پر مبنی ہے جس پر عقل ہنسے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ ہزار بگڑے پر انسان اپنی آدمیت کہاں لے جائے گا۔ دین سے گیا گذرا شخص بھی اللہ سے انکار کرنے والا بھی قدرے قلیل وہ علامتیں ضرور رکھتا ہے جس سے اس کی نوع پہچانی جاسکے جس طرح بچپنے سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی شکل بہت کچھ بدلی ہوتی ہے لیکن چہروں کی ساخت قدو قامت سے پتہ لگ ہی جاتا ہے کہ یہ کون شخص ہے اسی طرح درندہ صفت انسان میں بھی کوئی نہ کوئی انسانی خوبی مل ہی جائے گی۔ دیندار اور بے دین کا فرق یوں سمجھئے کہ دین کا صحیح پابند اس تناور درخت کے مانند ہے جو پھل پھول پتوں سے لدا جنت نظر بنا ہوا اور بے دین اس ناکارہ درخت کی طرح ہے جو پھل پھول پتی سے محروم خشک ہونے کے قریب پہونچ گیا ہو اگر دو چار پتیاں ایک آدھ پھل پھول نظر آئیں بھی تو سوائے اس کے کہ درختوں کی برادری میں گنا جائے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں حاصل ہوسکتا۔ معصوم علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ حضور دنیا کے دوسرے ادیان میں بھی اسلام سے ملتی جلتی اچھی باتیں پائی جاتی ہیں تو جواب ملا ایسا ضرور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بانیان مذہب نے دین الٰہی سے کچھ باتیں لے کر اپنی بہت سی باتیں ان میں ملادی ہیں۔ (ملاوٹ اب انسانی اخلاق بن گیا ہے) ہر مال میں ملاوٹ۔ تعلقات میں منافقت کی ملاوٹ عام ہے تو دین کیوں اس وبا سے محفوظ رہ جاتا اگر دین خالص رہتا تو لاکھوں لوگ دین کے نام سے اپنی دوکان کیسے چمکاتے۔

یہ صحیح ہے کہ اخلاق کسی شخص یا قوم یا نسل کی جاگیر نہیں ہے بلکہ جو بھی چاہے اس سعادت کو حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن بہت بڑا دھوکا ہے کہ ہر شخص ضابطہ اخلاق کی تدوین بھی کرسکتا ہے۔ بیشک ہر درخت سرسبز و شاداب ہوسکتا ہے مگر شجر کاری ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اسی طرح ہر انسان آدمی بن سکتا ہے مگر آدمیت کا گلشن کسی باغبان (الٰہی قانون) کا محتاج ہے جو روش کو بگڑنے نہ دے خود رو درخت بھی ہوتے ہیں۔ انسان اپنے لئے قانون بھی بناسکتے ہیں مگر جنگل جنگل ہے گلشن گلشن ہے بغیر محافظ انسانی اخلاق کے مفید اور نازک پودے بری عادات کے جھاڑ جھنکاڑ میں اس طرح گم ہوجاتے ہیں کہ ایک شرابی یا ایک زانی یا ایک گویا یا ایک چور خوشی سے برے کام کرتا ہے۔ ایک زنانہ موچنے سے بال کی کھونٹیاں اس خوشی سے چنتا ہے جیسے وہ بڑے ثواب کا کام انجام دے رہا ہے عورت کے لباس اور خاص زیور سے آراستہ ہوکر بخیال خود وہ عورت ہی بن جاتا ہے۔ جائزہ لیجئے تو آج کتنی برائیاں انسان کے نصاب حیات میں داخل ہیں جن کو حسن اخلاق میں شمار کرلیا گیا ہے یہ سب

خداناشناسی اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا نتیجہ ہے۔ انسان اگر اللہ کے ضابطہ اخلاق پر چلتا اور دین الٰہی اختیار کرتا تو بری عادتیں طبیعت ثانیہ نہ بنتی اور ناپاک ارادے پورے نہ ہوتے اس پر بھی اگر کوئی شخص دین کے باغیوں کی تعریف کرتا ہے تو عقل و دانش بباید گریست بتلایئے کہ ایک ایسا شخص جو چوری کر کے، ڈاکہ ڈال کر روپیہ اکٹھا کرے پھر اس روپیہ سے بیوہ، یتیموں، فقیروں کی امداد کرے اسپتال خیرات خانے اسکول و کالج کھولے کیا یہ نیکی کے کام جو جرم کی بنیاد پر انجام دیئے گئے جائز ہوں گے! دین تو کیا دنیا کے قانون میں بھی ایسا شخص مجرم ہی قرار پائے گا ایسے آدمی کے ہاتھ چومنے کے بجائے یقیناً کاٹنے کے قابل ہوں گے اس لئے کہ اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ضابطۂ اخلاق کی توہین کی معلوم ہوا کہ قانون فطرت پر چلنا وفاداری اور قانون کا اپنے ہاتھ میں لینا بغاوت ہے اللہ کی طرف سے جو دین کے رہبر آئے انہوں نے اپنے کردار کو پیش کر کے سارے اخلاقی نشیب وفراز سے دنیا کو واقف کر دیا بہت ممکن ہے کہ اس مقام پر یہ نکتہ اٹھایا جائے کہ جب اسلام مکمل ضابطہ اخلاق ہے تو پھر امت مسلمہ بقول پیغمبرؐ تہتر فرقوں میں کیونکہ بٹ گئی اس کا جواب اسی ارشاد میں ہے کہ ان میں ایک ہی فرقہ برحق ہوگا باقی خلاف حق ہوں گے یعنی میں نے ایک ہی طریقہ چھوڑا ہے اس پر باقی فرقے اسلام کے نام پر بنائے جائیں گے۔ آج انہیں باطل فرقوں کی بدولت اسلام کے دشمنوں کو کیا کیا کچھ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا حب کہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام رسول اکرمؐ کے اخلاق سے پھیلا۔

بعثت سے ۱۳ سال تک کی زندگی جو حضورؐ کی مکہ میں بسر ہوئی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک مرتبہ بھی آپ نے تلوار اٹھائی ہرگز نہیں ہر طرح کی اذیتیں کفار سے پہونچیں غم اٹھائے خون جگر پیا اور بجائے تلوار کے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرتے رہے کہ میرے مالک اس قوم کی ہدایت فرما۔ یہ میرے مرتبہ سے واقف نہیں ہیں مدینہ میں جب ہجرت کر کے سکونت پذیر ہوئے تو انصار کی طاقت ہاتھ لگی لیکن اس اضافہ طاقت کے بعد بھی یہ نہ سوچا کہ چلو چل کر دشمنوں سے بدلہ لیں برخلاف اس کے دشمن اب بھی لڑنے کی فکر میں تھے۔ آخرکار لڑنے کے لئے مدینہ پہونچ ہی گئے۔ کیا حضور اکرمؐ اب بھی حفاظت خود اختیاری سے کام نہ لیتے۔ معلوم ہوا کہ رسول کا جہاد مدافعانہ جہاد تھا۔ لیکن آپ کے بعد بنام جہاد جو چڑھ چڑھ کر مسلمانوں نے لڑائیاں لڑیں اور فتوحات حاصل کیں۔ غنیمت ہاتھ لگی روز بروز سلطنت میں توسیع ہونے لگی تو اس نے دشمن کی زبان سے کہلایا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ قولوا لا الہ الا

الله تفلحوا کو تلوار کہیئے یا سپر یہی رسول کے ہاتھ میں ہمیشہ رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے اعلان نبوت سے پہلے ہی اپنے اخلاق کا کلمہ دشمنوں سے پڑھوالیا سب نے یک زبان ہوکر صادق و امین کہا۔ جب بعثت کے پہلے دن آپ نے صدق و امانت کا اقرار لیا اس کے بعد آپ نے پورے تبلیغی عہد میں اخلاق کی حدیں اپنے کردار سے معین کیں۔ محاسن اخلاق نبی ایک دو نہیں ہزاروں ہیں اگر فہرست لکھی جائے تو اس کے لئے صفحات درکار ہیں حقیقت یہ ہے کہ علماء نے جو نبی کے محاسن اخلاق شمار کیے وہ اپنے سمجھنے کے لئے اپنی سمجھ بھر ورنہ خلق رسول کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا امیرالمؤمنین جیسے عارف سے جب کسی نے سوال کیا آپ اخلاق نبوی بیان کریں تو آپ نے فرمایا تو پہلے دنیا کی چیزوں کو گنوادے اس نے حیرت سے جواب دیا یہ کہاں ممکن ہے کہ میں تمام دنیا کی چیزوں کو شمار کرسکوں آپ نے فرمایا تم دنیا کی چیزوں کے شمار کرنے سے عاجز ہو حالانکہ خدا نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ دنیا کی پونجی مختصر ہے۔ (قل متاع الدنیا قلیل) تو قلیل کے بیان کرنے سے معذور ہے اور مجھ سے حضورؐ کے اخلاق کو بیان کرنے کی خواہش کرتا ہے حالانکہ اس کو اللہ نے عظیم کہا ہے (انک لعلی خلق عظیم) انسان کے اخلاق تو ہمیشہ سے ظہور میں آتے رہے لیکن کسی خلق کی آخری حد کیا ہے اس کا پتہ صرف رسول اکرمؐ کی سیرت اور کردار سے چلا مثلاً دو چار واقعات ذیل میں ہم نقل کرتے ہیں۔

۱۔ بعثت سے پہلے جب کعبہ کی عمارت کی تجدید کاری ہوئی اور وہ موقع آیا کہ حجر اسود اپنے مقام پر نصب کیا جائے تو اس عزت و سعادت کے حاصل کرنے کے لئے ہر قبیلہ آگے بڑھا عرب کی جاہلی جنگجو ذہنیت خوشی سے یہ کب گوارا کرسکتی تھی کہ دوسرے بھائی کے حق میں خود دستبردار ہوجائے نتیجہ میں نزاع بڑھا۔ لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہوگئے قریب تھا کہ تلوار سے حصہ بٹنے لگے آخر حکم پر سب کا اتفاق ہوا وہ بھی تغافل سے کہ جو پہلا شخص نمودار ہو ہمارے درمیان حکم بنے گا۔ خدائی انتظام کہ حضورؐ سامنے سے آتے دکھائی دیئے اور حکم قرار پائے حضور اکرمؐ نے نہایت خوبصورتی سے سنگین معاملہ کو رفع دفع کیا چادر بچھائی، حجر اسود رکھا اور تمام قبیلوں کو آواز دی کہ اپنے اپنے سرداروں کو بھیجو سرداران قبائل آئے سب نے چادر میں ہاتھ لگایا ایک ایک گوشہ تھام کر اٹھایا جب نصب کرنے کی جگہ تک چادر پہونچی تو آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کردیا جہاں خون کی ندی بہنے والی تھی وہاں حضورؐ کے بدولت کسی کی تکسیر تک نہ پھوٹی سب کی بات بھی رہ گئی اور حجر اسود

کی حرمت بھی کم نہ ہونے پائی قبائلی جذبات جو شعلہ بن رہے تھے ان کو شبنم بنادیا۔ یہ ضرور طے ہوا تھا کہ جو شخص پہلے نظر آئے گا اس کو حکم بنائیں گے مگر جب پہلے شخص حضور نکلے تو سب کی زبان سے برجستہ نکلا اس سے عمدہ حسن اتفاق ممکن نہیں۔ آپ پر سب کو اتفاق تھا اور کسی کو احساس نہ ہوا کہ آپ بھی کسی قبیلہ کی فرد ہیں بلکہ سب نے آپ کو اپنا سمجھا سن والوں کی موجودگی میں ایک کمسن پر سب کی نظر جمی اللہ اللہ حکمت، عدالت اور فراست کس پیمانہ پر تھی کہ ایک چادر سے سب کی مراد وابستہ کردی کسی ایک کا ہاتھ حجر اسود میں نہ لگنے پایا خود اٹھایا خود رکھا اللہ کا کام کیا مگر اس طرح کہ سب کا نام ہوگیا۔

۲- عفو و درگذر کی دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی مثال مل سکتی ہے کہ ایک دشمن عورت گھر کا کوڑا کرکٹ جمع کرکے روز اس انتظار میں بیٹھتی تھی کہ جب آپ ادھر سے گذریں تو سر پر کوڑا ڈالوں اس کے باوجود آپ حسب معمول اسی طرف سے گذرتے رہے حلیم سے حلیم انسان ہوتا تو دو ایک مرتبہ صبر کرنے کے بعد راستہ چھوڑ دیتا لیکن آپ شرارت کے کس بل دیکھتے رہے جانتے تھے کہ دشمن کہاں پر مار کھائے گا اور شرارت کا گھوڑا کہاں پر رام ہوگا۔ آخر ایک دن جب راہ سے گذرتے ہوئے سر پر کوڑا نہ پڑا تو وہیں ٹھہر گئے دوسرا کوئی ہوتا تو کوڑا نہ آنے پر خوش ہوتا اور خوش خوش گذر جاتا لیکن حضور نے پوچھا کہ وہ بڑھیا کیا ہوئی جو سر پر کوڑا پھینکتی تھی لوگوں نے بتایا کہ وہ گھر میں بیمار پڑی ہے۔ یہ خوش ہونے کا مقام تھا کہ دشمن تکلیف میں مبتلا ہوا اگر حضورؐ کے علاوہ دنیا کا کوئی اور شخص ہوتا تو شکر بجالاتا کہ موذی اپنی سزا کو پہونچا۔ لیکن آپ نے اس کے مکان کا رخ کیا عداوت کے قصد سے نہیں بلکہ عیادت کے ارادے سے دروازہ پر پہونچ کر دستک دی۔ آواز آئی کون؟ فرمایا محمدؐ۔ چور کا دل تھا نام سنتے ہی اس نے کہا اب ایسے وقت مجھ سے بدلہ لینے آئے ہو کہ بیمار پڑی ہوں۔ مجسمہ خُلق نے جواب دیا نہیں بدلہ نہیں احوال پرسی کے لئے آیا ہوں۔ اس فقرہ نے دشمنی کی شہ رگ کاٹ دی سوچ میں پڑگئی کہاں میری گستاخی اور کہاں یہ ہمدردی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا رسولؐ گھر میں پہونچے مزاج پرسی کی آپ نے فرمایا طبیب کی ضرورت ہو تو اسے بلالاؤں دوا چاہیے تو دوا لادوں۔ اگر تیماردار مطلوب ہو تو خود حاضر ہوں۔ یہ مہربانی رافت و رحمت کے جملے مردہ روح میں جان پھونک رہے تھے۔ شرمندگی کا پسینہ برابر پونچھ رہی تھی اور ضمیر دھلتا جارہا تھا۔ ایک مرتبہ بیساختہ زبان سے نکلا آپ بیشک خدا کے سچے رسول ہیں مجھ گستاخ کو کلمہ پڑھائیں۔ لیجئے بات دشمنی سے شروع ہوکر

دوستی پر تمام ہوئی کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ اس ایک واقعہ سے عفو حلم ضبط استقلال غریب نوازی تبلیغ و ہدایت و حکمت کے کتنے نقش ایک ساتھ ابھرے جو تب تک باقی رہیں گے جب تک احساس کی دنیا باقی ہے۔

۳- حاتم طائی کی لڑکی اپنے قبیلہ کے ساتھ قید ہو کر آئی ہے حضور اکرمؐ سے کہتی ہے میں قوم کے سردار کی بیٹی ہوں میرا باپ فریادرس، خطاپوش، بھوکے کو شکم سیر کرنے والا اور غریبوں کا خبر گیر تھا جو پہلے سلام کرنے والا تھا۔ جس نے اپنے در سے کسی حاجتمند کو کبھی واپس نہیں کیا اگر مناسب ہو تو میرے باپ کی خوبیوں کی بناء پر میرے ساتھ مراعات فرمائیں اور مجھے آپ عرب کے قبیلوں میں رسوا ہونے سے بچالیں حضور اکرمؐ نے سن کر فرمایا یہ مؤمن کی خوبیاں ہیں جو تو نے اپنے باپ کے لئے بیان کی ہیں اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے واسطے رحمت طلب کرتے پھر حکم دیا اسے آزاد کر دو اس لئے کہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو عزیز رکھتا تھا اور اللہ خوبیوں کو دوست رکھتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کافر میں بھی اخلاقی خوبیاں ہیں تو وہ قابل قدر ہے۔ پھر اگر مومن اس زیور سے آراستہ ہو تو اس کی خدا و رسول کے سامنے کتنی زیادہ عزت ہوگی دوسرے جب کافر باپ کی بیٹی باپ کے حق میں آزادی حاصل کرتی ہے تو مومن کی اولاد خوش اعمال نیک معاش و معاد ماں باپ سے کیونکر نہ فیضیاب ہوگی۔ حضور نے اخلاق کے نام پر حاتم طائی کی لڑکی کو چھوڑ کر بتایا کہ اسلام صرف اخلاق پسند نہیں بلکہ عین اخلاق ہے اس امر کی طرف بھی واقعہ کا اشارہ ہے کہ مومن کی اصلی خوبیاں کافروں میں منتقل ہو جاتی ہیں اور وہ محض نقالی سے نیکی کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن ان کا یہ فائدہ دنیا تک ہی محدود ہوتا ہے اگر حاتم مومن ہوتا تو دعا کا مستحق ہو کر آخرت کا بھی فائدہ اٹھاتا اوپر کی مثالیں عدالت، حکمت، عفت اور ان سے پیدا ہونے والے شعبوں کی تھیں۔

آخر میں شجاعت کی انوکھی صورت ملاحظہ فرمائیں: اسلام میں حضرت علیؑ سے شجاع تر کوئی نہیں گذرا ہمیشہ میدان آپ کے ہاتھ رہا آپ کے نام سے شجاعان عرب کے زہرے آب آب ہوتے تھے کفار کے دلوں پر ہیبت بیٹھی تھی آج تک نام میں یہ تاثیر ہے کہ اگر زبان پر آجاتا ہے تو بے حس انسان میں بھی حرارت و حرکت پیدا ہو جاتی ہے نعرۂ حیدری ہزار بموں کی طاقت رکھتا ہے۔ ایسا بہادر اور شجاع جس نے تلوار سے بھی مظاہرہ شجاعت کیا اور ننگی تلواروں میں بستر رسول پر سو کر بھی مظاہرہ شجاعت کیا ایسی مسلم ہستی کا یہ فرمودہ ہے کہ جب جنگ خوفناک شکل اختیار کر لیتی اور اس کی آگ

سب کو اپنے شعلوں میں گھیر لیتی ایک لشکر دوسرے لشکر سے گتھ جاتے تھے تو ہم رسول کی پناہ لیتے تھے۔ اس وقت حضورؐ دشمن سے نزدیک تر ہوتے تھے۔ اس شجاعت کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کیا اندازہ ہوسکتا ہے کہ علی جیسے اشجع الناس کو جب پناہ لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ حضور اکرمؐ کو اپنی پناہ گاہ قرار دیتے تھے یہی نہیں بلکہ رسول کی بے خوفی اس حد تک پہونچی تھی کہ خوفناک صورت میں آپ دشمن سے زیادہ قریب ہوتے جاتے تھے صفت یہ کہ کسی جنگ میں نہ آپ نے تلوار چلائی نہ کسی کو قتل کیا امیرالمؤمنین تو ذوالفقار سے جنگ فرماتے تھے۔ مگر حضور کو اسلحہ سے بھی کوئی غرض نہ تھی پھر کس قیامت کی شجاعت تھی کہ دشمن کے سامنے ڈٹے رہتے تھے دشمن سے قریب ہونا سب سے بڑے شجاع ہونے کی دلیل ہے دشمن ظاہر ہے سب سے زیادہ آپ کی جان کے خواستگار تھے مگر آپ کا اسلحہ سے بے نیاز ہوکر دشمن سے قریب تر ہونا آپ کی بے مثال شجاعت کی دلیل ہے اور سامنے ہوتے ہوئے بلکہ قریب تر ہونے کے باوجود دشمن ہمیشہ عاجز و درماندہ بے دست و پا رہے اور کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ان مثالوں سے رسول کا جامع اخلاق ہونا واضح ہے اور اقرار کرنا ہوگا کہ محاسن و مکارم اخلاق کو حضور نے اپنے کردار سے تکمیل کی حد تک پہونچایا اسلام ہی وہ ضابطہ اخلاق ہے جس پر اگر رسول کی طرح کوئی گامزن ہو اور آپ کے اسوہ اور سیرت پر عمل کرلے تو وہ منصب دار نبوت تو نہیں بن سکتا نہ اسے خلافت الہیہ نصیب ہوسکتی ہے البتہ ایمان کے دس درجوں تک ضرور پہونچ سکتا ہے۔ نو درجے آٹھ درجے کا مؤمن ضرور بن سکتا ہے جناب سلمان و ابوذر عمار، مقداد منصبدار نہ تھے۔ لیکن سراج منیر میں سے انہوں نے یوں کسب ضیا کی کہ اخلاق رسول کا نمونہ بن گئے اور اہل بیت میں شمار کئے جانے لگے۔ ع:

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

قرآن کریم معجزۂ نبوت ہے

مولانا سید حسن مہدی رضوی

جس طرح حضور نبی کریمؐ کی نبوت و رسالت قوم، قبیلے، رنگ و نسل، اور جغرافیائی حدوں سے بالاتر ہے اسی طریقے سے نبی آخرالزمان کو جو کتاب دی گئی وہ بھی کسی قوم یا خطہ ارض سے مخصوص نہیں بلکہ اس کی حیثیت بھی آفاقی ہے۔ جیسا کہ خود اس کا بیان ہے: "تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا"[1] (خدا) بہت بابرکت ہے جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر قرآن نازل کیا۔ تاکہ سارے جہان کے لئے (خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہو۔

اور جس طرح مرسل اعظم کی نبوت و رسالت کا تعلق کسی خاص انسانی شعبۂ زندگی سے مخصوص نہیں ہے اسی طرح حضورؐ کی کتاب کے احکام و ضوابط بھی انسانی زندگی کے کسی خاص شعبہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے اندر آپ کو فکر و عمل کا ایسا نظام اور انسانی زندگی سے متعلق ایسا لائحہ عمل ملے گا جس سے پوری نوع انسانی مستفید ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید اور اس کے پیغمبر حضور سرور کائنات کی نبوت و رسالت کا یہی وہ طرۂ امتیاز ہے جو پچھلی تمام آسمانی کتابوں اور نبوتوں کے مقابلہ میں ان کو ایک امتیازی شان کا حامل قرار دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پچھلی تمام نبوتیں اور کتابیں ایک محدود وقت اور زمانہ کے لئے تھیں۔ حضور سرور کائناتؐ کی نبوت و رسالت اور ان کی لائی ہوئی کتاب ان دونوں نے گذشتہ تمام نبوتوں، اور کتابوں پر خط نسخ کھینچ دیا اور خود قیامت کی صبح تک باقی رہیں گی۔ ان پر نہ ماضی کی کہنگی ہی طاری ہوسکی اور نہ مستقبل ان کے خطۂ اقتدار سے باہر ہوسکتا ہے۔

دنیای بشریت کی ہدایت کے لئے جناب آدمؑ سے جس الٰہی اور ربانی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اور جو اپنی اساسی اور بنیادی تعلیمات میں یکساں رہنے کے باوجود مزاج انسانی کے تغیر اور تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت جس میں فروعی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں اب وہ ترقی کی اس

۱۔ پ۱۸، ع ۱۶، سورہ فرقان

منزل پر پہونچ گیا تھا جس کے بعد اس کے آگے بڑھنے کی قطعی کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے اسی منزل پر نبوت کو ختم کر کے حضورؐ سرور کائنات کو ''خاتم النبیین'' قرار دیا گیا۔

ضرورت تھی کہ ایسے نبی کو ایسی کتاب بھی عنایت کی جائے جو اپنی لازوال تعلیمات اور محکم و مضبوط قوانین وضوابط میں اتنی وسعت رکھتی ہو کہ جب تک دنیا میں خاتم النبیین کی نبوت باقی رہے وہ کتاب بھی اپنے اسی اعجازانہ شان کے ساتھ موجود رہے۔

دماغوں سے عصبیت اور جمود کے کیڑے اگر نکال دیئے جائیں تو اس امر کا سمجھ لینا دشوار نہ ہوگا کہ قرآن مجید پچھلی کتابوں کا حریف نہیں ہے۔ اور نہ اس کا لانے والا پیغمبر، انبیاء ماسبق کا دشمن ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ انبیاء اور اس کی کتابوں پر ان کے نام نہاد ماننے اور چاہنے والوں نے ''تحریفات'' کے جو پردے ڈال دیئے تھے۔ ''قرآن مجید'' اور اس کے ''نبی'' نے انہیں پردوں کو اپنی تعلیمات اور اپنے عملی کردار سے چاک کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح نبی آخرالزماںؐ کوئی نیا دین نہیں لائے تھے بلکہ ان کا دین وہی تھا جو آدمؑ ونوحؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ کا دین تھا۔ قرآن مجید کے احکام وضوابط بھی اسی طرح منجانب اللہ ہیں جس طرح پچھلی آسمانی کتابوں کی تعلیمات تھی۔ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے:

و انزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیه من الکتاب و مهیمنا علیه۔[1]

اور (اے رسول) ہم نے تم پر بھی برحق کتاب نازل فرمائی جو کتاب (اس کے پہلے سے) اس کے وقت میں موجود ہے۔ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان بھی ہے۔

وہ لوگ غلطی کرتے ہیں اور انہیں کبھی صراط مستقیم کا پتہ نہیں مل سکتا۔ جو سرور کائناتؐ کو تاریخ اور قرآن مجید کو صحابہ و تابعین سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ حضور ختم المرسلینؐ کو قرآن و اہل بیت اور قرآن کو حضورؐ اور اہل بیتؑ سے سمجھا جائے۔

نبی کریم کو اگر قرآن و اہل بیت سے سمجھا جاتا تو وہ نبی کا ویسا ہی تعارف کراتے جیسے وہ تھے یعنی نبی معصوم تھے۔ پاک اصلاب اور پاکیزہ ارحام ان کا مستقر رہا، وہ ایسے عالم علم لدنی تھے جنہوں نے قرآن جیسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کردی۔ اسی طرح اگر قرآن کو نبی و اہل بیت سے سمجھایا گیا ہوتا تو نہ آج اسلام میں تہتر فرقے ہوتے اور نہ ایک قرآن کی تہتر ہزار تفسیریں ہوتیں۔

---

[1] پ ۶، ع ۱۱، سورہ مائدہ

نبیؐ کے دو معجزے

حضورؐ سرورِ کائنات نے تبلیغ کی سنگلاخ وادی میں قدم رکھا تو آپ کے پاس نہ تخت و تاج تھا اور نہ دولت و ثروت نہ جاہ و حشمت تھی اور نہ ملک عادل، نہ عسکری نظام تھا اور نہ پریس کی طاقت، بلکہ ان کے پاس دو گرانقدر چیزوں کے علاوہ کچھ نہ تھا ایک ان کے اہل بیت اور دوسری گرانقدر چیز تھی ''قرآن'' اسی لئے آپ نے امت کو بھی ہدایت فرمائی کہ اگر تمہیں زحمتوں سے بچنا اور مشکلات میں پھنسنا نہ ہو تو میں بتائے جاتا ہوں''۔

"انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا بعدی و انهما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض"۔

''میں تم لوگوں کے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ ے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب (قرآن) دوسرے اہلِ بیتِ عترت۔ اگر تم لوگ ان کے دامن سے متمسک رہے تو میرے بعد ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور یہ دونوں چیزیں (قرآن و اہل بیت) بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوں گی۔ یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس وارد ہوں''۔

جب تک قرآن سے کام لیا جاسکتا تھا اس وقت تک نبوت اپنے اسی صامت معجزہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتی رہتی۔ لیکن جب یہ محسوس کیا جاتا کہ قرآنی اعجاز کے باوجود فریق مخالف ہتھیار نہیں ڈالتا تو پھر ناطق معجزہ (اہل بیتؑ) بھی دشمن کے سامنے پیش کردیے جاتے۔ اس بیان کے ثبوت کے لئے مباہلہ کا واقعہ کافی ہے۔

قرآن افضل یا اہل بیتؑ

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قرآن افضل ہے۔ یا اہل بیتؑ؟ دوسری تمام باتوں سے قطع نظر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں قرآن مجید سے دشمن اسلام مرعوب نہیں ہوتا تھا وہاں اہلِ بیت اس کی کمک کو لائے جاتے تھے۔ جیسا کہ میں نے ابھی مباہلہ کا واقعہ یاد دلایا۔

نصاریٰ نجران آیات قرآن مجید، حضور سرورِ کائنات کی زبان فیض ترجمان سے مسلسل سنتے رہے۔ لیکن جو وہ گھر سے عیسیٰؑ کے متعلق اپنا نظریہ لے کر آئے تھے اسی پر آخری وقت تک باقی رہے۔ بالآخر قرآن کی زبانی خدا کو کہنا پڑا۔ ''آپ ان سے مباہلہ کرلیں''۔ ہم تو جب جانتے کہ مباہلہ صرف

قرآن مجید کی امداد و استعانت حاصل کر کے کامیاب کرلیا جاتا۔

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مباہلہ میں رسولؐ اکرم اپنے دوسرے ناطق معجزہ (اہل بیتؑ) کو لے کر آئے۔ تب مباہلہ کامیاب ہوا۔ اور وہ نصاریٰ نجران جس نے مسجد میں نبی سے مسلسل مباحثہ کیا تھا اور جو قرآنی آیات سنتے رہنے کے باوجود اپنی ضد پر باقی تھے۔ انہوں نے میدانِ مباہلہ میں زندہ معجزوں کی صورتوں کو دیکھتے ہی اپنی شکست کا اعلان کردیا۔ اب صاحبان عقل بتائیں کہ "قرآن افضل یا اہلِ بیتؑ؟"

لڑائی تھی قرآن کے بیان پر یعنی عیسائی یہ کہہ رہے تھے کہ "ہماری کتاب توریت سچی ہے۔ جو عیسیٰ کو ابن اللہ کہتی ہے"۔ اور نبی یہ فرما رہے تھے کہ "قرآن سچا ہے جو عیسیٰ کو روح اللہ کہتا ہے"۔ فیصلہ نہیں ہوسکا، جب تک اہلِ بیتؑ درمیان میں نہیں آئے۔ تو نبی کے جس معجزے (اہلِ بیتؑ) نے نبی کے صامت معجزہ (قرآن) کی صداقت کو اپنی روحانیت سے بچایا ہو وہ بھلا قرآن سے افضل کیوں نہ ہوں گے؟"۔

میرا موضوع چونکہ قرآن مجید ہے لہٰذا اس وقت اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

قرآن مجید معجزہ نبوت ہے اس کے لئے خود اس کا اپنا بیان ہے"۔

"اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یُتلیٰ علیھم"۔[1]

کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا جو ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے۔

معجزہ کی تعریف

معجزہ کی تعریف علماء نے کی ہے:

ھو الامر الخارق العادۃ المطابق للدعویٰ المقرون بالتحدی المتعذر علی الخلق عن الاتیان بمثلہ۔

معجزہ اس غیر معمولی اور مافوق الفطرت فعل کا نام ہے جو دعویٰ کے ساتھ ساتھ تحدی اور چیلنج کے طور پر پیش کیا جائے اور جس کا جواب لانے سے لوگ معذور اور عاجز ہوں۔

قرآن مجید نے جب اپنے معجزہ نبوت ہونے کا اعلان کیا تو فصحاء و بلغاء عرب اس کا جواب لانے سے واقعی قاصر رہے۔ دنیا کی جملہ کتابوں نیز سابقہ آسمانی کتب اور صحف انبیاء کسی کو بھی وہ درجہ و مرتبہ حاصل نہیں جو قرآن مجید کو حاصل ہے۔

۱- پ ۲۱، ع ۱، سورہ عنکبوت

یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ معجزہ، جادو کو نہیں کہتے اس لئے کہ تحدی اور چیلنج کے ساتھ آج تک کسی جادوگر نے کسی پر جادو نہیں کیا۔ ایک موقع یقیناً تاریخ میں ایسا آیا تھا جہاں تحدی اور چیلنج کی ایک صورت پیدا ہوگئی تھی لیکن وہیں پر تمام جادوگروں کا سحر باطل ہوگیا۔ اور وہ مقام ہے فرعون کا دربار، جہاں جادوگروں اور ایک معجز نما شئی میں مقابلہ ہوا تھا۔ نتیجہ کے طور پر ساری دنیا کو معلوم ہے کہ عصای موسیٰ کے معجزہ نے ساحران دربار فرعونی کے حواس مختل کر دیئے اور ان کا سارا جادو چشم زدن میں غائب ہوگیا۔ نہ صرف اتنا بلکہ دربار فرعون کے جملہ ساحرین فرعون کا ساتھ چھوڑ کر اور اس کی خونخوار دھمکیوں سے لاپرواہ ہوکر جناب موسیٰ کی طرف آ گئے۔

"آمنا برب العالمین رب موسیٰ و ھارون"۔

سحر اور معجزہ کے درمیان ہونے والے مقابلہ میں اعجاز کی فتح کا کھلا ہوا اعلان ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سحر میں بقا و دوام کی طاقت نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے معجزہ اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک معجز نما کی خواہش ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا بھی کارآمد ہوگا کہ انبیاء ماسبق کے معجزات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ جب تک معجز نما باقی رہا اسی وقت تک اس کا اعجاز بھی باقی رہا۔ لیکن معجز نما کے ختم ہونے کے بعد وہ اعجاز بھی ختم ہوگیا۔ مگر حضور خاتم النبیینؐ کے معجزہ کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ پیغمبر اکرمؐ خداوند عالم کی طرف سے جو دو صامت و ناطق معجزے یعنی قرآن و اہل بیت لائے تھے آج بھی ان دونوں کا وجود باقی ہے جب کہ معجز نما حیات ظاہری کے ۶۳ سال پورے کر کے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوگیا۔

قرآن مجید نے کسی ایک خاص نسل، قوم، جماعت گروہ یا مخصوص زمان و مکان کے لوگوں کے سامنے اپنے جواب لانے کا چیلنج نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس زمین پر جب تک نسل انس و جن کا وجود رہے گا اس وقت تک فصاحت و بلاغت کے میدان میں قرآن مجید اپنی اعجازی شان کا کوس "لمن الملک" بجاتا رہے گا"۔

آج بھی اسی اعجازانہ شان و شوکت کے ساتھ قرآن کے باقی رہنے کی غالباً یہ وجہ ہے کہ بظاہر کوئی مقابلہ کرنے والا نہ سہی، لیکن یہ تو نظام قدرت ہے، مبادا کبھی کوئی پیدا ہوجائے اور وہ کہہ بیٹھے کہ اگر قرآن آج چیلنج کرتا تو ہم اس کا جواب دے دیتے تو پھر کیا ہوتا۔ اسی لئے قرآن اسی شان سے آج بھی مقابلہ کو تیار ہے اسی وجہ سے عترت کو بھی ساتھ ساتھ باقی رکھا گیا تا کہ اگر کوئی تشنہ

ہدایت آج خلوص سے سیرابی کے لئے بے تاب ہوتو یہ کہنے میں نہ آئے کہ اب تو چشمہ ہی نہ رہا۔ یہ ہے نظامِ قدرت کہ وہ اپنے عدل و حکمت کے تحفظ کے لئے سامان مہیا رکھتا ہے۔ اب کوئی فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ بہرحال اس کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔

قرآن کا کھلا چیلنج

قرآن مجید نے پوری دنیائے جن و انس کے سامنے تین بار چیلنج پیش کیا۔ پہلے تو قرآن نے پورے قرآن کا جواب مانگا''۔

۱- قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یا توآ بمثل هذا القرآن لایاتون بمثله و لوکان بعضهم لبعض ظهیرا۔[۱]

(اے رسول) تم کہہ دو کہ اگر (ساری دنیا، جہان کے) آدمی اور جن اس بات پر اکٹھا ہوں کہ اس قرآن کا مثل لے کر آئیں تو (غیر ممکن) اس کے برابر نہیں لاسکتے اگرچہ (اس کوشش میں) ایک کا ایک مددگار بھی بن جائے۔

اور جب اس کا کوئی مقابلہ کرنے کو تیار نہ ہوا تو قرآن نے اپنی تحدی میں بہت زیادہ تخفیف کرتے ہوئے صرف دس ہی سوالوں کے جواب طلب کئے۔

۲- ام یقولون افتراه قل فاتوا بعشر سورٍ مثله مفتریات وادعوا من استطعتم من دون الله ان کنتم صادقین۔[۲]

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (تم) نے اس (قرآن کو) اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے تو تم (ان سے صاف صاف) کہہ دو کہ اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسی دس سورتوں کو اپنی طرف سے گڑھ کے لے آؤ اور خدا کے سوا جس جس کو تمہیں بلاتے بن پڑے مدد کے واسطے بلالو۔

لیکن جب ظلوم و جہول مخلوق کی طرف سے سوائے عاجزی و درماندگی کے کوئی جواب نہ دیا گیا تو قرآن نے ان لوگوں کے کس بل کا بھانڈہ پھوڑنے کے لئے کہا کچھ نہیں تو ایک ہی سورہ کا جواب لاؤ''۔

۳- وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من مثله، و ادعوا شهداء کم من دون الله ان کنتم صادقین۔[۳]

اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کیا ہے شک میں پڑے ہو پس اگر

۱- پ ۱۵، سورہ اسراء، آیت ۸۸ ۲- پ ۱۲، ع ۲، سورہ ھود ۳- پ ۱، ع ۳، سورہ بقرہ

تم سچے ہو تو تم (بھی) ایک ایسا ہی سورہ بنالو۔ اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو (بھی) بلالو۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ آج تک قرآن مجید کے ایک سورہ تو کیا ایک لفظ کا بھی جواب نہ دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو لطیفہ سے خالی نہیں۔

چار سر پھرے

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت کا سب سے بڑا مشہور اور فصیح و بلیغ ابن ابی العوجاء مع اپنے چار ساتھیوں ابو شاکر دیصانی، ابن مقنع اور عبدالملک جو فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار تھے خانہ کعبہ کے پاس جمع ہوکر سب نے آپس میں مشورہ اور عہد و پیمان کیا کہ قرآن کے چار حصے کرکے ایک ایک حصہ کا ہر ایک شخص سال آئندہ جواب لکھ کر لائے اور پھر اس کی ترتیب دے دی جائے گی۔ چنانچہ دوسرے سال وہ چاروں مقام ابراہیم میں آکر جمع ہوئے تو ابن ابی العوجاء نے کہا کہ میں قرآن کی اس آیت: "فلما استیأسوا منه خلصوا نجیا"۔ پر سال بھر غور کرتا رہا مگر اس کا جواب نہ بنا سکا۔

عبدالملک نے کہا کہ میں "ان الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابا و لو اجتمعوا له" پر غور و فکر کرتا رہا۔ لیکن مجھ سے اس آیت کا معارضہ نہ ہو سکا۔

ابو شاکر نے کہا کہ میں "لوکان فیهما آلهة الا الله لفسدتا۔ پر سال بھر غور و خوض کرتا رہا مگر اس کا جواب مجھ سے ممکن نہ ہوا۔

ابن مقنع نے کہا کہ میں قرآن کی اس آیت "و قیل یا ارض ابلعی ماء ک و یا سماء اقلعی و غیض الماء و قضی الامر" کے متعلق سال بھر سوچتا رہا۔ لیکن مجھ سے اس کا جواب نہ ہو سکا۔

یہ چاروں ایک جگہ جمع ہوکر اپنی عاجزی اور مایوسی کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ ادھر سے امام جعفر صادق کا گزر ہوا۔ ان کے قصہ سے آگاہ ہوکر اور ان کی مایوسی کو دیکھ کر اعجاز قرآن کے متعلق اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرمائی:

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لایاتون بمثله و لوکان بعضهم لبعض ظهیراً

چار سر پھرے اور ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو: ایک مرتبہ چار شریر الطبع لوگوں نے جن کی زباندانی پر عرب کو بڑا ناز تھا بڑے غور و فکر اور جستجو کے بعد قرآن میں چار لفظوں کو تلاش کیا۔ ان کو غیر فصیح و بلیغ

قرار دیا۔

۱- ھزوا ۲- کبار ۳- لشئٌ ۴- عجاب

یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان چاروں الفاظ کے غیر فصیح و بلیغ اور زبان ومحاورہ عرب کے خلاف ہونے پر آپ سے بحث کرنے لگے۔ پیغمبرؐ نے ان کی طول وطویل گفتگو کو سن کر فرمایا کہ ''جو تمہارے نزدیک سب سے بڑا فصیح و بلیغ ماہر زبان ہو لے آؤ۔ اگر وہ ان چاروں لفظوں کو اپنے کلام میں خود استعمال کرے تو تم لوگوں کو ان الفاظ کی فصاحت و بلاغت پر کوئی عذر نہ ہونا چاہئے''۔

ان لوگوں نے اس شرط کو قبول کیا اور ''زید'' نامی شخص کو جو فصاحت و بلاغت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا پیغمبر کی خدمت میں لائے یہ شخص بہت بوڑھا اور جہاندیدہ و تجربہ کار انسان تھا۔ جب دربار رسالت میں یہ حاضر ہوا تو حضور نے فرمایا: "اجلس" بیٹھ جا۔ وہ بیٹھ گیا پھر فرمایا۔ "قم" کھڑا ہوجا۔ وہ کھڑا ہوگیا۔

دو تین مرتبہ آپ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے اور زید نے برابر آپ کے حکم کی تعمیل کی بالآخر خفا ہوکر کہا۔

"آتخذ نی ھزوا انی شیخ کبار وھذا لشئٌ عجاب"۔

''آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں۔ حالانکہ میں آپ سے سن میں بڑا ہوں۔ آپ سے یہ بات تعجب انگیز ہے''۔

زید کی زبان سے یک بیک یہ چاروں الفاظ نکل پڑے۔ اور وہ معترضین یہ سلسلہ کلام سن کر دم بخود اور قرآن کے اعجاز کے قائل ہوگئے۔ بلکہ یہ بھی معجزنما نبیؐ کا اعجاز ہی تھا کہ کچھ اور کہنے کے بجائے زید نے خفگی کے اظہار میں انہیں الفاظ کو استعمال کیا جو زیر بحث تھے۔

یہی بات قرین عقل و قیاس ہے کہ پہلے قرآن نے پورے قرآن کا جواب پھر دس سورتوں کا اور سب کے آخر میں محض ایک سورہ کا جواب طلب کیا ہوگا۔ کیونکہ دوسری صورت یعنی پہلے ایک سورہ پھر دس سورہ اور پھر پورے قرآن کا جواب طلب کرنا عقلاً محال ہے لیکن حضرت عثمان نے خلاف مرضی خدا و رسولؐ جو ''جمع قرآن کمیٹی'' تیار کی تھی اس نے قرآن مجید کو جن سرکاری مصلحتوں کے تحت جمع کیا اس کے اندر آپ کو یہ ملے گا کہ قرآن نے جو پہلا چیلنج کل قرآن کے جواب لانے کا کیا وہ پ ۱۵، سورہ بنی اسرائیل، ع ۱۰ میں ملے گا۔ اور قرآن کا دوسرا چیلنج دس سورتوں والا پ ۱۲، سورہ

ہود، ع ۲ میں ملے گا۔ اسی طرح تیسرا چیلنج پ ۱، سورہ بقرہ، ع ۳ میں ملے گا''۔

قرآن کی اعجازی صداقت ایک نقطہ کے بھی ہٹائے جانے کی متحمل نہیں ہے۔ چنانچہ فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ'' کچھ لوگ حضور سرورِ کائناتؐ کے پاس آئے اور اپنے آباواجداد کی بدخلقی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ عرض کی کہ اے اللہ کے رسولؐ قرآن مجید کی اس آیت "فابوا ان یُضیّفوھما" میں جو''ب'' کا نقطہ ہے اسے اوپر کرکے ایک نقطہ کا اور اضافہ کردیجئے تاکہ'' فاتوا'' ہوجائے اور ہماری خاندانی برائیاں طشت از بام نہ ہونے پائیں۔ مگر رسول اللہؐ نے ان لوگوں کی فرمائش کو قطعی رد کردیا''۔

قرآن مجید خود اپنی تاریخ نزول کا پتہ دیتا ہے۔

"شھرُ رمضان الذی انزل فیه القرآن"۔

ماہ مبارک رمضان میں قرآن نازل کیا گیا۔

یوں تو اس آیت کی روشنی میں قرآن کے لئے یہی کہا جائے گا کہ رمضان کے مہینہ سے قرآن کا نزول باقاعدہ شروع ہوا، مگر جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تیس برس کی تبلیغی زندگی کی طویل مدت میں قرآن آہستہ آہستہ نازل ہوتا رہا اور جب تک جبرئیل نبیؐ تک آیت نہیں پہنچاتے تھے۔ اس وقت تک رسول کریم اس آیت سے ناواقف رہتے تھے۔ اسی لئے جبرئیل رسولؐ کے استاد ہیں۔

میرے خیال میں یہ ایک کافرانہ عقیدہ ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ جبرئیل کے لانے سے پیشتر حضورؐ کو قرآنی آیات کا علم نہ رہا ہو۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اس لئے کہ تاریخی بیان کے مطابق نزول قرآن کے ظاہری ماہ و سال سے مدتوں سے پہلے ولادت کے فوراً بعد علیؑ نے آغوش ختم المرسلینؐ میں آتے ہی قرآن مجید کی تلاوت فرمائی ہے۔ اور سرکار رسالتؐ نے اس کی تصدیق فرمائی ہے۔

ہمارا اپنا عقیدہ عقل و نقل اور فہم و بصیرت کی روشنی میں یہ ہے کہ'' طٰہٰ'' کا لقب پانے والے پیغمبرؐ کا سینہ علوم و معارف اور اسرار الوہیت کا گنجینہ تھا۔ قرآن مجید بھی اسی سینہ میں موجود تھا، جبرئیل کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ اللہ کا پیغام لاتے تھے کہ اب یہ آیت سنایئے اور اب یہ آیت سنایئے۔

۱۔ پ ۲، سورہ بقرہ، آیت ۱۸۵

حجۃ الوداع

مولوی محمد باقر مرحوم

۱۰ ہجری میں پیغمبرؐ خدا نے حج کا قصد و ارادہ فرمایا، مسلمانوں کو بھی پیغمبرؐ نے اپنے اس ارادے کی اطلاع دی، جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی وہاں بھی یہ خبر پہنچی، ہر دل میں جذبہ پیدا ہوا کہ پیغمبرؐ کے ساتھ اس فریضہ حج میں شرکت کی جائے۔ مدینہ میں چار جانب سے مسلمان اُمنڈ کر آ گئے اور مسلمانوں کی کثرت سے مدینہ چھلکنے لگا۔ پیغمبرؐ خدا مسلمانوں کی کثیر جمعیت کے ساتھ پنجشنبہ یا ہفتہ کے روز عازم سفر ہوئے۔ سیرۃ حلبیہ میں ہے کہ آپ کے ہمراہ ۴۰ ہزار مسلمانوں کی تعداد تھی۔ بعض روایتوں میں ستّر بعض میں نوے ہزار کی تعداد مذکور ہے۔ بعض میں ایک لاکھ چودہ ہزار بعض میں ایک لاکھ بیس ہزار بعض روایات سے اس سے بھی زیادہ تعداد معلوم ہوتی ہے۔ یہ تعداد تو صرف ان مسلمانوں کی تھی جو مدینہ سے آپ کے ہمراہ چلے تھے۔ مکہ اور یمن کے ہزاروں مسلمان جو مکہ میں آپ کے ساتھ ہو گئے تھے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان تمام روایات کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ اور اس کے آس پاس کے مقامات سے جو مسلمان، پیغمبرؐ کے ساتھ ہو گئے تھے وہ چالیس ہزار تھے اور جب مدینہ سے قریبی فاصلہ کے شہروں کے مسلمان بھی آ کر مل گئے تو ستر یا نوے ہزار کی تعداد تھی اور مکہ پہنچنے پر تمام اطراف عرب سے آئے ہوئے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ اس سفر میں امہات المومنین بھی ہمرکاب تھیں اور معصومۂ عالم بھی۔ امیرالمومنینؑ یمن میں تشریف فرما تھے۔ پیغمبرؐ نے خط لکھ کر تاکید کی کہ حج میں ہمارے ساتھ آ کر شریک ہوں مگر پیغمبرؐ نے نوعیت حج نہیں تحریر فرمائی جس کا ارادہ کر کے آپ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ پیغمبرؐ نے اپنے ساتھ قربانی کے اونٹ لے لیے تھے۔ مقام ذی الحلیفہ پر پہنچ کر آپ نے اور آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں نے احرام حج باندھے۔ ادھر یمن سے امیرالمومنین اپنے رسالہ کو لے کر مکہ کی طرف بڑھے اور آپ کے ساتھ وہ تمام حُلّے بھی تھے جو نصارائے نجران سے بطور خراج وصول ہوئے تھے۔ امیرالمؤمنینؑ رسالہ پر کسی کو نگراں مقرر کر کے خود آگے بڑھ گئے اور جا کر خدمت پیغمبرؐ میں باریاب ہوئے۔ یمن میں

جو واقعات پیش آئے تھے پیغمبرؐ سے ان کی تفصیل بیان کی اور ان تمام پارچہ جات کی بھی جو نجران سے وصول ہوئے تھے۔ علیؑ کو دیکھ کر پیغمبرؐ کی مسرت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پیغمبرؐ نے امیرالمومنینؑ سے پوچھا اے علیؑ تم نے کس نیت کا احرام باندھا ہے؟ علیؑ نے عرض کی یا رسولؐ اللہ آپ نے اپنے خط میں حج کی نوعیت کی صراحت نہیں فرمائی اور نہ مجھے کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوسکا میں نے تو وہی نیت کرلی تھی جو آپ کی ہوگی، میں نے نیت کی تھی اللھم اھلا لا کاھلال نبیک خدایا تیرے پیغمبرؐ نے جس نیت کا احرام باندھا ہے وہی میرا بھی احرام ہے اور میں اپنے ساتھ ۳۴ اونٹ قربانی کے لیے لایا ہوں۔ پیغمبرؐ نے تکبیر کہی اور فرمایا کہ میں اپنے ساتھ ۶۶ اونٹ لایا ہوں۔ پیغمبر نے کہا: ''تم میرے حج اور عبادات حج اور قربانی میں برابر کے شریک ہو تم احرام باندھے رہو''۔[1] اپنے رسالہ کی طرف واپس جاؤ اور انہیں ساتھ لے کر جلد مکہ میں مجھ سے آملو۔

امیرالمومنینؑ پیغمبرؐ سے رخصت ہوکر اپنے رسالہ کی طرف روانہ ہوئے، رسالہ والے قریب آگئے تھے آپ نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ لوگوں نے وہ خلّے زیب تن کر رکھے ہیں جو نصارائے نجران سے خراج میں وصول ہوئے تھے آپ کو یہ حرکت بہت ناگوار معلوم ہوئی، جس کو اپنا قائم مقام بنا کر گئے تھے اس سے باز پُرس کی کہ پیغمبرؐ کی خدمت میں بغیر پہنچائے اور آپ کے ملاحظہ سے گزرے بغیر لشکر والوں کو تم نے یہ خلّے کیوں دے دیئے، میں نے کب تمہیں اس کی اجازت دی تھی۔ اس شخص نے عذر کیا کہ رسالہ والوں نے درخواست کی کہ پاک و صاف کپڑے ہیں اس وقت عاریۃً پہن لیں اور اسی میں احرام باندھیں پھر واپس کردیں گے۔ آپ نے تمام لوگوں سے خلّے واپس لے لیے۔ امیرالمومنینؑ کی یہ سختی لوگوں کو بہت ناگوار گذری جب رسالہ والے مکہ پہنچے تو کئی افراد نے پیغمبرؐ کی خدمت میں علیؑ کی شکایت کی۔ آں حضرتؐ نے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ علیؑ کے متعلق لب کشائی مناسب نہیں کہ وہ خدا کے بارے میں بہت سخت ہیں، دینی معاملات میں انہیں فریب نہیں دیا جاسکتا۔

ابوسعید خدری صحابی پیغمبرؐ کی مشہور روایت ہے:

اشتکی الناس علیھا فقام رسول اللہ فینا خطبنا فسمعتہ یقول ایھا الناس۔

لوگوں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں علیؑ کی شکایت کی اس پر پیغمبرؐ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے ۔ میں نے آپ کو ارشاد فرماتے سنا۔

۱۔ صحیح بخاری، پارہ ۶، ۱۰، ۱۷، ۲۹، ۵۹، ص ۴۲۷

تشکوا علیھا فواللہ انہٗ لاخیشن فی ذات اللہ او سبیل اللہ[1]

کہ ''علیؑ کی شکایت نہ کرو کہ وہ خدا کے بارے میں یا راہِ خدا میں بہت کھرے ہیں''۔

پیغمبرؐ کی ہدایت کے مطابق امیرالمومنینؑ حالت احرام پر باقی رہے، پیغمبرؐ نے فریضۂ حج ادا کیا، قربانی کے کچھ اونٹ اپنے ہاتھ سے نحر کیے باقی کے متعلق حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ تم نحر کرو۔ جب فریضۂ حج سے فراغت ہوگئی تو پیغمبرؐ مدینہ واپس ہوئے۔ مسلمانوں کی پوری جمعیت آپ کے ہمرکاب تھی۔ ۱۸ ذی الحجہ کو مقام غدیرخم پر پہنچے جو جحفہ سے قریب واقع ہے۔ یہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہ تھی مگر آیت نے نازل ہوکر پیغمبرؐ کو منزل کرنے پر مجبور کردیا پیغمبرؐ کی جانشینی و نیابت کے مسئلہ کو قدرت نے نبوتؐ کے آغاز ہی میں صاف کردیا تھا جس دن پیغمبرؐ نے قریش کے اکابر کو اپنی رسالت کی طرف دعوت دی تھی اسی دن آپ نے علیؑ کے متعلق صاف صاف لفظوں میں اعلان کردیا تھا کہ یہی میرے وصی ہیں، وزیر ہیں، میرے وارث ہیں اور میرے بعد میرے جانشین ہیں۔ یہ ۳ھ بعثت کا واقعہ تھا جس کے بعد دس برس پیغمبرؐ مکہ میں رہے اور دس برس مدینہ میں رہتے ہوگئے تھے۔ ۲۰ برس کے عرصہ میں موقع موقع سے آپ امت کے سامنے اس کی وضاحت کرتے رہے، اپنے افعال و اقوال سے مسلمانوں کے ذہن نشین کراتے رہے کہ ہمارے بعد ہدایت کی توقعات تم علیؑ ہی سے وابستہ کرنا اور جس طرح مجھے دینی و دنیوی امیر و حاکم سمجھتے رہے، میرے بعد علیؑ کو سمجھنا، پیغمبرؐ کی بعثت سے رحلت تک کے حالات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ اعلان نبوت کے بعد ہر موقع و ہر محل پر پیغمبرؐ کا جو امتیازی و خصوصی سلوک علیؑ سے رہا اور اٹھتے بیٹھتے جو کلمات آپ نے علیؑ کے متعلق فرمائے ان کی اہمیت سے آشنا شخص آسانی سے نتائج اخذ کرسکتا ہے۔ اب یہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دن تھے آپ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس دنیا میں مجھے زیادہ دن رہنا نہیں، قدرت کا یہی منشا تھا کہ عرب کا چپہ چپہ توحید کے نعروں سے گونج رہا ہے مسلمانوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے مختلف ممالک اور متفرق شہروں میں مسلمان روز افزوں ترقی پر ہیں۔ ممکن ہے بہت سے ایسے ہوں جنہیں پیغمبرؐ کے ارشادات اور ان کی نیابت کے متعلق نہ معلوم ہوئے ہوں ضرورت ہے کہ آخری مرتبہ مجمع عام میں نیابت پیغمبرؐ کا معاملہ اور واضح کردیا جائے پیغمبرؐ پر وحی پہلے ہی نازل ہوچکی تھی مگر آپ منتظر تھے کہ ایسا مناسب موقع آجائے جس میں لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ نہ ہو مگر اس حکیم و علیم کے نزدیک غدیرخم سے بہتر کوئی

۱- مسند، ج... ، ص ۸۲

موقع نہ تھا ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت مکہ سے پیغمبرؐ کے ہمراہ تھی اسی جگہ سے راستے بٹتے تھے مختلف شہروں کے مسلمانوں کو یہیں سے جدا ہونا تھا، امین وحی آیت لے کر نازل ہوئے یا ایھا الرسول بلغ ماانزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته و الله یعصمک من الناس اے رسولؐ پہنچادو اس چیز کو جو تم پر نازل کی گئی ہے اور اگر تم نے نہیں پہنچایا تو گویا تم نے کارِ رسالت ہی انجام نہیں دیا، ڈرو نہیں تم کو خدا لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ آپ مرکب سے اتر پڑے، آپ کے ساتھ پورا مجمع اتر پڑا جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ آپہنچے اور جو لوگ آگے بڑھ چکے تھے وہ واپس بلا لیے گئے۔ دوپہر کا وقت گرمی کی شدت عرب کا بیابان تپتی زمین جہاں ببول کے درختوں کے علاوہ کسی درخت کا سایہ بھی نہیں اسی جگہ پیغمبرؐ نے نماز جماعت پڑھائی پھر منبر پر جو اونٹ کے کجاووں سے تیار کرایا گیا تھا آپ تشریف لے گئے مجمع میں بے چینی ہے، اضطراب کی کیفیت سب پر طاری ہے، سبب کھلتا نہیں کہ آخر یہ بے منزل کی منزل کیسی یہ اتنی تیاری کس مقصد کے لئے سب کی آنکھیں رسولؐ کے چہرے پر جمی تھیں، سب کے کان آپ کی آواز پر لگے تھے۔حضرت رسالت مآبؐ اس منبر پر تشریف لے گئے علیؑ کو بھی اپنے دائیں پہلو برابر کھڑا کرلیا، بعد حمدوثناء الٰہی ارشاد فرمایا یا ایھا الناس یوشک ان ادعی فاجیب و انی مسئول و انکم مسئولون فما انتم قائلون قالوا اشھد انک قد بلغت وجاھدت و نصحت جزاک الله خیرا اے لوگوں قریب ہے کہ مجھے بلایا جائے اور مجھے جانا پڑے مجھ سے بھی سوال ہوگا اور تم سے بھی پوچھا جائے گا کہ تم بتاؤ تم لوگ کیا کہنے والے ہو سارے مجمع نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پوری تبلیغ کی۔ ہمیں راہِ راست پر لانے کے لئے بے حد جد و جہد کی، ہماری خیر خواہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی آپ کو خداوند عالم جزائے خیر دے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔ الیس تشھدون ان لااله الا الله و ان محمدا عبده و رسوله و ان جنته حق و ان ناره حق و ان الموت حق و ان البعث من فی القبور قالوا بلی نشھد بذالک قال اللھم اشھد کیا تم اس کی گواہی نہیں دیتے کہ بس معبود حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور محمد خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور جنت حق ہے، جہنم حق ہے، موت کے بعد پھر زندہ ہونا حق ہے اور قیامت آکر رہے گی کوئی شک وشبہ اس کے آنے میں نہیں اور یہ کہ خداوند عالم تمام قبروں سے مردوں کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے گا۔ مجمع نے کہا ہاں ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ آں حضرتؐ نے فرمایا خداوندتو بھی گواہ رہنا پھر آپ نے فرمایا۔ انی

تارک فیکم الثقلین احدھما اکبر من اکبر الاخر کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی فانظروا کیف تخلفونی فیھما فانھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض ''دیکھو میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جن میں ایک دوسرے سے بزرگ تر ہے ایک کتابِ خدا ہے اور دوسرے میرے اہل بیتؑ۔ اب دیکھنا ہے کہ تم ان دونوں سے کیا طرز عمل اختیار کرتے ہو۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔ ثم قالوا ایھاالناس ان اللہ مولائی وانا مولاہ فھذا مولاہ [یعنی علیا] اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ و نصر من نصرہ و اخذل من خذلہ و ادد الحق معہ حیث کان پھر آپ نے فرمایا اے لوگو! خداوند عالم میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور میں ان کی جانوں پر ان سے زیادہ قدرت و اختیار رکھتا ہوں تو یاد رکھنا کہ جس جس کا میں مولا و آقا ہوں یہ یعنی علیؑ بھی اس کے مولا وآقا ہیں۔ خدا وندا تو دوست رکھ اسے جو انہیں دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو انہیں دشمن رکھے اور جو اس کی مدد کرے اس کی تو مدد کر اور جو اسے چھوڑ دے تو بھی اسے چھوڑ دے اور حق کو ادھر گردش دے جدھر علیؑ ہوں۔ تین مرتبہ کہہ کر ارشاد کیا کہ تم حاضرین کو چاہیے کہ غائبین تک اس خبر کو پہنچاؤ۔ اس کے بعد آپ منبر سے نیچے تشریف لائے دو رکعت نماز پڑھی اور حضرت امیرالمومنینؑ کو حکم دیا کہ تم خیمے میں بیٹھو اور مسلمانوں کو ہدایت کی ایک ایک جماعت علیؑ کی خدمت میں آئے اور امیرالمومنینؑ کہہ کر سلام کرے چنانچہ لوگوں نے اس حکم کی تعمیل کی پھر آپ نے امہات المومنین اور دیگر خواتین کو جو حج میں ہمراہ تھیں حکم دیا کہ وہ بھی علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوں اور امیرالمومنینؑ کہہ کر سلام کریں۔ حضرت ابوبکر و عمر نے بھی اس موقع پر بہت جی کھول کر مبارک باد دی اور اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ حضرت عمر کا یہ فقرہ کافی شہرت رکھتا ہے جو انہوں نے تہنیت کے طور پر امیرالمومنینؑ سے کہا تھے۔ بخ بخ لک یا علی اصبحت مولای و مولی کل مومن و مومنة مبارک ہو آپ کو یا علیؑ کہ آج سے آپ میرے بھی مولا و آقا ہوگئے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا ہوگئے۔[1]

اسی موقع پر امین وحی مژدہ خداوندی لے کر پہنچے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔[2] آج کے دن ہم نے تمہارے لیے دین کو کامل کیا اور تم پر

۱- مسند امام احمد، ج ۴، ص ۲۸۱؛ تاریخ حبیب السیر، جلد اول، جزو سیوم، ص ۷۷؛ معارج النبوۃ، رکن چہارم، باب سیزدہم، ص ۲۲۰ کنز الاعمال، ج ۸، ص ۶۰ حدیث ۱۲۰۹ ریاض نضرہ، ج ۲، ص ۲۱۷؛ مسند ابوداؤد و طیالسی وغیرہ

۲- سورہ مائدہ، آیہ ۳

اپنی نعمتیں تمام کیں اور دین اسلام کو تمہارا دین بننا پسند کیا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا اللہ اکبر دین کے کامل اور نعمت کے تمام ہونے پر اور میری رسالتؐ اور علیؑ کی ولایت سے خدا کے خوشنود ہونے پر۔[1]

حسان بن ثابت شاعر اسلام نے اپنا مدحیہ قصیدہ پیش کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

یناديهم يوم الغدير نبيهم	نجم و السمع بالرسول صناديا
يقول فمن مولاكم و وليكم	فقالوا ولم يبد و اهناك التعاميا
الهك مولانا و انت ولينا	و لم ترمنا فی الولاية عاصيا
فقال لهٗ قم يا علی فاننی	رضيتك من بعدی اماما و هاديا
فمن كنت مولاه فهذا وليه	فكونوا الهٗ انصار صدق مواليا
فناك دعا اللهم وآل وليه	و كن للذی عادا عليا معاديا

''بروز غدیر ان کے نبی مقام غدیر خم پر اعلان فرماتے ہیں پیغمبرؐ کو اعلان کرتے سنو۔ آپ فرما رہے ہیں کہ کون تمہارا مولا و آقا ہے لوگوں نے بہ یک زبان کہا اور جواب میں درنگ نہ کی کہ اے رسولؐ آپ کا معبود ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے آقا ہیں اور اپنی حکومت میں آپ ہمیں نافرمان نہ پائیں گے۔ اس پر پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا اے علیؑ اٹھو میری مرضی ہے کہ تم میرے بعد امام اور ہادی ہو۔ تو اے لوگو جس جس کا میں مولا ہوں یہ علیؑ اس کے مولا ہیں تم انہیں کے سچے مددگار اور اطاعت گذار بن جاؤ۔ اسی موقع پر پیغمبرؐ نے یہ دعا فرمائی کہ خداوند جو ان کو دوست رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو انہیں دشمن رکھے تو اس کا دشمن ہو۔''

ان اشعار کے سننے کے بعد پیغمبرؐ نے حسان کو دعا دی تھی لاتزال يا حسان مويدا بروح القدس مانصرتنا بلسانك حسان روح القدس اے حسانؓ! ہمیشہ تمہاری مدد ہوتی رہے گی جب تک تم اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتے رہو گے۔ یہ شرط پیغمبرؐ نے اس لیے لگا دی تھی کہ آپ کو حسان کا انجام معلوم تھا یہ بعد میں حضرت امیرالمومنین کے مخالفین کے ہمنوا ہوگئے تھے اگر مستقبل ان کا تاریک نہ ہوتا تو پیغمبرؐ بغیر کسی شرط کے دعا دیتے۔

اس مہتم بالشان فرض سے بخیروخوبی فارغ ہوکر پیغمبرؐ مراجعت فرمائے مدینہ ہوئے۔ علیؑ کی جانشینی کی خبریں تمام اطراف وقبائل عرب میں مشہور ہوچکی تھیں حج میں شریک ہونے والے مسلمانوں

۱۔ درمنثور، سیوطی، ج ۲، ص ۲۵۹؛ تاریخ حبیب السیر وغیرہ

نے اپنے اپنے شہروں میں پہنچ کر دوسرے مسلمانوں کو یہ خبریں پہنچائیں تھوڑے ہی دنوں میں اسلامی آبادیوں کے اندر یہ خبر اچھی طرح پھیل گئی اور ایک ایک شخص کو معلوم ہوگیا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے اور بعد پیغمبرؐ مرکز حکومت اسلامیہ وہی ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے مسلمانوں کو جہاں انتہائی مسرت تھی وہاں منافقین کے لیے یہ خبر صدمۂ جانکاہ ثابت ہوئی بہتوں نے ظاہرداری میں مصلحت سمجھی اور اپنے منصوبوں کو وقت پر اٹھا رکھا۔ بعضوں کی طرف سے سخت ردعمل کا اظہار ہوا چنانچہ پیغمبرؐ کے مدینہ پہنچنے پر حارث بن نعمان قہری ناقہ پر سوار ہوکر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ناقہ کو بٹھا کر اترا اور کہا یا محمدؐ آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کی گواہی دیں، ہم نے آپ کے حکم کو مانا۔ آپ نے حکم دیا کہ پانچ وقت نماز پڑھیں ہم نے اسے بھی قبول کیا، آپ نے حکم دیا کہ ہم زکوٰۃ دیں ہم نے یہ بھی منظور کیا۔ آپ نے حکم دیا کہ رمضان المبارک میں روزے رکھیں، ہم نے اس حکم کی بھی تعمیل کی آپ نے حکم دیا کہ ہم حج کریں ہم نے حج بھی کیا۔ ہم نے اتنی باتیں آپ کی مانیں اور آپ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور آپ نے یہ کیا کہ اپنے چچا زاد بھائی علیؑ کی آستین پکڑ کر ان کو کھڑا کیا اُن کو ہم لوگوں پر فضیلت دی اور اُن کے متعلق فرمایا کہ میں جس کا مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولا ہیں، یہ بات آپ کی جانب سے تھی یا خدا کی جانب سے۔ آں حضرتؐ نے فرمایا۔ قسم ہے اُس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ خدا کی جانب سے تھا اور اسی کے حکم سے میں نے ایسا کیا۔ یہ سن کر حارث پلٹا اور اپنی سواری کی طرف یہ کہتا ہوا بڑھا کہ پروردگار محمدؐ جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر سچ ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا دردناک عذاب ہم پر بھیج۔ وہ ابھی مرکب تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ خداوند عالم نے اسے اپنے عذاب میں مبتلا کردیا ایک پتھر آسمان سے اس کی کھوپڑی پر گرا جو اس کے سر کو توڑتا ہوا اسفل سے نکل گیا اور اس نے وہیں جان دے دی۔

صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک

ڈاکٹر سید مجتبیٰ احسن کاموپوری

مہاجرین مکہ کی اپنے پیدائشی حق سے محرومی

مکہ سے مدینہ کی طرف رسول خداؐ کی ہجرت کے بعد چھ سال کا عرصہ حفاظتی اور دفاعی سرگرمیوں میں گزر گیا۔ ہجرت کے پہلے ہی سال حکم الٰہی کے مطابق جناب رسول خداؐ نے مسجد اقصیٰ کے بجائے مسجد حرام کو قبلہ قرار دیا۔ تمام مسلمان خانہ کعبہ کے رُخ پر عبادت کرنے لگے۔ جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے مکہ معظمہ میں کی تھی۔

صدیوں سے عرب خانہ کعبہ کا حج کرتے تھے۔ خانہ کعبہ کو اس کے تقدس کی بناپر پناہ گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اگر کوئی مجرم اس میں پناہ حاصل کرلیتا تو اسے گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عرب کے کل چھوٹے بڑے ادنیٰ واعلیٰ قبیلے خانہ خدا کے طواف وحج کا مشترک حق رکھتے تھے۔

مگر قریش کو ضد تھی کہ رسول خداؐ اور مسلمانوں کو مسجد حرام کی زیارت وحج کی اجازت نہ دیں گے۔ مسلمانوں کو اپنے اس پیدائشی حق کی محرومی کا سخت دکھ تھا۔ وہ بار بار اس زور وزبردستی پر احتجاج کرتے رہے۔ قرآن مجید نے اس احتجاج کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔[1]

قریش نے مسجد حرام کا خدا ہبل واساف ونائلہ اور دوسرے بتوں کو تجویز کررکھا تھا اور اسلام پتھر کو جمادات کی صنف میں رکھتا تھا۔ اس اختلاف نظر نے قریش کو مسلمانوں پر ہر قسم کی زیادتی وستم رانی کا حق دے دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو مکہ سے جلا وطن کرسکتے تھے۔ انہیں جسمانی اذیت پہونچاسکتے تھے۔ مکہ مہاجرین کا وطن تھا انہیں اپنے وطن کی یاد ستاتی تھی خانہ کعبہ قریش کی ملکیت نہ تھا۔ تمام عربی قبائل کی نظر میں سے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

اسلام نے جہاں توحید کا عقیدہ پیش کیا تھا۔ اور انسان کی روحانی وجسمانی ترقی کے لئے ایک وسیع نظام دیا تھا مسلمانوں پر خانہ کعبہ کا حج بھی لازم قرار دیا تھا۔ مہاجر وانصار بلکہ کل مسلمان طواف

۱- سورۂ انفال، آیہ ۳۴ تا ۳۶

و حج کعبہ کے لیے بے تاب تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا اللہ کی مدد پر بھروسہ تھا کہ ایک دن انہیں اپنا حق مل کر رہے گا۔ اور وہ پوری آزادی واطمینان سے اللہ کے گھر میں عبادت کی سعادت حاصل کریں گے۔ جنگوں کے قافلے گزرتے رہے۔ بدر و اُحد وخندق اور دوسری لڑائیاں مسلمانوں کے بے مثال جذبۂ قربانی کی گواہ بنتی رہیں۔ مسلمانوں کا ہر نیا دن ترقی کا دن بنتا گیا۔ قریش مکہ اپنا وقت اپنی اصلاح وترقی میں صرف کرنے کے بجائے مسلمانوں کی تخریب میں معماری صلاحیتیں ضائع کرتے رہے۔

رسول خداؐ کا امید افزا خواب

ایک دن صبح کو مسلمان مسجد الٰہی میں نماز کے لئے آئے ہوئے تھے حضرتؐ نے ان سے اپنا خواب بیان فرمایا کہ تم لوگ انشاء اللہ جلد ہی بغیر کسی خوف کے اپنا سر منڈوا کر مسجد حرام میں داخل ہوگے مسلمانوں کے لئے یہ خواب بہت بڑا مژدہ تھا ان کے دل اس خوش خبری کی مسرت سے بھر گئے۔ سب نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ یہ خوش خبری مدینہ کے ایک ایک گوشے میں بجلی کی چمک کی طرح پھیل گئی۔ جس نے یہ خبر سنی ہوگی فطری طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ مسجد حرام میں داخلہ کیسے ہوگا۔ مسلمان اہل مکہ سے لڑکر طواف خانہ کعبہ کا حق حاصل کریں گے یا قریش کی فوجی طاقت اتنی ناکارہ ہوجائے گا کہ وہ مسلمانوں سے کوئی مزاحمت نہ کریں گے۔ جس طرح دریا میں مد و جزر ہوتا ہے زندگی بھی ان مرحلوں سے گزرتی ہے۔ جنگ احزاب میں ناکامی کے بعد سے قریش کی جنگی ہمت پست ہونے لگی تھی۔ اسلام کے شدید دشمن ابوجہل و ابولہب وغیرہ مسلمانوں کی تلواروں سے موت کی نیند سو چکے تھے۔ مسلسل لڑائیوں سے قریش کے وسائل و آمدنی پر بھی بہت خراب اثر پڑا تھا۔ اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ اب قریش کی عصبیت وضد وناعاقبت اندیشی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوگی۔

رسول خداؐ کے خواب کی نوعیت میں اشارہ تھا کہ مسلمانوں کا مسجد حرام میں داخلہ بغیر طاقت کے استعمال کے ہوگا۔

عمرہ کی تیاری

۶ ہجری میں یکم ذی قعدہ کو جناب رسول خداؐ نے عمرہ بجالانے کے لئے مکہ کا قصد فرمایا۔ ستر اونٹ

قربانی کے لئے ساتھ لیے ''مسجد شجرہ'' میں احرام باندھا۔ ایک ہزار پانچ سو میں یا چار سو آدمی عمرہ کے لئے آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ امہات مومنین میں آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت ام سلمہ تھیں۔[1]

غیر مسلم قبائل کو بھی آپ نے اس سفر میں شرکت کی دعوت دی تھی کہ قریش کی بے جا ضد کے وہ بھی گواہ رہیں اور مسلمانوں کے فطری حق میں ان کی حمایت کریں۔[2]

ذی قعدہ کے مہینے میں سفر، جو مشرکوں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک ایک محترم مہینہ تھا اور جس میں بغیر اختلاف جنگ حرام تھی حضرت کے مقصد کی پاکیزگی پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی تھا۔ جنگی ہتھیار بھی ساتھ نہیں لئے گئے صرف اتنے ہتھیار ساتھ تھے جسے عام طور پر ہر ایک مسافر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تلواریں نیاموں میں تھیں۔ راستے میں ایک شب بارش ہوئی۔ صبح کو نماز پڑھ کر حضرتؐ نے حاضرین کے سامنے ایک مختصر تقریر فرمائی۔ جس کا موضوع عقیدہ توحید و شرک تھا۔

حضرتؐ نے فرمایا جو یہ کہے کہ بارش اللہ کی رحمت و فضل سے ہوئی اور اس کے رزق عطا کرنے سے، وہ مومن ہے۔ اور جو یہ کہے کہ ستاروں کے اثر سے بارش ہوئی وہ کافر ہے۔[3]

حضرتؐ نے فاعل حقیقی اور موثر اصلی اور ارباب و وسائط کے فرق کو واضح کیا۔ کچھ لوگ ستاروں کو ہی بارش کا موثر حقیقی سمجھتے تھے اور خدا کی رحمت و فضل تک ان کا ذہن نہیں جاتا تھا۔ اس سفر میں حضرتؐ کے ساتھ بعض غیر مسلم بھی تھے اور وہ موثر حقیقی و وسائط میں فرق نہیں کرتے تھے اس لئے اس کے مخاطب اگرچہ مسلمان تھے لیکن غیر مسلم ساتھیوں کی فکری اصلاح بھی مدنظر رہی ہوگی۔

جب حضرتؐ ''ثنیہ المرار'' پر پہونچے تو آپ کی اونٹنی جس کا نام ''قصوا'' تھا بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا۔ یہ سرکشی کر رہی ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا سرکشی اس کی عادت نہیں ہے۔ وہ حکم خدا سے یہاں رک گئی ہے۔ یہاں حضرتؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ بھی فرمایا کہ قریش جو صورت بھی چاہیں گے جس میں حرمات الٰہی کی عظمت ہو تو میں اسے مان لوں گا یہ ذہنوں کو صلح پر آمادہ کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ پھر اونٹنی کو ایڑ لگائی وہ چل کھڑی ہوئی۔ آنحضرتؐ نے دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے ''حدیبیہ'' پر سفر ختم کیا۔ حدیبیہ مکہ معظمہ سے ایک مرحلہ پر ایک کنواں تھا۔[4]

۱۔ منتہی الامال، ج سیرۃ النبی از شیخ عباس قمی مرحوم ص ۹۵ ۲۔ حیات محمد از ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مصری مطبوعہ، ص ۳۵۴ و ۳۵۵
سیرۃ ابن ہشام ۲/۳۱۰ ۳۔ بخاری، کتاب المغازی
۴۔ ج ۲، ص ۲۱۱، لباب الاخبار، سیرۃ النبی از شیخ مصطفےٰ علائی مشقی

قریش کی مزاحمت

ابھی رسولؐ عسفان ہی میں تھے کہ قریش کو اطلاع مل گئی کہ رسولؐ خدا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عمرہ بجالانے کے لئے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔قریش نے رسولؐ خدا کو روکنے کے لئے منصوبہ بنایا۔خالد بن ولید وعکرمہ بن ابی جہل کو ہراول کے طور پر دوسو سواروں کے ساتھ روانہ کیا تا کہ رسول خدا کو مکہ میں نہ داخل ہونے دیں لیکن مسلمان دوسرے نشیبی راستے سے حدیبیہ پہونچ گئے۔

قریش نے اپنے سفیر بھیجے تا کہ رسول خداؐ کے آنے کا مقصد معلوم کریں۔ بدیل بن ورقا خزاعہ کے کچھ آدمیوں کے ساتھ بھیجے گئے۔ ان لوگوں نے تسلیم کرلیا کہ رسول خداؐ جنگ کے لئے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ خانۂ کعبہ میں عمرہ بجالانے کے لئے آئے ہیں۔ سفیر نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا تھا لیکن عوام مصلح کی سنجیدگی پر شک کرتے ہیں اور اشتعال انگیز فتنہ جو وخودغرض رہنماؤں کے گرویدہ ہوجاتے ہیں۔ بدیل پر معقول بات کہنے کی وجہ سے اہل مکہ نے تہمت لگائی۔

قریش نے دوسرا سفیر بھیجا۔ اس نے بھی جب رسول خداؐ سے باتیں کیں تو اس پر ثابت ہوگیا کہ حضرتؐ عمرہ ادا کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ جنگ کرنا آپ کے مقصد کے خلاف ہے۔ اس نے اپنے تاثرات قریش سے بیان کیے۔ اس کی بات بھی رائیگاں گئی۔قریش کو اب ایک اور شرارت سوجھی۔قریش کے حلیفوں میں احابیش تھے۔ تیرانداز عرب کی یہ ایک قوم تھی انہیں احابیش یا تو کالے ہونے کی وجہ سے کہا گیا یا اس لیے کہ یہ حبش پہاڑ کے قریب رہتے تھے قریش نے احابیش کے سردار ''حلیش'' کو سفیر بنا کر بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر رسولؐ خدا ان کی باتیں نہ مانیں گے تو قریش انہیں بھڑکا کر جنگ میں شریک کرلیں گے جب احابیش کا سردار حلیش مسلمانوں کے پاس آیا تو رسول خداؐ نے قربانی کے جانور اس کے سامنے کھلوادئے تا کہ وہ سمجھ لے کہ قریش جنگی فضا پیدا کررہے ہیں اور زیادتی سے کام لے رہے ہیں مسلمان صرف عمرہ بجالانے کے لئے آئے ہیں۔ اور ان کی آمد کا مقصد صرف عمرہ بجالانا ہے۔ اور ان کی آمد کا مقصد بالکل پاک وصاف ہے۔ اور اس میں کوئی سیاسی غرض شامل نہیں ہے۔حلیش قربانی کے ستر جانور دیکھ کر رسول خداؐ کے سفر کے حقیقی مقصد تک پہونچ گیا۔ اور اُسے یقین ہوگیا کہ قریش کا رویہ صحیح نہیں ہے۔ اور وہ بے جا ضد سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے جو دیکھا کہ اس کی روشنی میں قریش کو صحیح مشورہ دیا۔قریش اسے برا بھلا کہنے لگے۔حلیش ان کی بے ادبی سے بگڑ گیا اور اس نے کہا کہ ہم اس لئے تمہارے حلیف نہیں بنے ہیں کہ تم ان لوگوں کو کعبہ

کی زیارت سے روکتے پھر وجو عقیدت و خلوص کے ساتھ اس مقصد کے لئے آئے ہیں۔ قریش نے حلیش کی خفگی کے انجام کو محسوس کیا اور اس کے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور اس سے کہا کہ ہمیں موقع دو کہ ہم اس مسئلہ پر کچھ اور غور کر سکیں۔[1]

اب قریش نے عروہ بن مسعود ثقفی کی سفارت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ عروہ کے علم میں تھا کہ قریش پہلے سفیروں کی حق گوئی پر ان کی کس قدر توہین کر چکے ہیں اور ان کے خلوص پر شک کر چکے ہیں۔ اس لئے اس نے اس خدمت کے انجام دینے سے عذر کیا۔ قریش نے کہا آپ ہماری نظر میں متہم نہیں ہیں ہم آپ کو اپنا معتمد سمجھتے ہیں اور آپ کی حکمت و اصابت رائے پر مطمئن ہیں۔[2]

پہلے تو عروہ نے دھمکی اور سخت کلامی سے کام لیا رسول خداؐ کے ساتھیوں کو ''اوشاب، یا اشواب، یا اوباش'' کہا اور کہا کہ جس وقت اہل مکہ گھمسان کا حملہ کریں گے تو یہ اوباش جو آپ کے گرد و پیش جمع ہیں آپ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔[3] حضرت ابو بکر نے اس کا سخت جواب دیا۔

رسول خداؐ نے اس سے وہی باتیں کہیں جو پہلے سفیروں سے فرما چکے تھے۔ عروہ نے واپس جا کر قریش سے کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن محمدؐ کا جو اثر ان کی قوم پر دیکھا اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی۔ ان کے ساتھی ان کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے تمہیں اپنے طریق کار پر غور و فکر سے کام لینا چاہئے۔[4]

رسول خداؐ نے دیکھا قریش کے سفیر قریش کو سمجھانے میں ناکام ہو رہے ہیں لہٰذا حضرتؐ نے خود خراش بن امیہ خزاعی کو قریش کے پاس بھیجا تا کہ وہ آپ کے آنے کا مقصد ان پر واضح کر دیں۔ رسول خداؐ نے خراش کو سواری کے لئے اپنا اونٹ دیا جس کو ''ثعلب'' کہتے تھے۔ قریش کے بعض سفیہوں نے اس اونٹ کو مار ڈالا اور خراش کا کام بھی تمام کرنے والے تھے۔ ''احابیش'' نے انہیں بچالیا۔ خراش نے واپسی پر رسول خداؐ سے سارا ماجرا بیان کیا۔[5]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے کچھ لوگ فریقین میں جنگ چھڑ جانے میں اپنا فائدہ سمجھتے تھے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ قریش کے چالیس پچاس آدمی چاہتے تھے کہ رسول خداؐ کے لشکر میں سے کسی کو کوئی نقصان پہونچادیں۔ محمد حسین ہیکل نے لکھا ہے کہ شب کو یہ لوگ رسول خداؐ کی فوج پر سنگ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۱۳ ۲۔ حیات محمد، محمد حسین ہیکل، ص ۳۵۹ ۳۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۱۳
۴۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۱۴ ۵۔ ایضاً

باری کرتے تھے۔ مسلمانوں نے ان لوگوں کو گرفتار کرلیا۔ رسول خداؐ نے انہیں معاف کردیا یہ لوگ مکہ چلے گئے۔[۱]

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جناب رسول خداؐ نے حضرت عمر کو بلایا تا کہ انہیں مکہ بھیجیں اور وہ ان کے ذہن میں صحیح بات ڈال دیں۔ حضرت عمر نے عذر کیا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ وہاں قبیلہ بنی عدی میں سے کوئی نہیں رہ گیا۔ یہ لوگ ہوتے تو میری حفاظت کی ذمہ داری لیتے۔ قریش جانتے ہیں کہ میں ان کا کیسا دشمن ہوں۔ آپ عثمان بن عفان کو بھیجئے ان کے قبیلہ والے ان کی حفاظت کریں گے۔ جناب رسول خداؐ نے حضرت عثمان کو قریش کے پاس بھیجا تا کہ وہ حضرتؐ کے آنے کا مقصد انہیں سمجھادیں۔ اور صراحت سے ان سے کہہ دیں کہ میں لڑنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ کعبہ کی زیارت میرا مقصد ہے۔ جب حضرت عثمان مکہ میں داخل ہوئے تو ابان بن سعید بن عاص نے ان کو پناہ دی۔[۲]

بیعت رضوان

حضرت عثمان نے جناب رسول خداؐ کا پیغام پہونچا دیا۔ قریش نے ان کو روک رکھا یہ افواہ اڑگئی کہ مشرکین مکہ نے حضرت عثمان کو قتل کردیا۔ مسلمانوں کا اپنے سفیر کے قتل کی خبر سے اضطراب ایک فطری امر تھا۔ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہوا ہے تو ہم ان سے مقابلہ کریں گے آپ نے مسلمانوں کو بیعت کے لئے بلایا۔ یہ بیعت ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی کہ موت سے نہ ڈریں گے اور کوئی جیتے جی میدان جنگ نہ چھوڑے گا۔ اس بیعت کو بیعت الرضوان کہتے ہیں۔ ذیل کی آیت اسی موقع کی بتائی جاتی ہے۔

''جس وقت تم سے مومنین، درخت کے نیچے (لڑنے مرنے کی) بیعت کررہے تھے تو خدا ان سے (اس بات پر) ضرور خوش ہوا۔ جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اللہ نے اسے دیکھ لیا۔ بلکہ ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں اس کے عوض میں بہت جلد فتح عنایت کی۔[۳]

پھر جناب رسول خداؐ کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کے قتل کے متعلق جو خبر اڑگئی وہ افواہ سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت عثمان قید ضرور کرلیے گئے تھے لیکن ان کو رہا کردیا گیا اور وہ صحیح سلامت واپس آگئے۔

صلح حدیبیہ

فریقین میں مصالحت کی گفتگو دوبارہ شروع ہوئی۔ قریش نے سہیل بن عمرو کو اپنا معتمد بنا کر بھیجا اور صلح

۱- حیات محمد، محمد حسین ہیکل، ص ۳۵۹ ۲- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۱۴ ۳- سورہ فتح، آیہ ۱۸

کی بات چیت شروع کی۔

اگر چہ قریش نے ناانصافی سے شرائط صلح میں اپنا مفاد غالب رکھا۔لیکن جنگ سے طرفین کا جو عظیم وناقابل تلافی نقصان ہوتا اس کے مقابلے میں بعض جزئی امور میں مغلوبیت رسول خداؐ کی حکیمانہ نظر میں قابل برداشت تھی۔بعض اونچے مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول خداؐ وحی الٰہی کی طرف سے صلح پر مامور تھے اور جن امور پر آپ راضی ہوگئے۔ وہ وحی کی روشنی میں تھے۔

جس طرح کسی واقعہ کے متعلق اس کے متن اور تفصیلات میں اختلاف ہوجایا کرتا ہے صلح حدیبیہ کے متن اور تفصیلات میں معمولی اختلاف ملتا ہے۔ عہد نامہ صلح میں لکھا گیا کہ فریقین دس سال (دوسال یا چار سال) جنگ نہ کریں گے۔

۲- اس سال مسلمان بغیر عمرہ ادا کیے واپس چلے جائیں سال آئندہ آئیں اور تین دن تک حرم مکہ کی زیارت کریں۔

۳- اگر مکہ سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ میں مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا تو مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ وہ اسے واپس کردیں۔ اور اگر کوئی مسلمان مرتد ہوکر مدینہ سے مکہ چلا جائے گا تو قریش اسے واپس نہ کریں گے۔

۴- قبائل عرب اپنی مرضی سے معاہدہ کرنے میں آزاد ہیں۔ جو چاہے محمدؐ سے معاہدہ کرے اور جو چاہے قریش کا حلیف بن جائے۔

نا جنگ معاہدہ دس سال کے لئے ہوا تھا اس کی روایت ابن اسحاق نے کی ہے۔ ابن سعد بھی اسی خیال کے موئید ہیں۔ زرقانی نے مواہب لدنیہ قسطلانی کی شرح میں لکھا ہے کہ جس روایت میں مصالحت کی مدت چار سال ہے اس کی سند ضعیف ہے اور صحیح کے مخالف ہے۔[۱]

صلح نامہ کے کاتب

صلح نامہ کے کاتب حضرت علیؑ تھے۔بعض لوگوں نے محمد بن مسلمہ کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ زرقانی نے جمع وتوثیق روایات سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل صلح نامہ تو حضرت علیؑ ہی نے لکھا تھا سہیل بن عمرو کے لئے اس کی نقل محمد بن مسلم نے کی۔[۲]

محدث دہلوی مولانا عبدالحق صاحب نے مدارج النبوہ میں لکھا ہے کہ اوس بن خولی انصاری فن

۱- زرقانی، شرح مواہب لدنیہ، ج ۲، ص ۱۹۵ ۲- ایضا

کتابت میں ماہر تھے۔ جناب رسول خداؐ نے معاہدہ لکھنے کے لئے ان کو بلایا۔ لیکن سہیل نے کہا کہ ''یہ تحریر آپ کے بھائی علی بن ابی طالب لکھیں گے''۔[۱]

جناب رسول خداؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ لکھو:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سہیل نے کہا ''ہم رحمان ورحیم'' کو نہیں جانتے۔ آپ عام رواج کے مطابق باسمک اللھم'' لکھئے۔ جناب رسول خداؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا ''باسمک اللھم'' لکھ دو۔ حضرت علیؑ نے تعمیل حکم کی۔ جناب رسول خداؐ نے فرمایا لکھو: ''ھذا ما قاضی بداً محمد رسول اللہ'' حضرت علیؑ نے یہ عبارت لکھ دی۔ سہیل نے کہا اگر ہم آپ کو خدا کا رسولؐ سمجھتے ہوتے تو آپ کو خانۂ خدا کی زیارت سے منع ہی کیوں کرتے۔ آپ صرف ''محمدؐ بن عبد اللہ'' لکھیے۔ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ ''میں محمد رسول اللہؐ بھی ہوں اور محمدؐ بن عبد اللہ بھی ہوں۔ لکھدو ''محمد بن عبد اللہ'' اور مٹادو لفظ رسول اللہ''۔

امتناع عین امتثال

حضرت علیؑ نے فرمایا مجھ سے لفظ ''رسول اللہ نہیں مٹایا جاسکتا''۔ عقیدۂ رسالت جناب رسول خدا حضرت علیؑ کی فطرت ان کے شعور ان کی عقل اور ان کے ضمیر میں راسخ تھا۔ ان کے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا یہ موقع حضرت علیؑ کی عقل ربانی اور عشق رسالت کے کمال کا مظہر بن گیا۔ امتناع عین امتثال کی یہ تنہا مثال ہے۔ مخصوص حالات میں امر وادب میں کسی ایک کی ترجیح کا یہ نادر موقع تھا۔ محدث دہلوی مولانا شاہ عبد الحق صاحب کا قلم اس مقام پر پہونچ کر وجد و ابتہاج سے حرکت میں آگیا۔ موصوف نے لکھا ہے:

''ایں امتناع علی از محمدؐ لفظ رسول اللہ نہ از باب ترک امتثال است کہ مستلزم ترک ادب است بلکہ عین امتثال و ادب و تاسی از غایت عشق ومحبت است''۔ [۲]

علامہ محمد بن عبد الباقی زرقانی مالکی نے اس مقام پر ایک لطیف ونازک نکتہ کا اظہار کیا ہے لکھتے ہیں:

"قال العلماء و ھذا الذی فعلہ علی من باب الادب المستحب۔ لان العظیم اذا امر بشیٔ و ظن المامور انہ لم یحتمہ بالادب فی حقہ التوقف حتی یتحقق ماعند الامر[۳]

یعنی علما نے کہا ہے کہ علیؑ کا یہ فعل ''ادب مستحب'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ عظیم جس

۱- زرقانی، شرح مواہب لدنیہ، ج ۲، ص ۱۹۵ ۲- مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۸۶ ۳- شرح مواہب لدنیہ، ج ۲، ص ۱۹۶

وقت کوئی حکم دے اور مامور یہ سمجھے کہ یہ امر حتمی نہیں ہے تو اس کو توقف سے کام لینا چاہئے تا کہ معلوم ہو جائے کہ آمر کا منشا کیا ہے۔

ایک پیشین گوئی

جناب رسول خداؐ حضرتؑ کے اس والہانہ عاشقانہ ادب وخلوص سے شدت سے متاثر ہوئے۔

امام نسائی کے حوالے سے علامہ زرقانی نے اس موقع کی جناب رسول خداؐ کی ایک پیشین گوئی نقل کی ہے جس سے حال و مستقبل میں حضرت علیؑ کے دینی کردار پر انتہائی تیز روشنی پڑتی ہے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: ''اما ان لک مثلها و ستاتیها و انت مضطر۔[1]

علامہ زرقانی اس پیشین گوئی کی شرح میں لکھتے ہیں کہ جناب رسول خداؐ نے (حضرت علیؑ کے عہد میں) حضرت علیؑ اور امیر معاویہ کے درمیان نزاع میں جو حکم مقرر ہوئے تھے اور اس موقع پر جو بات پیش آئی تھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جنگ صفین کے سلسلے میں حکمین کے مقرر ہونے کے موقع پر کاتب نے لکھا۔ ''هذا اما صالح علیه امیر المومنین'' امیر معاویہ نے کہا کہ اگر میں آپ کو امیر المومنین سمجھتا ہوتا تو یہ نزاع کیوں ہوتی۔ امیر المومنین کے لفظ کو مٹا دیجئے۔ ''علیؑ ابن ابی طالب لکھئے۔ حضرت علیؑ نے اس موقع پر فرمایا تھا ''الله اکبر مثل بمثل محمد'' یہ صلح حدیبیہ کے واقعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔[2]

محدث دہلوی مولانا شاہ عبد الحق نے معارج النبوت کے حوالہ سے جناب رسول خدا کی اس پیشین گوئی کو درج فرمایا ہے۔[3]

ایک دل گداز واقعہ

ابھی عہد نامہ کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ایک پر درد واقعہ پیش آ گیا۔ سہیل بن عمرو جس نے قریش کی طرف سے صلح نامہ پر دستخط کیے تھے جناب رسول خداؐ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا بیٹا ابو جندل عامری الم انگیز صورت میں سامنے آ گیا۔ ابو جندل مسلمان ہو گیا تھا اس کی سزا میں اس کے باپ سہیل نے اسے ہتھکڑی بیڑی پہنادی تھی اور قید کر دیا تھا وہ کسی طرح قید سے نکل کر پاؤں کی بیڑیوں کو سنبھالتا ہوا رسول خداؐ کے پاس اچانک آ کھڑا ہوا اس نے حضرتؐ سے اپنے باپ کے ظلم کے خلاف فریاد کی اور کہا: ''مجھے اسلام کے قبول کرنے کی سخت سزائیں دی جا رہی ہیں۔ آپ مجھے ان

۱۔ قسطلانی، شرح مواہب لدنیہ، ج ۲، ص ۱۹۶، مطبوعہ مصر ۱۳۲۵ھ ۲۔ ایضاً ۳۔ مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۸۶

کے ظلم سے نجات دلائیں۔ اس کی حالت زار سے سب مسلمان غمگین ہوگئے۔ خود جناب رسول خداؐ کے دل پر کیا بیتی ہوگی اس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ مگر پیغمبر موید من اللہ ہوتے ہیں۔ وحی ربانی حالات کا آغاز وانجام ان کے پیش نظر کر دیتی ہے۔ صبر و برداشت، حلم وضبط نفس ان کا پیغمبرانہ جوہر ہوتا ہے۔ انسان کا درد سب سے زیادہ ان کے دل میں ہوتا ہے۔ خدا کا خوف اور اس سے محبت میں وہ ساری امت سے بالا تر ہوتے ہیں۔ دین کے احترام و اعزاز کی سب سے زیادہ فکر انہیں ہوتی ہے۔ بے جا ذلت سے انکار سب سے زیادہ انہیں ہوتا ہے۔

مگر وہ الٰہی مصلحت کے تابع ہوتے ہیں ان کے جذبات کی عنان حکمت ومصلحت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے ابو جندل کی حالت زار اور اس کی دردناک فریاد نے مسلمانوں کے دل ہلادئے۔ مگر جناب رسول خداؐ کوہ ضبط بنے رہے۔ سہیل نے کہا۔ معاہدہ کے مطابق آپ کو اسے مجھے واپس کر دینا چاہیے۔ رسول خداؐ نے سہیل سے اس کی سفارش کی مگر وہ راضی نہ ہوا۔ معاملہ یوں ختم ہوا کہ حویطب بن عبد العزیٰ نے وعدہ کیا کہ وہ اُسے باپ کے تشدد سے بچائے گا۔ جناب رسول خداؐ نے ابو جندل سے فرمایا کہ ہم عہد کر چکے ہیں اس لیے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے سے معذور ہیں۔ اللہ تمہاری جلد مدد کرے گا۔ صبر سے کام لو۔ ہم عہد شکنی نہیں کر سکتے۔[1]

بعض مسلمانوں کی غلط فہمی

قریش نے صلح کے شرائط میں اپنا مفاد غالب رکھا تھا اور رسول خداؐ کو مصلحتاً ان شرائط کو قبول کرنا پڑا تھا۔ اس سے بعض مسلمان رنجیدہ تھے بغیر عمرہ بجالائے واپسی پر انہیں تکلیف تھی۔ انہوں نے رسول خداؐ کے خواب کو اسی سال سے متعلق کرلیا تھا اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ اس موقع پر مکہ فتح ہوجائے گا۔ مجموعی طور پر شرائط صلح سے وہ مطمئن نہ تھے۔

زرقانی نے لکھا ہے۔ ''فکرہ المومنون ذلک وامتعضوا منہ'' مومنین نے اسے ناپسند کیا اور اس سے بددل ہوئے۔[2]

مولانا شاہ عبد الحق دہلوی نے لکھا ہے۔

''روز صلح حدیبیہ صحابہ بغایت اندوہناک ومحزون گشتند''۔[3] تاریخ نے دوسرے صحابہ کے بیانات قلمبند نہیں کیے اس لیے نہیں بتایا جاسکتا ہے کہ کس نے اپنی دلی تکلیف کن لفظوں میں بیان کی صرف

۱- زرقانی، ج ۲، ص ۲۰۲ ۲- ایضاً ۳- مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۶۶

حضرت عمر کے تاثرات تاریخ نے نقل کیے ہیں۔ غالبا اس کی وجہ یہ ہو گی کہ حضرت عمر کی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔ مولانا شاہ عبد الحق دہلوی خود حضرت عمر کا بیان نقل کرتے ہیں:

''در آمد در آن روز در دل من امر عظیم مراجعت کردم با حضرتؐ کہ ہرگز مثل آن نہ کردہ بودم۔ رفتم بہ نزد رسول و گفتم کہ آیا تو پیغمبر حق نیستی؟ فرمود بلے ہستم۔ گفتم نہ ما بر حقیم؟ و مخالفان ما بر باطل؟ گفت بلی۔ گفتم پس چرا ما این مذلت و حقارت کشیم، و باین طور صلح نمودہ باز گردیم۔ آن حضرت فرمود: اے پسر خطاب بدرستی کہ من فرستادۂ خدایم، و بی فرمانی وی نمی کنم۔ وی ناصر و معین من است۔ او امر اضائع نخواہد گزاشت۔ عمر گفت گفتم یا رسول اللہ نہ تو ما را وعدہ کردی کہ زود باشد کہ بمکہ رویم و طواف خانۂ کعبہ بجائی آریم؟ فرمود آری کردم، ولیکن نہ گفتم کہ امسال۔ عمر غم مخور کہ تو بزیارت کعبہ خواہی رسید۔

گفت عمر پس ہمچناں حزین واندوہ گین از پیش آن حضرتؐ بر خواستم و بہ نزد ابو بکر صدیق رفتم۔ ہماں حکایت کہ بغرض حضرتؐ رسانیدہ بودم باری نیز گفتم و ہماں جواب کہ آن حضرت گفتہ بود از ابوبکر نیز شنیدم''۔[۱]

''یعنی اس روز میرے دل میں امر عظیم پیدا ہوا اور میں نے آنحضرتؐ سے ایسی مراجعت کی کہ اس سے پہلے کبھی نہ کہ تھی۔ میں نے رسول خداؐ سے کہا کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا: میں پیغمبر برحق ہوں۔ میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے مخالف باطل پر نہیں ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا پھر ہم ایسی ذلت وحقارت آمیز صلح کیوں کر کے واپس جائیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے فرزند خطاب! یقیناً میں خدا کا رسولؐ ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ وہ میرا ناصر و مددگار ہے۔ وہ مجھے ضائع نہ فرمائے گا۔ حضرت عمر نے کہا آپ نے ہم سے وعدہ نہیں فرمایا تھا کہ جلد ہم مکہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ حضرتؐ نے فرمایا ہاں میں نے کہا تھا لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ اسی سال طواف کعبہ کریں گے۔ اے عمر غم نہ کرو کعبہ کا طواف تم کرو گے۔ حضرت عمر کا بیان ہے کہ میں اسی طرح حزین واندوہ گیں آنحضرت کے پاس سے اٹھ کر حضرت ابو بکر کے پاس گیا اور جو کچھ آنحضرتؐ رسول خدا سے کہا تھا ان سے بھی کہا اور جو جواب رسول خداؐ نے دیا تھا انہوں نے بھی وہی جواب دیا۔ زرقانی نے بھی یہ بیان نقل کیا ہے۔[۲]

مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی کی رائے ہے کہ حضرت عمر کا یہ قول استکشاف واستفسار پر مبنی تھا۔[۳]

۱۔ مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۰۷ ۲۔ شرح مواہب لدنیہ، ج ۲، ص ۳۴ ۳۔ مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۸۷

لیکن اگر معاملہ استکشاف واستفسار کی حد تک ہوتا تو رسول خداؐ سے مراجعہ کے بعد اطمینان ہوجاتا۔ لیکن ان کے شدید تردد میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور اسی لب ولہجہ میں انہوں نے حضرت ابو بکر سے اسی موضوع پر گفتگو کی۔ عرصہ کے بعد جب صلح کے مفید نتائج ظاہر ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کا مراجعہ بے محل تھا۔

حضرت عمر زندگی بھر اپنے اس فعل کی تلافی کرتے رہے۔ مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے ان کا بیان نقل کیا ہے:

''عمری است کہ از وسوسۂ شیطان و کید نفس کہ در آن روز ہا در خاطر من گزشتہ بود استغفاری می کنم۔ و باعمال صالحہ از صوم وصلوٰۃ و اعتاق وتصدقات توسل می جویم تا کفارت آن برأت من گردد۔[1]

یعنی عرصہ سے اس دن کے وسوسہ شیطانی وکید نفس سے میں استغفار کرتا ہوں۔ نیک اعمال جیسے نماز روزہ غلاموں کی آزادی تصدق سے توسل کرتا ہوں تا کہ اس کا کفارہ ادا کر کے بری ہوجاؤں۔ تقریبا یہی مفہوم ابن ہشام نے سیرت میں[2] اور زرقانی نے درج کیا ہے۔

صلح حدیبیہ کا فوری اثر

اس معاہدہ کے بعد ہی قبیلہ خزاعہ نے رسول خدا سے معاہدہ کرلیا اور بنوبکر قریش کے حلیف ہوگئے مسلسل جنگ نے زندگی میں جو انقباض اور تنگی پیدا کردی تھی اس میں کمی کے آثار یہیں سے شروع ہوگئے۔

حضرت ام سلمہ کی موقع شناسی

معاہدہ کی تکمیل کے بعد تین دن تک آنحضرتؐ نے حدیبیہ میں قیام کیا۔ پھر مدینہ واپسی کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ یہیں سے قربانی کریں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ یہاں تک کہ صحیح بخاری میں ہے۔ تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے دخل علی الناس من ذلک امر عظیم حتی کادوا یھلکون[3] اس شدید تاثر کا ذکر کیا ہے۔ جب لوگوں نے آنحضرتؐ کی بار بار تاکید پر بھی تعمیل نہیں کی تو حضرت نہایت تکلیف کے ساتھ گھر میں تشریف لے گئے۔ زرقانی نے اس موقع کے لئے آنحضرتؐ کی نسبت فاشتد ذلک علیہ کا فقرہ لکھا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں: آنحضرتؐ نے امّ المومنین حضرت امّ سلمہ

۱- مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۸۷ ۲- ۲۰۵/۲ شرح مواہب، ج ۲، ص ۲۱۶ ۳- ۲۱۷/۲ زرقانی، ج ۲، ص ۲۰۸

سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈوائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔ [۲]

تمام مغازی نگاروں نے اس مقام پر امّ المومنین حضرت امّ سلمہ کی فہم ودانش اور مزاج دانی کی داد، دی ہے۔ سیرت نگار، مورخ وادیب سب نے ان کی عظیم صلاحیتوں کو سراہا ہے۔ علامہ زرقانی نے حضرت امّ سلمہ کی آنحضرتؐ سے گذارش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

وفیہ فضل الشورۃ۔ ومشارۃ المراۃ الفاضلۃ وفضل امّ سلمہ۔ بوفورعقلھا۔ حتی قال امام الحرمین لانعلم امراۃ اشارت فاصابت الا ام سلمہ"

''اس میں مشورہ کی فضیلت ہے۔ اور فاضلہ عورت سے مشورہ کی اجازت۔ اور ام سلمہ کے فضل اور کمال عقل کا بیان۔ یہاں تک کہ امام الحرمین نے کہا: مجھے حضرت امّ سلمہ کے سوا کسی عورت کے بارے میں علم نہیں ہے کہ اس نے مشورہ دیا ہو اور مشورہ صائب بھی رہا ہو'' ۔ [۱]

صلح حدیبیہ شکست نہیں بلکہ فتح تھی

مسلمانوں کا قافلہ مدینہ واپس ہوگیا راستے میں یہ آیت اتری:

انّافتحنا لک فتحا مّبینا ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ [۲]

مولانا شبلی لکھتے ہیں۔ تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے خدا نے اسے فتح کہا۔ آنحضرتؐ نے حضرت عمر کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں۔ [۳]

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مصری فاضل اس موقع پر صلح حدیبیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ صلح حدیبیہ کھلی ہوئی تھی۔ زمانے نے ثابت کردیا کہ یہ معاہدہ بلند حکمت اور عمیق نظر کا نتیجہ تھا۔ اس نے اسلام اور سارے عرب کے مستقبل پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ پہلی بار قریش نے اس معاہدہ کے ذریعہ تسلیم کیا کہ محمدؐ باغی نہیں ہیں بلکہ قریش کے مد مقابل اور ہم مرتبہ اور ایک ریاست کے سربراہ ہیں۔ اس معاہدہ کے ذریعہ سے قریش نے اسلامی حکومت اور اس کے قیام کو تسلیم کرلیا اور یہ مان لیا کہ مسلمانوں کو بھی خانۂ خدا کی زیارت کا حق ہے۔ وہ شعائر حج کو انجام

۱- سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۴۲۱ ۲- سورہ فتح، آیہ ۱ ۳- سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۴۲۲

دے سکتے ہیں۔ یہ تسلیم کرلیا کہ بے شبہ جزیرۂ عرب کے مذاہب میں اسلام بھی ایک مسلم دین ہے۔

دوسال یا دس سال کے معاہدہ نے مسلمانوں کو جنوب کی طرف سے مطمئن بنادیا اب قریش کی غارت گری کا اندیشہ نہیں رہا۔ اس صلح سے اسلام کو موقع ملا کہ وہ پھلے پھولے اور پھیلے قریش ہی اسلام کی ترقی میں سدراہ تھے جب ان سے جنگ بندی معاہد ہوگیا تو اسلام کی قوت نمو اعجاز نمائی کرنے لگی صلح حدیبیہ کے موقع پر صرف ایک ہزار چار سو مسلمان آئے تھے صرف دو سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ جب جناب رسول خداؐ فتح مکہ کے لئے آمادہ ہوئے اور مکہ تشریف لائے تو آپ کے ہم رکاب دس ہزار مسلمان تھے۔ معاہدہ حدیبیہ کی حکمت پر جن لوگوں کو شک ہوگیا تھا ان کا سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ رسولؐ خدا نے یہ کیوں مانا کہ قریش سے جو مسلمان ہو کر مدینہ آئے گا اسے مکہ واپس کرنا ان پر لازم ہوگا اور اگر مدینہ سے کوئی مسلمان مرتد ہوکر ان کے پاس جائے گا تو وہ واپس نہ کریں گے۔ گویا حقوق میں ناہمواری پر رضامندی تھی۔ جناب رسول خداؐ نے اس کے جواب میں اسی وقت فرمادیا تھا کہ جو مسلمان مرتد ہو کر قریش کے پاس چلا جائے گو وہ ہمارے کس کام کا ہوگا اس کی واپسی سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ اور قریش میں جو اسلام قبول کرے گا اور مسلمانوں سے ملنا چاہے گا اللہ اس کے لیے کوئی راستہ نکالے گا۔ بہت جلد واقعات نے حکمت نبویؐ کی تصدیق کردی۔ اور ثابت کردیا کہ اسلام نے صلح حدیبیہ سے بہت بڑا فائدہ حاصل کیا۔ معاہدہ کے چند مہینے کے بعد رسولؐ خدا نے غیر ممالک کے امرا و سلاطین کو پیام اسلام پر غور کرنے کی دعوت دی۔ تمام بڑی قومیں اس نئے دین کی اہمیت کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

واقعات نے ثابت کردیا کہ یہ رائے حکیمانہ تھی۔ ابو بصیر مسلمان تھے۔ وہ مکہ سے مدینہ چلے آئے۔ معاہدہ کی رو سے رسول خداؐ پر ان کا واپس کرنا لازم تھا قریش نے دو آدمی بھی بھیج دیے کہ معاہدہ کی رو سے ان کو ہمارے سپرد کرنا آپ کے لئے ضروری ہے۔ رسول خداؐ نے ابو بصیر سے فرمایا ہم نے قریش سے معاہدہ کیا ہے جس کی تمہیں خبر ہے۔ ہمارے دین میں غداری وعہد شکنی جائز نہیں ہے اللہ تمہارے لیے اور مکہ کے دوسرے بے سہارا مسلمانوں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ ابو بصیر نے بار بار آنحضرتؐ سے کہا آپ مجھے ان مشرکوں کے حوالے کرتے ہیں جو مجھے کفر پر مجبور کریں گے۔ آپ نے فرمایا خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا۔ تم ان دونوں آدمیوں کے ساتھ مکہ واپس جاؤ۔ ابو بصیر جب ذوالحلیفہ پہونچے تو انہوں نے قریش کے ان دوآدمیوں میں سے ایک کو قتل کردیا دوسرا ڈر کر

بھاگا اور مدینہ چلا آیا اور رسول خداؐ سے پناہ مانگی اور خبر دی کہ ابو بصیر نے اس کے ساتھی کو قتل کر دیا۔ حضرت نے اسے پناہ دی تھوڑی دیر میں ابو بصیر بھی حضرت سے ملے اور عرض کی آپ نے عہد کے مطابق مجھ کو قریش کے آدمیوں کے حوالے کر دیا اب آپ کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ رسول خداؐ نے فرمایا کہ پھر قریش تمہاری واپسی کو کہیں گے تو میں واپس کر دوں گا۔ ابو بصیر یہاں سے چلے گئے۔ اور مقام ''عیص'' میں سکونت اختیار کر لی جو سمندر کے کنارے ذومرہ کے پاس تھا ادھر سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے مکہ کے مسلمانوں کو جب اس پناہ گاہ کی خبر ہوئی تو یہیں جمع ہونے لگے مکہ کے تقریباً تین سو پناہ گزین مسلمان یہاں جمع ہوگئے مکہ کے جو تجارتی قافلہ ادھر سے گزرتے یہ لوگ انہیں قتل کر دیتے اور ان کا سامان اپنے قبضے میں کر لیتے۔ قریش کو معاہدہ کی یہ شرط اب بہت مہنگی پڑی جس میں انہوں نے مسلمانوں سے عہد لیا تھا مکہ کا جو مسلمان مدینہ جائے گا اسے اہل مکہ کے حوالے کر دینا ان پر لازم ہوگا۔ وہ آخر خود ہی اس شرط کے منسوخ کرنے کے خواستگار ہوئے اور کہا کہ مکہ سے جو مسلمان مدینہ جانا چاہے اس سے کوئی روک ٹوک نہیں کی جائے گی اور مسلمانوں پر اس کے واپس کرنے کی ذمہ داری نہ ہوگی۔ رسول خدا نے ابو بصیر کو عہد نامہ کی اس شرط کی منسوخی کی اطلاع دی۔ مسلمانان مدینہ واپس آ گئے۔[1] وہ شرط بعض مسلمانوں پر سخت گراں گزری تھی۔ اس کا انجام سب نے دیکھ لیا کہ وہ خود قریش کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی۔ جس وقت انہوں نے یہ عالمانہ شرط عہد نامہ میں مسلمانوں پر عائد کی تھی ان کی محدود نگاہ اس کے نتائج تک نہیں پہونچ سکی۔ یہ شرط مردوں کے واسطے تھی عورتوں کو رسول خداؐ نے اس سے مستثنیٰ رکھا تھا۔ قرآن مجید نے سورۂ ممتحنہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

''ایماندارو! جب تمہارے پاس ایماندار عورتیں اپنا وطن چھوڑ کر آئیں تو تم ان کی جانچ کر لو۔ خدا تو ان کے ایمان سے واقف ہی ہے۔ اگر تم ان کو مومنہ سمجھو تو انہیں کافروں کے پاس واپس نہ کرنا۔ نہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافروں کے لیے حلال ہیں''

ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ چلی آئیں اور معاہدہ کی شرط ابھی منسوخ نہیں ہوئی تھی ام کلثوم کے بھائی عمارہ اور ولید نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا حضرت نے واپس نہیں کیا اور فرمایا یہ شرط مردوں کے متعلق تھی۔[1]

۱۔ مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۹۴

صحابہ میں سے جن کی بیویاں مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک مسلمان نہیں ہوئی تھیں ان کو ان لوگوں نے طلاق دے دی۔

صلح حدیبیہ کے بعد

صلح حدیبیہ کے بعد ۷ھ میں یہود کی مدینہ کی فوجی طاقت ختم ہوگئی۔ خیبر فتح ہوگیا اور وہ یہودی جو اسلامی ریاست کی اقلیت تھے لیکن مسلمانوں کے دشمنوں سے ملے ہوئے تھے اور اسلامی ریاست کی تخریب میں ان کی دولت صرف ہوتی تھی خیبر کی فتح کے بعد مسلمانوں کو ایسے شر سے نجات مل گئی۔ اگر صلح حدیبیہ نے قریش کی آویزش سے مطمئن نہ کیا ہوتا تو یہودیوں کی تخریب پسندی وفتنہ پردازی کا علاج آسان نہ تھا۔

مسلمانوں کو ایک وقت میں دو دشمنوں کی شرارت سے اپنی حفاظت میں کافی دشواری پیش آئی۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بدر سے صلح حدیبیہ تک فریقین میں جو جنگیں ہوئی ہیں اور مسلمانوں کو جو فتح نصیب ہوتی رہی ہے اور ان سب میں بڑی فتح صلح حدیبیہ تھی۔ قریش اور مسلمان ایک دوسرے سے آزادانہ ملنے لگے دلیل وبرہان کے کام میں لانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ آپس میں انس بڑھنے لگا اور اسلام کی خوبیوں پر توجہ کے مواقع پیدا ہونے لگے۔

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں طے پایا تھا کہ مسلمان آنے والے سال میں مکہ آ کر عمرہ ادا کریں گے۔ اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اس بنا پر آنحضرتؐ نے ۷ھ ذی قعدہ میں عمرہ کا قصد فرمایا۔ عویف بن اصبط دیلی یا کلثوم بن حصین غفاری کو مدینہ کا حاکم بنایا۔ جو مسلمان صلح حدیبیہ کے موقع پر شریک تھے ان سب کو ساتھ لیا۔ بس وہ لوگ نہ جاسکے جو جنگ خیبر میں شہید ہوگئے تھے یا جو طبعی موت مرگئے تھے۔ معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان اپنے ساتھ ہتھیار نہ لائیں گے۔ اس لئے اسلحہ جنگ ''بطن یاجج'' میں چھوڑ دیے گئے یہ مقام مکہ سے آٹھ میل پر واقع تھا۔ دو سو سواروں کا ایک دستہ ہتھیار کی حفاظت پر مقرر کیا گیا۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ کے ساتھ ہتھیار ہیں اور معاہدہ میں ہے کہ آپ ہتھیار اتنا ہی لاسکتے ہیں جس کی ایک مسافر کو ضرورت پڑتی ہے اور تلواریں نیام میں ہوں

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۲۱

گی۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ ہم حرم میں ہتھیار کے ساتھ داخل نہ ہوں گے لیکن اگر قریش نے شرارت کی تو ہتھیار قریب ہی ہونگے تا کہ ہم اپنی حفاظت کرسکیں۔ محمد بن مسلمہ فوج کے ساتھ ''مرالظہران'' کے قریب پہونچے تو وہاں قریش کے کچھ آدمی ملے۔ انہوں نے پوچھا کہ مسلمانوں کو فوج کے ساتھ آنے کا کیا سبب ہوا۔ بتایا گیا کہ رسول خداؐ یہاں کل انشاء اللہ وارد ہوں گے۔ ان لوگوں نے قریش کو خبر کی تو وہ خوف زدہ ہوگئے۔ ان لوگوں نے کہا ہم نے نئی بات نہیں کی اور ہم معاہدہ پر قائم ہیں پھر محمدؐ سے کیوں جنگ کریں گے۔ ان لوگوں نے ''مکرز'' کو قریش کی ایک جماعت کے ساتھ آنحضرت کے پاس بھیجا۔ ان لوگوں نے حضرتؐ سے کہا کہ ہم نے آپ کے بچپنے سے اس عمر تک کبھی آپ سے کوئی عذر نہیں دیکھا آپ حرم میں اپنی قوم کے خلاف مسلح داخل ہوں گے۔ حالانکہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ صرف مسافر کے ہتھیار آپ ساتھ رکھ سکیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ جیسا معاہدہ ہوا ہے میں اس کے مطابق عمل کروں گا۔ میں حرم میں مسلح داخل نہ ہوں گا۔ مکرز نے حضرتؐ کی نیکی و وفا کی تعریف کی۔ اور قریش کو مطمئن کیا کہ محمدؐ معاہدہ کی شرط پر قائم ہیں۔ بڑے جوش وخروش سے مسلمانوں نے عمرہ ادا کیا۔

اہل مکہ نے بد دلی سے معاہدہ میں یہ مانا تھا کہ مسلمان سال آیندہ عمرہ کے لئے مکہ آئیں گے۔ مگر جب وہ وقت آیا تو تعصب اور احساس کمتری نے قریش کے دل میں چٹکیاں لیں وہ عمرہ کے لیے مکہ میں مسلمانوں کے داخلہ کے منظر کے دیکھنے کی تاب نہ لاسکے۔ یہ لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے۔[۱] قریش تین دن کے بعد حضرت علیؑ کے پاس آئے اور کہا محمدؐ سے کہئے کہ شرط پوری ہوچکی آپ مکہ سے چلے جائیں۔ حضرت علیؑ نے آنحضرتؐ کو ان کا پیام پہونچادیا۔ آپ اسی وقت روانہ ہوگئے۔

فتح مکہ

رمضان المبارک ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء عرب کے نظام زندگی میں جنگ کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ عرب امن پسندی کو حقیر سمجھتے تھے۔ جنگجو انسانوں کو سماج کی صف اوّل میں رکھتے تھے ان کی ساری ادبی فضا میں جنگ کی گونج ملے گی۔ صلح کے دن ان سے مشکل سے کٹتے تھے۔ ان کا شاعر کہتا ہے کہ اگر ہماری خود کسی سے جنگ نہیں ہوتی تو ہم کسی دوسرے کے ساتھ جنگ میں کود کر جنگ کی آگ

۱۔ زرقانی، ۲، ص ۲۵۵

بھڑکانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔

قریش نے جناب رسولؐ خدا سے جنگ بندی معاہدہ تو کرلیا تھا لیکن جنگی افتادِ طبع کو وہ کیا کرتے۔ انہیں فضا سونی معلوم ہوتی ان کا دل گھبراتا تھا۔ آخر انہوں نے جنگ سے سودا کر ہی لیا اگرچہ یہ سودا بہت زیادہ مہنگا پڑا۔

قریش کی عہد شکنی

اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ صلح حدیبیہ کی بنا پر قبیلہ خزاعہ آنحضرتؐ کا حلیف ہوگیا تھا اور ان کا حریف قبیلہ بنو بکر قریش کا حلیف ہوگیا تھا۔ ان دونوں قبیلوں میں عرصہ سے کشیدگی چلی آرہی تھی۔ بنوبکر کا سینہ اپنے حریف قبیلۂ خزاعہ کی دشمنی سے سلگ رہا تھا وہ زیادہ دن ضبط نہ کرسکے۔ قریش کے وہ حلیف بن ہی چکے تھے ان کے تعاون پر ان کو بھروسہ تھا۔ بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کردیا۔ بنی بکر جنگ کے لئے چھیڑ چھاڑ کررہے تھے ان کے قبیلے کے ایک شخص نے جناب رسولؐ کی ہجو کی۔ خزاعہ اپنے حلیف کی ہجو نہ سن سکے۔ قبیلہ خزاعہ کے کسی شخص نے غصہ میں اس کا منہ اور سر زخمی کردیا۔ بنی بکر اپنے آدمی کی حمایت کو دوڑ پڑے اس طرح جنگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ قریش کے بعض سفیہ عکرمہ بن ابی جہل۔صفوان بنی امیہ بن عمرو وغیرہ چہروں پر نقابیں ڈال کر شبخون میں بنی بکر کے مددگار بن گئے۔ خزاعہ نے حرم میں پناہ لی لیکن وہاں بھی جان محفوظ نہ رہی۔[1]

اس طرح قریش نے حدیبیہ میں جو معاہدہ رسولؐ سے کیا تھا خود اپنے ہاتھوں سے اسے پارہ پارہ کردیا۔

رسولؐ کی بارگاہ میں بنی خزاعہ کا استغاثہ

عمرو بن سالم خزاعی فریاد لے کر جناب رسول خداؐ کے پاس آیا۔ آنحضرت اس وقت ایک جماعت کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ عمرو بن سالم نے ذیل کی نظم پڑھی۔

۱) یا ربّ انی ناشد محمدا حلف انبیا و ابیه الا تلدا

پروردگار! میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاتا ہوں جو کہ ہمارے خاندان اور ان کے دادا عبد المطلب سے ہوا تھا۔

۲) ان قریشا اخلفوک الموعدا و نقضوا میثاق الموکدا

۱- مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۲۷۳

قریش نے آپ سے جو عدم جنگ بندی کا معاہدہ حدیبیہ میں کیا تھا آپ کے حلیف پر حملہ کر کے اسے توڑ ڈالا۔

۳) قدعموا ان لست تدعوا مدا فانصر هداك الله نصرا ابدا

انہوں نے گمان کیا کہ آپ ہماری مدد کے لئے کسی کو نہ بلائیں گے۔ آپ ہماری پائدار اور مستحکم مدد فرمایئے۔

۴) وداع عياد الله يا تو امدادا فيهم رسول الله قد تحردا

آپ بندگان خدا کو ہماری مدد کے لئے بلایئے وہ فوج در فوج آجائیں گے ان مدد کرنے والوں میں رسول خدا بھی ہوں گے جو دشمن کی سرکوبی کے لئے پوری تیاری سے آئیں گے۔

۵) ان سيم خفا وجهه تربدا هم بيونا بالوتير هجدا وقتلونا ركعا و سجدا۔ [1]

اگر ان کو یا ان کے کسی حلیف کو کوئی ذلیل کرتا ہے تو غصہ سے ان کے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ انہوں نے شب میں ہم پر حملہ کیا۔ رکوع سجدہ کی حالت میں ہمیں قتل کیا۔ عمرو بن سالم تنہا نہیں آیا تھا وہ ایک وفد کی قیادت کرتا تھا جس میں چالیس خزاعی تھے۔ [2]

تلافی کا موقع دیا گیا

جناب رسول خداؐ کو اس سانحہ سے بڑا دکھ ہوا لیکن آپ نے فوراً کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ قریش کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش فرمائیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کی جائے۔

۱- خزاعہ کے مقتولوں کا خوں بہا دیا جائے۔

۲- قریش نبو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

۳- اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قریش کو جب ان شرطوں کا علم ہوا تو قرظہ بن عمرو نے قریش کی طرف سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور رہے [3] (زرقانی ۲۸۲) (لاندی ولا نبرء لكنا ننذ اليه على سواء) اس تیز مزاج و جلد باز نے حالات کا پوری طرح جائزہ لیے بغیر فتنہ کی آگ پر تیل چھڑکا۔

۱- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۳ ۲- ایضاً ۳- زرقانی، ص ۲۸۲

شرمندگی و پشیمانی

لیکن جب رسول خداؐ کا وفد مکہ سے واپس آ گیا تو انہیں ہوش آیا کہ ان لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی ہے۔ وہ اس وقت نادم ہوئے جبکہ ندامت ایک ذہنی کرب تو بن سکتی ہے لیکن اس سے دوسرے کو متاثر نہیں کیا جا سکتا۔

صلح و امن کی معقول تجویزوں کو ٹھکرا کر معاہدہ حدیبیہ کی شکست پر اصرار کرنا بڑا احمقانہ فعل تھا لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ قریش نے رسولؐ خدا کے ساتھ بے ادبی و جسارت و گستاخی و ایذا رسانی کی کون سی صورت اٹھا رکھی تھی کہ ان میں سے کوئی شخص اس جسارت پر معافی مانگتا اور صلح حدیبیہ کی توسیع و تحفظ و تجدید کی درخواست کرتا۔

ابوسفیان کی ناکام کوشش

البتہ ان میں ابوسفیان ایک حیا دار شخص تھے جنہوں نے جذبۂ حیا و غیرت کو مغلوب کر لیا تھا۔ اور وہ وقت و مصلحت کی تبدیلی سے ہر وقت بدل سکتے تھے۔ رسول خداؐ سے بہتر اپنے معاصرین کے نفسیات سے کون باخبر تھا۔

آنحضرتؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا تھا کہ ابوسفیان آنے والے ہی ہیں۔ مگر یہ بھی یہ نہ کہیں گے کہ معاہدہ تجدید کر دیجئے اور اس کی مدت بڑھا دیجئے۔[1] مکہ میں رسول خدا اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کا نام ابوسفیان تھا۔ یہ آگ پر تیل چھڑکنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ان کی بیوی ہندہ نے جنگ احد میں تہذیب انسانی کی صورت جس طرح بگاڑی تھی اسے ساڑھے تیرہ سو سال کی مدت میں مسلم و غیر مسلم مورخ عموماً نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ معاہدہ حدیبیہ کے ٹوٹ جانے کے بعد ہندہ کو اپنے اعمال کے ردعمل کے تصور نے بدحواس کر دیا۔ وہ ڈراؤنے خواب دیکھنے لگی۔ ابوسفیان نے ہندہ کی اس ہیجانی کیفیت اور اس کے خوفناک خواب کا حرث بن ہشام اور عبداللہ بن ابی ربیعہ سے ذکر کیا۔

قد رأت هند بنت عتبه رويا كرهتها و خفت من شرها. قالوا. وماهي قال مارات دما اقبل من الحجون بسيل حتى وقف بالخندمه مليا ثم كان انك الدم كان لم يكن

۱- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۶۳

فکر هو الرویا۔[۱]

ہند بنت عتبہ نے ایک خواب دیکھا ہے جس کے شر سے میں خوف زدہ ہوں۔ لوگوں نے پوچھا وہ خواب کیا ہے؟ اس نے کہا اس نے خواب دیکھا ہے کہ حجوں سے خون کی سیل چلی اور خندمہ میں ٹھہر گئی۔ پھر یہ خون غائب ہوگیا۔ لوگوں نے اس خواب کو ناپسند کیا۔

جس نے یہ خواب سنا خوفزدہ ہوگیا۔ خوف زدہ ہونے کا سبب واضح ہے۔ انہوں نے جو بے حساب مظالم اپنے ضمیر کی آواز کو نظر انداز کر کے مسلمانوں پر کیے تھے ان کے خیال میں اب اس کے حساب وکتاب اور پاداش کا وقت آ گیا۔

ابوسفیان نتائج کے دھارے کو موڑنے کی فکر میں مدینہ پہونچ گئے۔ ان کی بیٹی امّ المومنین حضرت امّ حبیبہ جناب رسول خداؐ کی بیوی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ذریعہ سے تمام ناسازگار حالات کو بدل دیں گے۔ لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی مایوسی نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ ابوسفیان نے چاہا کہ جناب رسول خداؐ کے بستر پر بیٹھیں۔ زرقانی لکھتے ہیں فطوتہ۔ جیسے ہی ابوسفیان جناب رسول خدا کے بستر پر بیٹھنے کے لئے بڑھے حضرت امّ حبیبہ نے بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے کہا میں اس بستر پر بیٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ یا یہ بستر میرے قابل نہ تھا۔ حضرت امّ حبیبہ نے نہایت جرات سے جواب دیا۔

بل هو فراش رسول الله و انت رجل مشرک نجس و لم احب ان تجلس علی فراشه۔ بلکہ یہ رسول خدا کا بستر ہے اور آپ مرد مشرک نجس ہیں میں نے پسند نہیں کیا کہ آپ رسول خدا کے بستر پر بیٹھیں۔[۲]

ابوسفیان نے کہا میرے بعد تم میں برائی پیدا ہوگئی حضرت ام حبیبہ نے فرمایا بلکہ مجھے اللہ نے اسلام کی ہدایت کی۔ آپ قریش کے نمایاں آدمی ہیں۔ آپ کیوں اسلام قبول نہیں کر لیتے۔ آپ سے کیسے ہوتا ہے کہ آپ ایسے پتھر کی پوجا کرتے ہیں جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ ابوسفیان یہاں سے چلے گئے۔ اور خود جناب رسول خداؐ سے درخواست کی، صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید فرمادیجئے، اور معاہدہ کی مدت بڑھا دیجئے۔ رسول خداؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ابوسفیان حضرت ابوبکر وعمر کے پاس آئے اور سفارش کے خواہش مند ہوئے انہوں نے انکار کردیا۔ پھر وہ حضرت علیؑ

۱۔ زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۲ ۲۔ ایضاً، ص ۲۹۳

کے پاس آئے امام حسن گھٹنیوں چل رہے تھے۔ ابوسفیان نے حضرت علیؑ سے کہا۔ آپ رسول خداؐ سے ہماری سفارش کریں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ ہم اس معاملے میں جناب رسول خداؐ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ابوسفیان نے جناب سیدہؑ سے کہا کہ آپ اس بچہ کو حکم دیں کہ یہ لوگوں کو پناہ دے۔ یہ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے عرب کا سردار ہو جائے گا۔ جناب سیدہؑ نے فرمایا کہ ابھی ہمارے بچے کی یہ عمر نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو پناہ دینے کی ذمہ داری لے۔ اور جناب رسول خداؐ کے مقابلے میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ ابوسفیان بالکل ناکام واپس ہو رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ کچھ تو لے کے پلٹیں۔ انہوں نے پھر حضرت علیؑ سے کہا۔ ''معاملہ بہت شدید ہو گیا ہے''۔ آپ مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے تمہیں فائدہ پہونچ سکے۔ تم خود لوگوں کو پناہ دو اور مکہ واپس چلے جاؤ۔ ابوسفیان نے کہا کیا اس سے کچھ فائدہ پہونچے گا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ فائدہ نہیں پہونچے گا لیکن اس مشورے کے سوا اور کوئی بات میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ابوسفیان مسجد نبوی میں آئے اور پکار کر کہا میں نے لوگوں کو پناہ دی۔ پھر وہ مکہ چلے آئے۔ ابوسفیان کو مکہ واپس آنے میں دیر ہوئی۔ ان کے تلون مزاج اور مفاد پرستی سے کون واقف نہ تھا۔ قریش نے ان پر شدید تہمت لگائی کہ یہ صابی ہو گیا۔ اور مخفی طور پر اس نے محمد کی پیروی کر لی ہے اور اپنے اسلام کو چھپائے ہے۔ رات کو گھر پہونچے تو ان کی بیوی ہندہ نے کہا۔ تمہاری واپسی تاخیر سے ہوئی قریش نے تم پر تہمت لگائی۔ پھر پوچھا کہ تم نے کیا کیا۔ انہوں نے سب باتیں بتائیں۔ ہندہ نے ان کے سینہ پر ایک لات ماری اور کہا کہ تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔ ابوسفیان نے اساف اور نائلہ کے سامنے اپنا سر منڈوایا۔ اور قربانی کی اور ان کے سر پر خون ملا۔ اور کہا اس وقت تک تمہاری عبادت کرتا رہوں گا جب تک موت نہ آ جائے یا قریش مجھے تہمت سے بری نہ کر دیں۔[1] قریش کی جب ان سے ملاقات ہوئی تو قریش نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ ابوسفیان نے کہا میں نے محمدؐ سے بات کی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ ابوبکر و عمر سے ملا کچھ بھلا نہیں ہوا۔ علیؑ کو نسبتاً نرم پایا۔ انہوں نے مجھے ایک بات بتائی اس پر میں نے عمل کیا۔ معلوم نہیں کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا یا نہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا بتایا۔ کہا۔ انہوں نے کہا تم خود لوگوں کو پناہ دینے کا اعلان کر دو۔ میں نے اس

۱۔ زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۳

پر عمل کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا محمدؐ نے اس تجویز کو مانا۔ کہا نہیں لوگوں نے کہا پھر تو علیؑ نے تم سے ایک مذاق کیا۔ تم نے جو کچھ کہا اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہ پہونچے گا۔ ابوسفیان نے کہا اس کے سوا کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔[۱] قریش نے کہا نہ تم جنگ کی خبر لائے کہ ہم چوکنا ہو جاتے اور نہ صلح کی خبر لائے کہ ہم چین سے بیٹھتے۔[۲]

راز دارانہ تیاری

جناب رسول خداؐ نے قریش کو فتنہ و فساد کی راہ سے ہٹانے کے لئے تیاری کی اور عوام کو یہ نہیں بتایا کہاں جانے کے لئے تیاری ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت نے سفر کا مقصد راز میں رکھنا چاہا اور کسی کو یہ رائے زنی کا موقع نہیں دیا کہ فوج کہاں جائے گی۔ ابن ہشام نے[۳] لکھا ہے کہ رسول خداؐ نے عام طور پر لوگوں سے کہہ دیا کہ آپ مکہ جا رہے ہیں۔ اور لوگوں کو حکم دیا کہ مکہ چلنے کی تیاری کریں۔ اور حضرت نے خدا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

اللهم خذ العيون و الاخبار عن قريش حتى بغتها فى بلادها.

پروردگار! جاسوسوں کو اپنی گرفت میں لے۔ اور ان تک خبریں نہ پہونچنے دے۔ تاکہ ہم اچانک ان کے وطن میں پہونچ جائیں۔[۴]

حضرت کی یہ کوشش تھی کہ قریش کو آپ کی آمد کی اطلاع نہ ہو تاکہ وہ جنگ کی تیاری نہ کر سکیں اور بغیر کسی تصادم کے مکہ کی تاریخ بدل جائے۔

افشائے راز کا سانحہ

لیکن حاطب بن ابی بلتعہ (وعمرو بن عمیر نجمی حنیف بنی (سد) نے خفیہ طور پر ایک خط قریش کو لکھا جس میں یہ راز فاش کر دیا کہ رسول خداؐ مکہ کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔

اس خدمت کے عوض میں اس عورت کو ایک دینا ریا دس دینار دئے۔ اس سے کہا گیا کہ جہاں تک تمہارا بس چلے اس خط کو پوشیدہ رکھنا۔ شاہراہ سے نہ گزرنا وہاں فوج کا پہرہ ہے۔ اس عورت کا نام کسی نے ''مزنیہ'' کسی نے سارہ کسی نے اس کی کنیت کنود کسی نے اسارہ لکھا ہے۔ اصابہ میں لکھا ہے کہ عمرو بن ہاشم بن مطلب کی کنیز تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عباس کی کنیز تھی۔[۵] ابن ہشام نے لکھا

۱- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۶۴ ۲- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۴ ۳- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۶۴
۴- زرقانی، ج ۲، ص ۲۵ ۵- اصابہ، ج ۲، ص ۲۹۵

ہے کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ وہ بنی عبد المطلب کی کنیز تھی۔ اس نے یہ خط سر کے بالوں میں رکھ کر اس پر جوڑا باندھ لیا تھا رسول خداؐ کو اس سازش کی خبر ہوگئی۔ ابن ہشام کی روایت کی بناپر[۱] تفسیر بیضاوی میں عمار وطلحہ کا نام بھی اس ذیل میں ملتا ہے[۲] حضرت علیؑ اور ان کے ساتھی اس عورت کی گرفتاری کے لئے چلے۔

مدینہ سے کچھ فاصلے پر ''روضہ خاخ'' میں وہ عورت مل گئی۔ کسی نے لکھا کہ خلیقہ بن ابی احمد میں ملی خلیقہ مدینہ سے ۱۲ میل پر ایک منزل ہے۔ ابن عقبہ کا خیال ہے کہ ''بطن ریم'' میں ملی۔ مدینہ کی ایک وادی ہے زرقانی نے یہ احتمال پیدا کیا ہے کہ روضہ ایک جگہ ہوسکتی ہے جس میں ''بطن ریم وخلیقہ'' شامل ہوں۔ اس عورت کو سفر جاری رکھنے سے روکا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ تمہارے پاس جو خط ہے اسے پیش کرو۔ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے اس سے فرمایا:

"انّی احلف باللّٰہ ماکذب رسول اللّٰہ"

میں خدا کی قسم کھاتا ہوں رسول خدا نے جھوٹ نہیں کہا۔[۳]

تم خط پیش کردو ورنہ تمہاری تلاشی لی جائے گی۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ خط کو حاصل کرکے رہیں گے تو اس نے کہا۔ ذرا منھ پھیر لیجئے۔ حضرت علیؑ نے منھ پھیر لیا اس نے اپنے جوڑے سے خط نکالا اور حضرت علیؑ کو دے دیا۔

حضرت علیؑ نے وہ خط رسول خدا کی خدمت میں پیش کردیا۔

خط کا مضمون

یا معشر قریش فان رسول اللّٰہ جاءکم بجیش عظیم یسیر کالسیل فو اللہ لو جاءکم وحدہ نصر اللّٰہ والبحر لہ وعدہ بنصرہ فانظروا لانفسکم والسلام۔[۴]

گروہ قریش رسول خداؐ تمہارے پاس عظیم فوج لے کر آرہے ہیں۔ وہ مثل سیلاب کے چلتی ہے۔ اگر وہ تنہا آتے تب بھی اللہ ان کی مدد کرتا اور اپنا وعدہ نصرت پورا کرتا۔ لہٰذا اپنی خبر لو''۔

رسولؐ خدا نے حاطب سے باز پرس فرمائی اور پوچھا کہ یہ تم نے کیا حرکت کی۔

۱- ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۶۴ ۲- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹ ۳- ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۶۵

۴- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۸

حاطب نے کہا کہ میرے ایمان میں کوئی تغیر وتبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اصل وجہ یہ ہوئی کہ قریش سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ میں ان کا حلیف تھا۔ میرے اہل وعیال مکہ میں تھے میں نے اس خط کے ذریعہ سے ان پر احسان کرنا چاہا کہ وہ اس کے عوض میں صرف میرے متعلقین کی حفاظت کریں۔ ایک روایت میں ہے کہ میری تحریر سے اللہ اور اس کے رسول کو کچھ نقصان نہیں پہونچ سکتا تھا۔ ۱

حضرت عمر نے جناب رسول خداؐ سے کہا مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ ۲ (اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مومن سے خیانت کی ہے۔) ۳

ابن ہشام اور زرقانی نے لکھا ہے کہ جناب رسول خدا نے حضرت عمر کے جواب میں فرمایا۔

لعلی اللہ اطلع علی اصحاب بدریوم بدر فقال اعملوا ماشئتم غفرت لکم ''اللہ نے بدریوں سے جنگ بدر کے مقام پر فرمایا کہ جو چاہو کرو میں تم کو بخش دوں گا''۔ ۴

اس حدیث کی صحت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ حاطب نے اتنا بڑا ارتکاب جرم کیا۔ ایسی خطرناک سازش کی اگر وہ کامیاب ہوگئی ہوتی اور خط اہل مکہ کو پہونچ گیا ہوتا تو رسول خداؐ کی یہ تجویز پوری نہ ہوتی کہ بغیر ایک قطرہ خون کے ضائع ہوئے مکہ کی تاریخ بدل جائے۔ قریش مغلوب ہوجائیں اور مکہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوجائے۔ اس حدیث سے اہل بدر کو ارتکاب جرائم لامتناہی اور سازشوں کا حق حاصل ہوتا ہے اور ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جاسکتی ہے۔ زرقانی نے علماء کا اتفاق اس حدیث کی تشریح میں درج کیا ہے کہ اس بشارت کا تعلق احکام آخرت سے ہے۔ احکام دنیا سے نہیں۔ اہل بدر حدود و تعزیرات سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ۵ حاطب کے اس مکروہ فعل کو تاویل پر مبنی کہنا جرائم کے جواز کی ایک بڑی شاہراہ کھول دیتا ہے۔ کیا اگر کوئی غیر بدری جاسوسی کا کام کرتا تو اسے قتل کی سزا دی جاتی۔ صرف بدری ہونے کی وجہ سے حاطب سزا سے بچ گئے۔

ابن ہشام اور زرقانی نے لکھا ہے کہ حاطب کے اس واقعہ سے متعلق قرآن میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

''ایما ندارو! اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے پاس دوستی کا پیغام بھیجتے ہو اور تمہارے دین حق سے وہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ وہ لوگ رسول کو اور تم کو اس بات پر گھر سے نکالتے

۱- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۶ ۲- ۲۹۶/۲ زرقانی ابن ہشام، ج، ص ۲۹۵ ۳- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۷
۴- ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۶۵ ۵- زرقانی، ج ۲، ص ۲۹۶

ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہو۔ اور تم ہو کہ ان کے پاس چھپ چھپ کے دوستی کا پیام بھیجتے ہو۔ حالانکہ تم چھپے چوری یا اعلانیہ کچھ کرتے ہو میں اس سے خوب واقف ہوں۔ تم میں سے جو ایسا کرے گا وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔ اگر یہ لوگ تم پر قابو پا جائیں گے تو تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور ایذا کے لئے تمہاری طرف اپنے ہاتھ بھی بڑھائیں گے اور اپنی زبانیں بھی۔ اور چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ۔ قیامت کے دن نہ تمہارے رشتے ناتے کچھ کام آئیں گے نہ تمہاری اولاد، اس دن وہی فیصلہ کردے گا۔ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو خدا دیکھ رہا ہے۔ تمہارے واسطے تو ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا عمل اچھا نمونہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان بتوں سے جنہیں خدا کے سوا تم پوجتے ہو بیزار ہیں۔ ہم تمہارے دین کے منکر ہیں اور جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ ہمارے تمہارے درمیان کھلم کھلا عداوت قائم ہوگئی''۔[1]

یہ آیتیں صراحتاً اس شخص کے عمل کی تنقید کررہی ہیں اور اسے سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا کہہ رہی ہیں۔ اہل بدر کو پروانۂ مغفرت دینے والی حدیث یا حاطب کے فعل کی مختلف تاویلوں کی کوشش ان آیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔

جناب رسول خداؐ نے حاطب کو کوئی سزا نہیں دی غالباً یہ واقعہ بھی حضرتؐ کی درگزر اور بغیر کسی قتل وخوں ریزی کے غلبہ کی اسکیم کا ایک جز بنا کر آیت نے ان کے اس فعل پر سرزنش کی اس کو اس وقت کافی سمجھا گیا۔ اہل بیت کرام کے اسناد سے کسی ضعیف روایت سے بھی اہل بدر کے لئے اعملوا ماشئتم کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو میرے ذہن میں اس کی تاویل یہ ہے کہ حضرت نے یہ طنز وتعرض کے طور پر فرمایا تھا جسے لوگوں نے بشارت کے معنی دے دئے۔

مدینہ سے روانگی

رسول خداؐ ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مہاجرین و انصار کے علاوہ سلیم و مزینہ وغطفان نامی قبائل بھی ساتھ ہوگئے تھے۔ راستے میں اور لوگ بھی شریک ہوتے گئے سب لوگ مسلح تھے سب کو اپنی فتح پر پورا اعتماد تھا۔ رسول خداؐ کے ذہن میں بار بار جو خیال گردش کررہا تھا وہ یہ تھا کہ زمین پر خون کا کوئی قطرہ نہ گرنے پائے اور امن وسلامتی سے مسجد حرام میں داخل ہو جائیں۔ مکہ سے ۴ فرسخ کے فاصلے پر مر الظہران'' میں فوج پہونچ گئی۔ فوج کی تعداد اس

۱- سورہ ممتحنہ، آیہ ۳

وقت ۱۰ ہزار تھی۔ قریش کو فوج کی آمد کی ابھی خبر نہ تھی۔ ابھی وہ آپس میں یہ بحث کر رہے تھے کہ اگر محمدؐ نے مکہ پر حملہ کیا تو ان کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔

حضرت عباس کی رسول خداؐ سے ملاقات

عباس بن عبد المطلب رسول خداؐ کے چچا اپنے اہل وعیال کے ساتھ رسول خداؐ سے مقام جحفہ میں ملے جو مکہ سے چار فرسخ پر ہے۔ ڈاکٹر ہیکل کا خیال ہے کہ شاید بنی ہاشم کے کچھ لوگوں کو رسول خداؐ کی آمد کی اطلاع تھی یہ ان کو شبہ تھا کہ رسول خداؐ مکہ کو فتح کریں گے۔ یہ لوگ رسول خداؐ سے آ کر مل گئے تا کہ ان کو کسی پریشانی سے کوئی سابقہ نہ ہو۔

بعض سیرت نگار لکھتے ہیں کہ عباس رسول خداؐ کی فوج سے مقام رابغ میں ملے۔

بعض کا کہنا ہے کہ قبل اس کے کہ حضرت رسول خداؐ مکہ کا ارادہ کریں عباس مکہ سے مدینہ گئے اور مسلمان ہو گئے اور مسلمان فوج کے ساتھ مدینہ سے مکہ آئے لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ بنی عباس کے زمانے میں سیرت نگاری کا کام ہوا۔ ان کی خوشی حاصل کرنے کے لئے ان کے مورث اعلیٰ کی فضیلت میں یہ روایت گھڑی گئی۔ ہجرت کے قبل جب رسول خداؐ مکہ میں تھے تو عباس نے اسلام قبول نہیں کیا اس لئے کہ عباس کا پیشہ تجارت تھا اور وہ سود خور تھے۔ اسلام سود سے روکتا تھا اور تجارت کے بعض اقسام کا مخالف تھا۔ اگر عباس مسلمان ہو گئے ہوتے اور ہجرت کر کے مدینہ آ گئے ہوتے تو ابوسفیان تجدید عہد کے لئے مدینہ آئے تھے ان ہی سے ملتے اس لئے کہ مکہ میں ابوسفیان اور عباس کے تعلقات دوستانہ تھے صحیح یہی ہے کہ عباس ابھی تک مکہ میں تھے رسول خداؐ کی آمد کی اطلاع کسی ذریعہ سے ان کو تھی وہ حضرت سے ملے۔ (ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب رسول خداؐ کے چچیرے بھائی تھے) اور عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے ''شنتہ العقاب'' میں حضرت کے پاس آئے۔ حاضری کی اجازت چاہی۔ حضرتؐ نے ان دونوں سے ملنے سے انکار فرمایا۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ نے ان دونوں کی حضرت سے سفارش کی۔ حضرت نے فرمایا یہ میرے چچیرے اور پھوپھیرے بھائی ہیں۔ انہوں نے مجھے پریشان کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی تھی۔ ان لوگوں نے گریہ وزاری کی تو حضرتؐ نے انہیں آنے کی اجازت دی۔ یہ ملے اور مسلمان ہو گئے۔

ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں کہ عباس بن عبد المطلب نے جب اپنے بھتیجے کی فوج اور قوت کو دیکھا تو خوفزدہ ہو گئے اگر چہ وہ اسلام لا چکے تھے لیکن ان کا دل مکہ کے انجام سے گھبرا رہا تھا۔ رسول خداؐ کے

ساتھ فوج تھی وہ اتنی طاقتور تھی کہ بلاد عرب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ڈر رہے تھے کہ اگر یہ فوج مکہ پر حملہ کرے گی تو مکہ کا کیا حشر ہوگا۔

عباس نے اپنے دل کی بات رسول خداؐ سے بھی کہی اور یہ پوچھا کہ اگر قریش امان کے طالب ہوں گے تو آپ کا رویہ کیا ہوگا۔ جناب رسول خداؐ بغیر کسی خونریزی کے مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اور مکہ کے حرمت وتقدس کی حفاظت کرنا چاہتے تھے لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ اہل مکہ مسلمانوں کے مکہ میں داخلے کی مزاحمت نہ کریں اور ان پر حملہ نہ کریں۔ حضرت عباس نے غالباً جناب رسول خداؐ کا ارادہ پالیا کہ حضرتؐ مکہ پر حملہ نہیں کرنا چاہتے۔

عباس جناب رسول خداؐ کے سفید خچر پر سوار ہوکر ''اراک'' کی طرف آئے کہ شاید کوئی لکڑی جمع کرنے والا یا دودھ والا یا کوئی جانے والا مل جائے تو اس سے اہل مکہ کو یہ پیام بھجوادیں کہ مسلم فوج کا مقابلہ ممکن نہیں ہے قبل اس کے کہ رسول خداؐ مکہ میں داخل ہوں اہل مکہ کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ پہلے ہی حضرتؐ سے امان کے طالب ہوجائیں۔

قریش کے جاسوسوں کی فکرمندی

مسلمان جب ''مرالظہران'' تک پہونچ گئے تھے۔ قریش کو محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ سے اب وہ دوچار ہونے ہی والے ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر ابوسفیان بن حرب و بدیل ورقا اور حکیم بن خرام کو جو حضرت خدیجہ کے عزیز قریب تھے حالات کی اطلاع اور خطرے کے اندازے کے لئے بھیجا۔ عباس جناب رسول خداؐ کے خچر پر سوار جارہی رہے تھے کہ انہوں نے ابوسفیان بن حرب بدیل بن ورقا کو بات کرتے ہوئے سنا۔

ابوسفیان کہہ رہے تھے کہ آج کی طرح ''آگ اور ایسی فوج میں نے کبھی نہیں دیکھی''۔

بدیل نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبیلۂ خزاعہ جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ خزاعہ میں اتنا دم خم کہاں ہے کہ اس قدر آگ روشن کرسکے اور اتنی بڑی فوج لے آئے۔

ابوسفیان کو جاں بخشی کی فکر

عباس نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی ابوسفیان کو پکار کر کہا۔ یہ رسول خداؐ کی فوج ہے۔ صبح کو مکہ کا کیا

حشر ہوگا اگر فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے۔ ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ تم پر نثار۔ جاں بخشی کی کیا صورت ہے۔ اس لجاجت اور خوشامدانہ استدعا پر عباس نے ابوسفیان کو اپنے پیچھے خچر پر بٹھالیا۔ اور بدیل وحکیم کو مکہ واپس کردیا۔ اور مسلم فوج کی طرف بڑھے۔ عباس رسول خداؐ کے خچر پر سوار تھے یہ اس بات کی علامت تھی کہ جناب رسولؐ خدا کی طرف سے ان کو پناہ دے دی گئی ہے۔ ابوسفیان عباس کے پیچھے بیٹھے تھے دس ہزار فوج کے درمیان سے گزر رہے تھے جس نے آگ کے شعلوں سے فضا کو مہیب بنادیا تھا۔ جب خچر حضرت عمر کی طرف سے گزرا تو انہوں نے ابوسفیان کو پہچان لیا۔ اور سمجھ گئے کہ عباس ان کو جناب رسول خداؐ کے پاس پناہ دلوانے کے لئے جارہے ہیں۔ وہ رسول خداؐ کے پاس ان کے پہونچنے سے پہلے ہی جلدی سے پہونچ گئے اور حضرت سے اجازت چاہی کہ حکم ہو تو ابوسفیان آرہا ہے اس کی گردن اڑادوں عباس بھی پہونچ گئے۔ حضرت عمر ابوسفیان کی گردن زدنی کے لئے اصرار کررہے تھے اور عباس پناہ دلوانے کی سفارش کررہے تھے۔ دونوں میں سخت کلامی کی نوبت آگئی۔ رسول خداؐ نے عباس سے فرمایا کہ ابوسفیان کو اپنے پاس رکھئے۔ صبح لے کر آیئے۔[1]

مولانا شبلی اس مقام پر لکھتے ہیں: ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے۔ اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعوے دار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال، آنحضرتؐ کے خفیہ قتل کرانے کی سازش۔ ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہوسکتی تھی۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبوی) تھی۔ اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں۔

ابوسفیان کا سیاسی اسلام

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہوتے ہی ابوسفیان نے اسلام قبول کرلیا۔ لیکن طبری میں ہے۔ جناب رسول خداؐ نے جب ابوسفیان کو دیکھا تو پوچھا کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (ابوسفیان اس وقت شدید نفسیاتی کرب میں مبتلا تھے ان کے لجاجت آمیز کلمات سے ان کی پریشانی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ابوسفیان نے یوں کلام شروع کیا۔ میرے ماں باپ آپ پر نثار آپ بڑے صلۂ رحم کرنے والے بڑے حلیم وکریم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اور کوئی

۱۔ حیات محمد، محمد حسین ہیکل، ص ۴۰۴

خدا ہوتا تو آج میرے کچھ کام آتا۔

رسول خداؐ نے پوچھا کیا اب بھی تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ میں خدا کا رسول ہوں۔

ابوسفیان نے پھر رحم وکرم کی درخواست سے کلام شروع کیا۔ میرے ماں باپ آپ پر نثار آپ بڑے ہی صلہ رحم کرنے والے بڑے ہی حلیم اور بڑے ہی کریم ہیں۔ جب یہاں تک پہونچے تو یہ تو ہمت نہ ہوسکی کہ کہتے ہیں کہ نبوت کے بارے میں میرے پہلے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن بے ساختہ ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ اما هذه خفي النفسر منها شي"۔ اس میں تو ذرا شبہ ہے۔[۱]

مولانا شبلی نے لکھا ہے:

''بہر حال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے۔ چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی''۔ مولانا نے طبری کے بیان کا ایک حصہ چھوڑ دیا ہے۔ جس میں ہے کہ ابوسفیان کے یہ کہنے کے بعد کہ آپ کی نبوت کے بارے میں اب بھی ذرا سا شبہ ہے۔ اس وقت حضرت عباس نے کہا قبل اس کے کہ تمہاری گردن اڑادی جائے سچائی کی گواہی دے دو۔ اس پر ابوسفیان نے کہا میں گواہی دے رہا ہوں کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں۔[۲]

مولانا کی نظر سے طبری کا یہ بیان بھی رہ گیا جس میں مذکور ہے کہ تصدیق نبوت کے تھوڑی ہی دیر بعد جب مسلمان فوج حرکت میں آئی اور ابوسفیان نے رسول خدا کو مہاجرین وانصار کے ساتھ مکہ کی طرف عظمت و وقار کے ساتھ بڑھتے ہوئے دیکھا تو عباس سے کہا۔ لقد اصبح ملک ابن اخیک عظیما۔

''تمہارے بھتیجے کا ملک تو بہت بڑا ہوگیا۔ اس پر عباس نے ان کو ٹوکا اور کہا۔'' ویحیک انها النبوة" تم پر افسوس ہے کہ یہ کوئی شاہی نہیں ہے بلکہ یہ نبوت ہے۔ ابوسفیان نے کہا۔ ہاں ٹھیک ہے۔[۳] جنگ حنین میں جب مسلمانوں کے پاؤں ابوسفیان نے اکھڑتے ہوئے دیکھے تو کہنے لگے یہ سمندر تک بھاگتے ہی جائیں گے۔[۴] جنگ یرموک جس میں انہوں نے اپنی دوسری آنکھ نذر کی خود

۱- محمد عبدالوہاب نبوی، سیرۃ الرسول، ص ۱۵، ۱۲۰۶ھ ۱۹۵۶ء ۲- طبری، ج ۳، ص ۱۱۶ ۳- ایضاً، ص ۱۱۷

۴- ابوسفیان الفدا، ج ۲، ص ۶۳

شریک جنگ مسلمانوں کے بیان کے مطابق جب وہ رومی لشکر کو مسلمانوں پر غالب آتے دیکھتے تھے تو کہتے تھے (ایہ نبی الاصفر۔ شاباش روم کے بہادرو! اور جب مسلمانوں کو رومیوں پر غالب آتے دیکھتے تھے تو حسرت ویاس سے کہتے۔ ہائے افسوس رومی بادشاہوں کا نام مٹتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

موقع پرست انسان

حقیقت یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی ابوسفیان کی زندگی کے کسی دور میں بھی اسلام ان کا عقیدہ نہ بن سکا وہ ایک موقع پرست آدمی تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی ٹڈی دل فوج کی گرفت میں مکہ آچکا ہے۔ تو انہوں نے حضرت عباس کی سفارش سے اس اعلان کی اجازت حاصل کرلی کہ دوسری پناہ گاہوں میں ان کے گھر کو بھی شامل کرلیا جائے۔ اجازت ملتے ہی وہ دوڑتے ہوئے خانہ کعبہ میں پہونچے اور چیخ کر کہا۔ محمد اتنی بڑی فوج لے کر آئے ہیں کہ تم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ لوگوں نے پوچھا پھر کیا کریں۔ ابوسفیان نے کہا۔ جو میرے گھر میں پناہ لے گا اسے امان دی جائے گی۔ لوگوں نے کہا تمہارے گھر میں کتنے آدمی سماسکتے ہیں۔ اب انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جو خانۂ کعبہ میں پناہ لے گا اسے بھی امان ملے گی۔[1]

فوج الٰہی کو امن وسلامتی کی شدید تاکید

افواج الٰہی کی سطوت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ قبائل کا دریا جوش مارتا ہوا آگے بڑھا۔ غفار جہینہ۔ یم۔ سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ حضرت نے فوج کے سرداروں کو اہل مکہ کے ساتھ رحم وکرم اور نرمی کی انتہائی تاکید کردی۔ فرمایا: جب تک تم پر حملہ نہ ہو تم خود کسی پر حملہ نہ کرنا۔ جو ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کرنا۔ بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرنا۔ کسی اسیر کو قتل نہ کرنا۔ کسی زخمی کو قتل نہ کرنا۔ جو حرم میں پناہ لے اسے کوئی گزند نہ پہونچایا جائے۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اسے بھی پناہ دی جائے جو ابوسفیان اور اس کے گھر میں پناہ لے اسے بھی پناہ دی جائے۔

سعد بن عبادہ کے تیور

حضرت اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سر جھکائے ہوئے انتہائی فروتنی وخضوع وخشوع کے ساتھ حرم کعبہ کی

۱۔ طبری، ج ۳، ص ۱۱۷

طرف جارہے تھے اور سورۂ فتح کی تلاوت فرمارہے تھے۔ سعد بن عبادہ انصاری اپنے دستہ فوج کے ساتھ علم لیے ہوئے گزر رہے تھے کہ ان کی نظر ابوسفیان پر پڑی۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا:

''الیوم یوم الملحمة. الیوم تستحل الکعبة''۔ آج گھمسان کی لڑائی کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کردیا جائے گا۔

ارشاد شیخ مفید میں ہے۔ الیوم تسبی الحرمة۔(یا۔عورتیں قید کرلی جائیں گی۔)

بخاری مناقب شہر آشوب میں اتنا اور اضافہ ہے:

یا معشر الاوس والخزرج تارکم یوم الجبل [1]

حضرت عباس یا ابوسفیان نے رسول خداؐ کو سعد کے ارادہ کی اطلاع دی۔ حضرتؐ نے فرمایا ان باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوگی۔ اور حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ سعد سے علم لے لیں۔[2] سعد نے حضرت علی سے کہا کہ آپ کے سوا کوئی دوسرا مجھ سے علم نہیں لے سکتا تھا[3] غالباً علم نبوی نصب کرادیا گیا۔ بڑا حصہ فوج کا بلا مزاحمت مکہ میں داخل ہوگیا۔ فوج کا موخر حصہ جو سرخ پوش تھا آنحضرتؐ کے ساتھ داخل ہوا۔ اس وقت حضرت ناقہ قصوی پر سوار تھے گردو پیش ہجوم بہت تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ کوہ حجون تک پہونچے جہاں پہلے سے علم نبوی نصب تھا۔ وہاں حضرتؐ کے واسطے خیمہ نصب کیا گیا۔ حضرت ناقہ سے اترے۔

بیزاری اور تلافی

آپ کو معلوم ہوا کہ خالد بن ولید نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ خالد نومسلم تھے۔ بنی جذیمہ اور ان کے قبیلے سے عہد جاہلیت میں ان بن تھی حالانکہ یہ قبیلہ مسلمان ہوچکا تھا۔ مگر خالد جذبہ عصبیت سے مغلوب ہوگئے اور بنی جذیمہ کے خون سے اپنی تلوار رنگ لی۔ خالد کی اس حرکت پر آنحضرتؐ کو بہت رنج ہوا۔ آپ نے ان کے عمل سے اظہار بیزاری فرمایا۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا اور درگاہ الٰہی میں گزارش کی۔

اللھم انی ابرء الیک مما منع خالد بن ولید۔ ''پروردگار! میں خالد کے فعل سے برأت و بیزاری کا اظہار کرتا ہوں''۔

آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو بھیجا کہ مقتولوں کا خوں بہا ادا کردیں اور وارثوں کو تسلی دیں۔ حضرت

۱- بخاری، ج ۱، ص ۱۱۳ ۲- طبری، ج ۳، ص ۱۱۸ ۳- مناقب، ج ۱، ص ۱۱۳

علی علیہ السلام نے مقتولوں کا خوں بہا دینے کے ساتھ جانوروں کا بھی خوں بہا دیا۔ اور جو مال بچ رہا وہ بھی ان میں تقسیم کردیا۔ جب رسول خداؐ کو معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ نے مقتولوں کے وارثوں کی تسلی و دلدہی اور خدمت میں دلچسپی لی تو آپ بہت خوش ہوئے۔[۱] خالد کی حمایت میں جو قلم کام کررہے تھے انہوں نے آنحضرتؐ کی بیزاری کے دور رس اثرات کو محسوس کرتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ آنحضرتؐ نے خالد سے باز پرس کی لیکن جب معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو ارشاد فرمایا کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔[۲]

عدیم المثال معافی

آنحضرتؐ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے ظلم و جور کا ستایا ہوا غریب الوطن اپنی رسالت و نبوت کو رحم و کرم عفو و درگذر سیر چشمی و بلند نظری و فیاضی سے ثابت کرنے آیا تھا۔ وہ شہر جس نے اس پر اور اس کے عقیدت مندوں پر مصیبتوں اور زیادتیوں کے پہاڑ ڈھا کر اجنبی شہر میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ وہ شہر جو اس کی اور اس کے فدائیوں اور جاں نثاروں کی جان لینے کی قسم کھا چکا تھا اس کے باشندوں کی جانیں اب اس کے ہاتھ میں تھیں۔

بے رحم وظالم دشمن جو پرامن وحق جو مردوں اور عورتوں پر اپنے وحشت و بربریت کے ترکش کے کل تیر برسا چکے تھے اب ان کی عزت و آبرو جان و مال پر پوری طرح اس کا قبضہ تھا۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ فتح و عروج کی اس گھڑی میں تمام ہوشربا و زہرہ گداز تکلیفیں بھلادی گئیں۔ اور کسی کو نہ کوئی سزا دی گئی نہ قصاص لیا گیا نہ ان کے ظلم و زیادتی کا انہیں کوئی تاوان دینا پڑا۔

ایک روایت کی تنقید

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ آنحضرت سے دریافت کیا گیا کہ حضور کہاں قیام فرمائیں گے۔ کیا اپنے قدیم مکان میں۔ شریعت میں مسلمان کا فر کا وارث نہیں ہوسکتا۔ ابو طالب آنحضرتؐ کے عم نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے۔ اس لیے وہی وارث ہوئے یہ مکانات انہوں نے ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے۔ اس بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا۔

''عقیل نے گھر کہاں چھوڑا ہے کہ اس میں اتروں۔ اس لیے مقام حیف میں ٹھہروں گا''۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں قریش نے ہجرت سے پہلے آنحضرتؐ اور خاندان ہاشم کو مکہ سے نکال کر محصور کیا تھا''۔

۱۔ طبری، ج ۳، ص ۱۳۴ ۲۔ سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۴۷۲

میرا خیال ہے کہ دشمنان حضرت علیؑ نے حضرت ابو طالب رضوان اللہ علیہ کا کفر ثابت کرنے کے لئے یہ روایت گھڑی ہے۔ حضرت ابو طالب کا ایمان وعرفان شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ علاوہ اس کے اہل بیت کی فقہ میں کافر مومن کا وارث نہیں ہوسکتا مومن کافر کا وارث ہوگا۔

کعبہ میں داخلہ

شہر میں داخل ہوکر آنحضرتؐ پہلے کعبہ کی طرف چلے۔ کعبہ کے پاس پہونچ کر اس کا دروازہ پکڑ کر حضرتؐ نے فرمایا:

لااله الا الله انجز وعده و نصر عبده و اعز جنده و غلب الاحزاب وحده۔[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی۔ اپنی فوج کو غالب کیا۔ اور تمام پارٹیوں کو تنہا مغلوب کردیا۔

اب وارث خلیل بیت اللہ میں داخل ہوا۔ لااحب الافلین کا وہ نعرہ جس نے بتان آذری کو قدیم طاقوں سے اتار دیا تھا۔ اب ''جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ''۔ کی بجلی بن کر اصنام قریش پر گرا۔ انہیں الوہیت کے مقام سے اتار کر حقیر پتھر کا درجہ دے دیا۔

آپ کمان سے یا چھڑی کی نوک یا لکڑی سے ہر بت کو طاقوں سے نیچے گراتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے ہی کی چیز تھی۔

جتنی تصویریں خانۂ کعبہ میں تھیں سب مٹادی گئیں۔ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ ہبل کا بت بہت مشہور تھا۔ یہ بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا۔ یاقوت احمر کا تھا۔ اس کے سامنے سات تیر رہتے تھے جن پر ''لا،نعم'' لکھا ہوا تھا عرب جب کوئی کام کرتے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے ہاں یا نہیں جو نکلتا اس پر عمل کرتے۔[2] ابو سفیان نے جنگ احد میں اسی ہبل کی جے پکاری تھی۔ جو بت نیچے تھے ان کو خود آنحضرتؐ نے توڑ ڈالا۔ اور جو اونچے تھے ان کو توڑنے کے لیے حضرت علیؑ کو اپنے دوش مبارک پر چڑھایا حضرت علیؑ نے انہیں توڑ کر گرادیا۔

دوش رسولؐ کا سوار

علامہ سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ: احمد بن حنبل نے اپنے مسند میں لکھا ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے تھے میں اور رسول خدا دونوں کعبہ کے پاس آئے۔ رسول خداؐ نے فرمایا بیٹھو۔ میں بیٹھ گیا حضرتؐ میرے

۱- مناقب ابن شہر آشوب، ج۱، ص ۱۱۴ ۲- معجم البلدان ذکر ہبل

شانے پر سوار ہوگئے۔ میں نے اٹھنا چاہا نہ اٹھ سکا۔ حضرتؐ میرے شانے سے اتر آئے اور خود بیٹھ گئے اور مجھے حکم دیا کہ میں آپ کے شانے پر بیٹھ جاؤں۔ امتثال امر کے لئے میں دوش مبارک پر سوار ہوگیا۔ حضرت مجھے لیے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو آسمان کو چھولوں۔ اوپر پیتل کا بنا ہوا ایک مجسمہ تھا۔ میں نے اسے ہلایا اور زمین پر پھینک دیا وہ شیشہ کی طرح چور چور ہوگیا۔[1]

صاحب حبیب السیر ومدارج النبوۃ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضرت نے دوش رسول خداؐ پر سوار ہو کر بتوں کو نیچے پھینکا تو جناب رسول خداؐ نے ان سے پوچھا کہ اے علیؑ تم اس وقت اپنے کو کیسا پا رہے ہو۔ فرمایا ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ تمام پردے سامنے سے ہٹ گئے ہیں اور میرا سر ساق عرش تک پہونچ گیا ہے۔ اور جس چیز کو چاہوں چھوسکتا ہوں۔ رسول خداؐ نے فرمایا کہ تمہیں مژدہ کہ تم خدا کا کام کر رہے ہو۔ اور مجھے مژدہ کہ بارحق اٹھائے ہوئے ہوں۔

صاحب حبیب السیر ومدارج النبوۃ وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؑ بت شکنی کے بعد دوش رسولؐ سے زمین پر کودے اور ہنسنے لگے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا ہنسے کیوں۔ میں نے کہا اس لیے ہنسا کہ اتنی بلندی سے کودا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ حضرتؐ نے فرمایا تمہیں تکلیف کیسے پہونچتی محمدؐ نے تم کو اٹھایا تھا اور جبریل نے اتارا ہے۔ دوسرے لوگ گرد ونواح کے بت مسمار کرنے پر مامور ہوئے۔ ظہر کا وقت آیا۔ آنحضرتؐ نے بلال کو مامور فرمایا کہ کعبہ کی چھت پر جاکر اذان دیں۔ یہ منظر مشرکین مکہ کے لئے بے حد ناگوار تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے کہا اچھا ہوا کہ میرا باپ آج اس آواز کو سننے کے لیے زندہ نہیں ہے۔ حارث بن ہشام نے کہا۔

''محمدؐ کو اس سیاہ کوے کے سوا کوئی دوسرا موذن میسر نہیں آیا۔ ابوسفیان نے کہا میں کچھ کہوں گا۔ دیوار ہم گوش دارد۔[2] ایک سردار نے کہا۔ اب جینا بیکار ہے''۔

خطبہ فتح

حکومت الٰہیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے حضرتؐ نے اس موقع پر ایک نہایت اہم تقریر فرمائی اس وقت جسے صرف حاضرین نے سنا مگر اس کی عمومیت میں دنیا کا ہر انسان شامل ہے۔ فرمایا:

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اس نے اپنے

۱۔ تذکرہ خواص الامہ، مطبوعہ ص ۱۵، ۱۲۸۵ء ۲۔ مناقب شہر ابن آشوب، ج ۱، ص ۱۱۴

بندوں کی مدد کی اور تمام پارٹیوں کو تنہا شکست دی۔ سنو! تمام مفاخر و انتقام خونہائے گزشتہ میرے پیروں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہے۔ قریش سنو! جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر خدا نے مٹادیا۔ تم سب آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پھر قرآن کی آیت پڑھی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے: لوگو! میں نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ خدا کے نزدیک زیادہ شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ خدا مطلع و واقف کار ہے''۔

پھر فرمایا'' خدا اور اس کے رسولؐ نے شراب کی خرید وفروخت حرام کردی''۔

اس خطبہ میں پیغام توحید کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ عرب کا رواج تھا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کردیتا تو اس کے خون کا بدلہ لینا خاندانی فرض ہوجاتا۔ اگر قاتل خود ہاتھ آجاتا تو قتل کیا جاتا۔ اور اگر طبعی موت مرگیا تو اس کے عوض میں اس کے خاندان یا قبیلے کا کوئی آدمی قتل کیا جاتا۔ انتقام کا حق وراثت میں ملتا سیکڑوں برس کے بعد بھی انتقام کا ولولہ دلوں میں جاگتا رہتا۔ خون کا انتقام عربی فضائل میں شامل تھا۔ آپ نے ظالمانہ انتقام اور تمام فرسودہ مفاخر کے طریقوں کو اپنے پیروں سے کچل دیا''۔

عرب اور تمام دنیا میں نسلی امتیاز کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس سے سماج کو شدید نقصان پہونچ رہا تھا۔ اسلام نے مساوات کی دولت تقسیم کرکے شاہ وگدا، امیر وغریب اور عرب وعجم سب کو برابر کا درجہ دیا۔

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ قریش کے متمرد وسرکش بے رحم و بے ادب وگستاخ سامنے موجود تھے۔ وہ بھی تھے جو ظلم وجور کی قیادت کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کا شعروادب رسول کی ہجوگوئی کے لئے وقف تھا۔ وہ بھی تھے جن کی آرزو تھی کہ وہ اپنی تشنگی رسولؐ کے خون ناحق سے بجھائیں۔ ان میں آدم خور بھی تھے۔ وہ بھی تھے جن کا جنون جنگ و جدال انہیں تیغ بکف مدینہ تک کھینچ لاتا تھا۔ وہ بھی جو مکہ کی جلتی ہوئی ریت پر بے سہارا مسلمانوں کو لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہر لگایا کرتے تھے۔

آپ نے رحم وکرم کے لہجہ میں ان سے پوچھا''تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کیا برتاؤ کرنے والا ہوں''۔

ان کے پاس رسول خداؐ کے رحم وکرم کے سوا اپنی شفاعت کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ رسول خداؐ نے جو سوال کیا تھا کہ اس کے جواب کے لئے ان کے دماغ مفلوج اور زبانیں گنگ تھیں۔ مگر آنحضرتؐ

کے فتح مکہ میں مسلسل وواضح کردار نے ان کو جواب مہیا کردیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اب تک حضرت نے ایک ایک قدم کس امن وسلامتی سے اٹھایا ہے۔ اب تک کا طرز عمل بتا رہا تھا کہ رحم وکرم کا بادل برسے گا۔ اور عفو ودرگزر کی نسیم ان کے مایوس دلوں اور پژمردہ چہروں کو شاداب کردے گی۔ سب پکار اٹھے۔

''اخ کریم وابن اخ کریم۔ آپ شریف بھائی اور شریف بھتیجے ہیں''۔

اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"لاتثریب علیکم الیوم. اذھبوا فانتم الطلقا.

تم سے کچھ مواخذہ نہیں ہے۔ جاؤ تم سب آزاد ہو''۔

بیعت

کوہ صفا یا مسجد جامع میں آپ جلوہ افروز ہوئے۔ لوگ جوق درجوق آنے لگے اور حضرت کے دست مبارک پر بیعت کرنے لگے۔ آپ ان سے عہد لیتے کہ کسی کو خدا کی ذات وصفات عبادت واعانت میں شریک نہ کریں گے۔ چوری، زنا، خون ناحق اور لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے اور عورتوں پر بہتان تراشی سے پرہیز کریں گے۔

عورتوں سے بھی ارکان اسلام ومحاسن اخلاق کا اقرار لیتے اور اس کو کافی سمجھتے یا پانی کے حوض کے برتن میں اپنا ہاتھ ڈال دیتے۔ پھر بیعت کرنے والی عورتیں اسی برتن میں اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھیں۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں: ان مستورات میں ہندہ بھی آئی یہ وہی ہندہ ہے جو رئیس عرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ کی ماں تھی۔ حضرت حمزہ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کرکے کلیجہ چبا گئی تھی۔ وہ نقاب پہن کر آئی۔ شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں۔ لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے۔ بیعت کے وقت اس نے نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے باتیں کیں جو حسب ذیل ہیں:

ہندہ: یارسول اللہ آپ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں۔

رسول اللہ: خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔

ہندہ: یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا۔ لیکن بہرحال ہم کو منظور ہے۔

رسول اللہ: چوری نہ کرنا۔

ہندہ: میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں۔ معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔

رسول اللہ: اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہندہ: ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا بڑے ہوئے تو جنگ بدر میں آپ نے ان کو مار ڈالا۔ اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں''۔[۱]

پندرہ روز مکہ میں قیام کے بعد حضرت مدینہ منورہ واپس آ گئے اور معاذ بن جبل کو نومسلموں کی تعلیم کے لئے مکہ میں چھوڑ دیا۔

فتح مکہ کا اثر

جب مکہ پر مسلمانوں کو یہ عظیم فتح حاصل ہوگئی تو جو اسلام سے متاثر ہوتے بے روک ٹوک آزادی سے اسلام لاتے۔ قریش کی مزاحمت کا خاتمہ ہوگیا۔ بہت سے قبیلے اسلام کے قبول کرنے میں فتح مکہ کے منتظر تھے۔ وہ کہتے تھے۔

''اترکوه و قومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبی صادق۔
محمدؐ کو اپنی قوم سے نپٹنے دو اگر وہ قوم پر غالب آ گئے تو سچے نبی ہیں''۔

مکہ کے باشندے عقیدہ رکھتے تھے کہ خانۂ کعبہ پر انسانی قوت غالب نہیں آ سکتی۔ ان میں ایسے لوگ ابھی زندہ تھے جنھوں نے ساٹھ ستر برس پہلے دیکھا تھا کہ فاتح یمن ابرہہ حبش چالیس ہزار جرار فوج کے ساتھ مکہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ساری فوج برباد ہوئی۔ چالیس ہزار میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ بچا۔ ہاتھی اور ابرہہ کے ساتھ سب مکہ سے چار کوس دور مردہ پڑے رہے۔ ان کی لاشیں سڑ اکیں اس لئے وہ منتظر تھے کہ اب محمدؐ نے حملہ کیا ہے یا تو (معاذ اللہ) ابرہہ کی طرح ان کا اور ان کے ساتھیوں کا بھی یہی حشر ہوگا یا فتح یاب ہوں گے۔ جب مسلمانوں کو فتح ہوئی تو ان کی سمجھ میں آیا کہ تائید ربانی حضرت کے ساتھ ہے۔ وہ اسلام کی صداقت اور پیغمبرؐ اسلام کے بے مثال کردار سے متاثر ہوئے اور اسلام کو ذوق وشوق کے ساتھ قبول کرنے لگے۔

۱- سیرۃ النبی، ج ۱ ص ۵۵۴

رحمۃ اللعالمین

حضرت رسول پاکؐ کی انسانیت نوازی

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ کے اخلاق طیبہ، نبوت کی اعلیٰ خوبیوں کے ساتھ، اتنی محبت، رحم دلی اور انسانی ہمدردی کے حامل تھے کہ اس سے زیادہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا "و إنک لعلی خلق عظیم"[1] کہ آپؐ عظیم اخلاق کے حامل ہیں اور فرمایا گیا: "و ما أرسلناک إلا رحمة للعلمین"[2] کہ ہم نے آپؐ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، آپ ایک طرف اپنے پروردگار کو راضی رکھنے کے لئے ہر طرح کی مشقت اور تکلیف اٹھاتے، اور اس کی مرضیات پر عمل کرتے، دوسری طرف سارے انسانوں کے ساتھ ہمدردی و محبت کا ایسا عمل کرتے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔

آپؐ عبادت گذار اور ایسے شب زندہ دار تھے کہ رات کی نماز یعنی تہجد میں اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ پیروں میں ورم آجاتا، روزے اتنے رکھتے کہ رمضان سے قبل شعبان کا مہینہ بھی اکثر و بیشتر روزوں میں گذر جاتا، مال کو اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرتے کہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے کھانے کے لئے کئی کئی مہینوں تک کوئی ایسی چیز باقی نہ ہوتی جس کے لئے گھر والوں کو آگ جلانا پڑے کبھی کھجور کے کچھ دانے حاصل ہوگئے انہی سے کام چلالیا اور کبھی بکری کا دودھ ہوا، اسی کو پی کر مطمئن ہوگئے، کبھی کچھ بھی نہ ملا تو یوں بے کھائے پیے ہی رہ گئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپؐ مال و متاع سے بالکل محروم تھے، ایسا نہیں تھا، بلکہ عموماً آپؐ کی ضرورت کے مطابق مال حاصل ہوجاتا تھا، اور بعد میں مدینہ منورہ سے باہر فدک وغیرہ میں آپ کی ملکیت میں کچھ باغ آگئے تھے جن کی پیداوار سے کچھ آمدنی آپ کو حاصل ہونے لگی تھی، لیکن آپ

۱۔ سورۃ القلم، آیہ ۴ ۲۔ سورۃ الانبیاء، آیہ ۱۰۷

کی طرف سے دوسروں کی مدد، داد و دہش اور مہمانوں کی مہمان داری اور اصحاب صفہ (جو دین سیکھنے کے لئے آپ کے مکان کے سامنے مسجد کے ایک سرے پر مقیم رہتے تھے) ان کے کھانے کی ذمہ داری بھی آپ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔

یہ اصحاب صفہ بعض مرتبہ ۷۰ کی تعداد تک پہنچ گئے تھے، ان میں ایک صحابی حضرت ابوہریرہ تھے جنہوں نے وہاں رہ کر خوب حدیثیں سنیں، اور علم دین سیکھا، چنانچہ آج حدیث شریف کا خاصہ حصہ ان ہی سے مروی ہے، ان ہی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، اصحاب صفہ بھی بھوکے تھے کہ آپ کے پاس کہیں سے دودھ کا ایک پیالہ ہدیہ میں آیا، آپؐ نے حضرت ابوہریرہ کو بلایا اور فرمایا کہ یہ دودھ آیا ہے سب اصحاب صفہ کو بلا لاؤ۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوا کہ اتنے سے دودھ میں کتنے آدمی کام چلاسکیں گے، یہ تو خود آپؐ پی لیتے اور کچھ بچتا تو مجھ کو دے دیتے، بجائے اس کے متعدد آدمیوں کو بلا کر پلایا جائے تو کسی کا بھلا نہ ہوگا۔ لیکن کرتا کیا! حکم تھا، میں نے بلایا۔ آپؐ نے وہ پیالہ ایک کو دیا کہ پیو! پھر دوسرے کو دیا، پھر تیسرے کو دیا اور وہ سب پیتے رہے، اور حیرت کی بات یہ کہ وہ چلتا رہا، حتی کہ بلائے ہوئے سب آدمی پورے ہوگئے۔ پھر آپؐ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں لیا، حضرت ابوہریرہ کو دیکھا اور فرمایا: ابوہریرہ! ہم رہ گئے ہیں اور تم۔ حضرت ابوہریرہ کا یوں بھی امتحان ہورہا تھا کہ ہر پینے والے پر یہ سوچتے ہوں گے کہ دودھ اب ختم ہوا، تب ختم ہوا۔ میری باری دیکھو آتی بھی ہے یا نہیں آتی۔ حضورؐ کے یہ کہنے پر کہ اب ہم رہ گئے ہیں اور تم، اور پیالہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور دودھ تھوڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب آپ ہی مستحق ہیں کہ اس کو پورا کردیں، اور ابوہریرہ رہ جائیں، حضرت ابوہریرہ نے آپ کے اس جملہ پر کہ اب ہم رہ گئے ہیں اور تم، کہا جی ہاں، آپ نے فرمایا: لو اب تم پیو، وہ کہتے ہیں کہ میں نے پیا اور دودھ پھر بھی بچ گیا، میری طبیعت سیر ہوگئی، آپ نے فرمایا اور پیو، میں نے اور پیا، آپ نے فرمایا اور پیو، میں نے کہا یا رسول اللہؐ اب طبیعت سیر ہوگئی ہے۔ پھر آپ نے پیالہ واپس لیا اور اس کو پورا کردیا۔

اس واقعہ کے اندر کئی باتیں آگئی ہیں ایک تو کھانے پینے کی چیزوں کی کمی، اور جب کوئی چیز آجاتی تو آپ سب کو دے کر کھاتے پیتے۔ دوسرے یہ اخلاق کہ چیز کے کم ہونے کے باوجود سب کا خیال رکھنا اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا۔ تیسری اس بات کی تربیت دینا کہ دوسرے کی ضرورت

کو اپنی ضرورت پر ترجیح کا مجاہدہ ہو، اور اپنے محروم رہ جانے کا خطرہ برداشت کیا جائے۔ چوتھے یہ کہ اگر اخلاص اور بے نفسی دوسروں کی ہمدردی کے جذبہ سے کی جائے تو برکت ہوتی ہے اور کم چیز زیادہ آدمی کے کام آجاتی ہے۔ یہ برکت ہر وقت نہیں ہوتی، یہ اس وقت ہوتی ہے جب جذبہ بھی اعلیٰ ہو اور مسئلہ کا حل کوئی دوسرا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور وہ تھوڑی چیز کو زیادہ کا قائم مقام بنادیتا ہے۔

ایسی برکت حضورؐ کے معاملے میں کئی مرتبہ ہوئی، لیکن ایسے موقعے بہت خاص خاص ہوتے تھے، عام طور پر عام حالات ہی پیش آتے تھے، ورنہ ہر مرتبہ اگر ایسی برکت ہوتی رہتی تو آپؐ کو کبھی فاقہ نہ کرنا پڑتا اور نہ کبھی کوئی حاجت پوری ہونے میں دشواری ہوتی۔ لیکن آپؐ کو بارہا مال کی تنگی ہوتی تھی اور آپ اس کو خوشی خوشی برداشت کرتے تھے، حتیٰ کہ بعض بعض مرتبہ بھوک کی شدت کو دبانے کے لئے آپ کو پیٹ پر دو دو پتھر باندھنے پڑے جیسا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر ہوا۔ پھر اسی غزوۂ خندق کے موقع پر ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس میں برکت کا ظہور ہوا۔ بہرحال اخلاص و نیک نیتی اور ایثار کے جذبے کے پوری طرح پائے جانے کے ساتھ ایسی حالت پیش آگئی ہو جس میں زندگی کے قائم رہنے کو خطرہ پیش آسکتا تھا، کوئی دوسرا ظاہری حل نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے تھوڑی چیز کو زیادہ چیز کا قائم مقام بنادیا۔ تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں۔

بہرحال یہ بات قابل توجہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے سامنے جب کوئی ایسا موقع آتا کہ دوسرا بھی ضرورت مند ہو تو نہ صرف اس کو شریک کرلیتے، بلکہ اس کو ترجیح دیتے۔ اس ایثار اور سب کی فکر کے نتیجے میں آپ کے پاس ضرورت کی چیز کا کم ہوجانا قدرتی بات تھی چنانچہ کئی کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تھی، حالانکہ آپ کو اتنا مال ذاتی طور پر حاصل ہوتا تھا کہ روک روک کر خرچ کرتے تو آپؐ اپنا کام اس کے ذریعہ بخوبی چلاسکتے تھے، لیکن آپؐ ان کی فکر، اپنی فکر کی طرح رکھتے تھے، چنانچہ آپؐ نے ایک بار اعلان فرمایا کہ کوئی مسلمان انتقال کرجائے تو اس کا چھوڑا ہوا مال اس کے وارثوں کا ہے، اور جو وہ قرض چھوڑ گیا ہو تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ بھلا یہ کون کرسکتا ہے؟ پھر ایک دو کے لئے نہیں بلکہ اپنے تمام ساتھیوں اور ماننے والوں کے لئے آپ کا یہ سلوک عام تھا کہ فائدہ ہو تو تم لو، اور نقصان ہو تو اس کی تلافی میرے ذمہ ہے۔

آپؐ نے اخلاق و محبت کی اپنی ان خصلتوں سے لوگوں کے دل جیت لئے تھے، جو بھی آپؐ سے ایک مرتبہ مل لیتا تو آپ کا گرویدہ و فریفتہ ہوجاتا، وہ دیکھتا کہ آپؐ کو دنیاوی فائدے کی کوئی فکر نہیں،

آپ کو اپنی ذات کے لئے فائدہ اٹھانے سے کوئی دلچسپی نہیں، دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کی فکر صرف دنیاوی فائدے ہی کے لئے نہ تھی بلکہ زیادہ فکر آخرت کے فائدہ کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے آگ جل رہی ہو اور اس میں لوگ گر رہے ہوں، میں کمر پکڑ پکڑ کر لوگوں کو اس سے بچا رہا ہوں، آپؐ کی یہ فکر اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا: "لعلک باخع نفسک ألایکونوا مؤمنین"[1] کہ آپ شاید اپنے آپ کو ہلاک کرڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان والے کیوں نہیں بن جاتے، اور واقعی آپ کڑھتے رہتے تھے کہ لوگ گمراہ ہیں ان کا آخرت میں کیا ہوگا، ان کو گمراہی سے کیسے نکالا جائے، اس کے لئے آپ نہ زور زبردستی کرتے تھے، نہ ڈانٹتے، نہ سختی کرتے، بلکہ محبت سے، اخلاق کے ساتھ ان سے مخاطب ہوتے اور نرمی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔

ایک طرف آپؐ کی انسانیت نوازیاں و ہمدردیاں اور دوسری طرف آپ کی طرف سے اپنی اور دوسروں کی عافیت کی فکر میں ان کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ جو بھی اس وقت قریب سے دیکھ لیتا، بالکل بدل جاتا، اور آپ کا ہوجاتا۔ بعض وقت کوئی شخص کفار قریش کے بہکانے پر آپ کو قتل کرنے کے لئے آتا اور آپ کا سامنا ہوتے ہی، آپؐ کے میٹھے بول سنتے ہی ڈھیلا پڑجاتا تھا، ارادہ ختم ہوجاتا اور بات چیت ہوتی، گرویدہ ہوجاتا، اور آپ پر فدا ہوکر لوٹتا۔

آخرت میں لوگوں کی نجات کے لئے آپ غیر معمولی طور پر فکرمند رہا کرتے تھے اور ہر ممکن امداد کے لئے آمادہ رہا کرتے تھے

جس کی طرف خداوند عالم نے قرآن مجید میں اس طرح اشارہ کیا ہے: "لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم"[2] کہ تمہارے پاس تم میں کا ہی رسول آیا، اس کو تمہاری تکلیف بہت شاق ہوتی ہے، وہ تمہاری بے حد فکر کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے تو بہت ہی ہمدردی اور رحم کا جذبہ رکھنے والا ہے۔ اور فرمایا: "لعلک باخع نفسک ألایکونوا مؤمنین"[3] کہ شاید آپ اپنے آپ کو بہت تکلیف میں ڈال دیں گے کہ یہ لوگ کیوں ایمان والے نہیں بنتے۔

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انسانیت نوازی، اخلاق ومحبت کی خصوصیات، اس

۱- سورہ الشعراء، آیہ ۳ ۲- سورہ التوبہ، آیہ ۱۲۸ ۳- سورہ الشعراء، آیہ ۳

قدر بھری ہوئی اور غیر معمولی تھیں کہ جس کو واسطہ پڑتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ آخرت میں سرخرو ہونے کے لئے آپ کی جو توجہ دہانی اور نصیحت و دعوت تھی کہ آپ کڑھتے رہتے تھے کہ کس طرح لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی آخرت کو ٹھیک کرنے، اور آخرت میں راحت کی زندگی پانے کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں۔ ایک طرف آپ مجسم ہمدردی اور محبت تھے، دوسری طرف انسانی قدروں کے اعلیٰ درجہ کے محافظ اور داعی تھے۔ تیسری طرف آپ اپنی زندگی کو، اپنے مال و متاع کو رضائے الٰہی کے حصول اور دنیا و آخرت کی فلاح کا طریقہ بتانے اور خود اس پر عمل کرنے پر لگائے ہوئے تھے۔

آپؐ کی طرف سے نہایت ہمدردی کی مثال یہ ہے کہ جب شب معراج میں نماز فرض کی گئی اور اس کے اوقات پچاس رکھے گئے تو آپ نے بار بار رب العالمین سے التجا کی کہ اوقات کی تعداد میں کمی فرمادی جائے، بالآخر وہ پچاس کے بجائے پانچ وقت کردی گئی، یہ بھی آپ کی بے حد ہمدردی کی بات ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ "الدین یسر" مذہب پر عمل کرنا آسان رکھا گیا ہے، اور حکم دیا گیا کہ اعتدال سے کام لو۔ اپنے دنیوی لازمی تقاضہ کو پورا کرو، مذہبی اعمال اور دنیوی زندگی ایک دوسرے سے ٹکراتی نہیں، دنیا کی لازمی ضرورت کو بھی پورا کرو اور دین کے احکام پر بھی پورا عمل کرو۔

اسلام کی یہی وہ جامعیت ہے جس میں وہ تمام مذاہب کے درمیان منفرد ہے بلکہ اس میں اپنی واقعی دنیاوی ضرورت کو اللہ کے حکم کے مطابق اور رضائے الٰہی کی نیت سے پورا کیا جائے تو اس طرح ثواب ملتا ہے کہ جیسا کسی مذہبی عمل پر یا عبادت پر ملتا ہے۔ یہ وہ جامعیت ہے کہ جس کو ہمارے پیغمبرؐ لے کر آئے تھے، اور ساری انسانیت کو اس کا پیغام دیا۔ اپنی دنیاوی ضرورتوں کو جائز طریقے سے پورا کرنا، دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی اور ہمدردی کا برتاؤ کرنا ان کی زندگی اور سیرت کا اٹوٹ حصہ رہا ہے جس پر وہ خود بھی عمل پیرا تھے اور جس کا پیغام انہوں نے پوری انسانی برادری کے نام بھی جاری کیا کہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی، خوش اخلاقی اور محبت کے ساتھ پیش آنا اور اپنے سارے اعمال کو خواہ وہ دنیوی ہی کیوں نہ ہوں اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق ہی انجام دینا یہ آپ کی سیرت و اخلاق اور حیات طیبہ کی وہ میراث ہے جو آپ نے اپنے تمام امتیوں کے لئے چھوڑی ہے جس کو اپنانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اور آپ نے اخلاق و محبت اور انسانیت نوازی کا اسوہ اور نمونہ اپنی

امت کے لئے چھوڑا، اس پر آپ کے امتیوں میں سے ایک خاصی تعداد نے عمل بھی کیا، اور یہ سلسلہ برابر قائم ہے۔ اللہ تعالی کی طرف سے آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کا وعدہ ہے، اس کی بناپر اسوۂ نبوی کی پیروی کے واقعات بھی برابر پیش آتے رہیں گے۔یہی شریعت محمدی کی شان ہے جس کی وجہ سے دوسروں کے مقابلے میں وہ ممتاز ہے۔

مبلغ اعظمؐ کی روش تبلیغ

مہدی باقر

منجی قافلۂ بشریت و کاروان انسانیت، سرکار ختمی مرتبت، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت و رسالت عالم انسانیت پر کیے گے الٰہی احسان کی ایک عظیم ترین مثال ہے، جس کے فیوض و برکات کے طفیل انسانی تاریخ نے پہلی بار متمدن سماج کا تجربہ کیا۔ آدمی نے انسان ہونا سیکھا، چھوٹوں کو ان کے حقوق ملے، بڑوں کو بقید اہلیت ان کی منزلت ملی، عورتوں کو ان کا مقام ملا، دل کے بت کدے شمع توحید سے روشن ہوگئے، زبانوں پر بیہودہ اور گمراہ کن اشعار کے بجائے آیات قرآنی اور احادیث پیغمبر آگئیں، خداساز وصنم تراش ہاتھ بت شکن کی حمایت میں شمشیر بکف ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا سب کچھ اس مختصر سے عرصہ میں کیسے ممکن ہوا؟

پیغمبرؐ نے اسلام قبول کرنے والوں کے لئے کسی قسم کی خصوصی مراعات کا اعلان بھی نہیں کیا کسی سے حکومت و اقتدار کا وعدہ بھی نہیں کیا..... پھر وہ کیا تھا جس کی بنیاد پر اس وقت اس بدترین معاشرے نے پیغمبرؐ کی بات کا اثر قبول کیا۔

اگر ہم رسول کی کامیاب دینی تبلیغ پر غور کریں تو ہم پر اس کی بنیادی علتوں کا انکشاف ہوگا جن میں سے سب سے پہلی اور بنیادی علت یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے ۲۵ سالہ تبلیغی کاروائیوں کے لئے ۴۰ برس زمین ہموار کی اور عربوں سے اللہ کی وحدانیت کا کلمہ پڑھوانے سے پہلے اپنی صداقت کا کلمہ پڑھوایا۔

واضح رہے کہ تمام انبیاء اپنے اپنے عہد نبوت میں ایک ہی مقصد کی طرف گامزن تھے، ان کا ہدف خدا پر ایمان اور قیامت پر ایمان کے ذریعے لوگوں کو دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہمکنار کرنا اور انسانی و اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر مرتب تعلیمی و تربیتی نصاب کے ذریعے معاشرہ کو مہذب اور اسلامی بنانا تھا، مگر دیگر انبیاء کی نبوت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کے لئے پیش خیمہ اور زمین سازی کی ہی حیثیت رکھتی ہے، علاوہ ازیں سارے انبیاء کی دعوت وتبلیغ کے بنیادی اصول

بھی مشترک ہیں، البتہ مرسل اعظم کے ذریعہ لایا گیا دین اور آپ کا طرز تبلیغ بہرحال سب سے ممتاز و منفرد تھا، یعنی دین اسلام ہی صرف وہ دین ہے جو نہ صرف انفرادی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے بلکہ اخلاقی، روحانی اور اجتماعی مسائل کو بھی سنوارنا چاہتا ہے ایسے مکمل، جامع اور آفاقی دین کو پیغمبر اکرم جیسا نبی میسر آجانے سے اس کی ترویج وتبلیغ مزید موثر و دلپذیر ہوگئی، چونکہ آپ نے انتہائی شفقت آمیز اور دلپذیر انداز میں تبلیغ دین کی، قوم کے درمیان ہمیشہ ابر رحمت اور عذاب الٰہی سے تحفظ کی ضمانت بن کر رہے، کبھی کسی کو خالی ہاتھ واپس نہ جانے دیا، کسی کا علمی سوال ہو یا مالی ضرورت، دل آزاری کو کبھی روا نہیں رکھا، راستے میں کانٹے بچھانے والوں کے لئے سراپا گلستان بنے رہے، روز کوڑا پھینکنے پر نہیں ٹوکا ایک دن کوڑا نہ پھینکنے پر پوچھ بیٹھے، صاحب زبان خوش لحن عربوں کے بیچ بلال کو گلدستۂ اذان پر بھیج کر مساوات کا وہ تصور پیش کیا جو آج بھی صرف اسلام ہی کا حصہ ہے، الغرض کوہ فاران سے بلند ہونے والے نعرۂ قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا سے لے کر واقعہ قرطاس تک پیغمبر اسلام نے تبلیغ دین کے تئیں جو حکمت عملی اپنائی وہ رہتی دنیا کے لئے ایک مثال ہے چنانچہ اگر ہم رسول کی تبلیغی کارروائیوں میں تصور وحدانیت کے افہام و ابلاغ کے باب کو دیکھیں تو اس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، مثلاً پیغمبر نے بت پرستوں اور مشرکوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جو ہندستان کے سماجی تناظر کے اعتبار سے مسلمانوں کے لئے لائق عبرت ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش ہے جس سے توحید و اسلام کے افہام و ابلاغ کے آداب سیکھے جاسکتے ہیں اور اپنے اندر کے دبے کچلے تبلیغی شعور کو ٹٹولا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے پاس بت پرستوں کا ایک وفد آیا، گفتگو شروع ہوئی پیغمبر نے کہا:

''تم لوگ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت سے کیوں منہ موڑے ہوئے ہو اور ان بتوں کی پرستش کرتے ہو؟

بت پرست: ہم انہیں بتوں کے وسیلے سے خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ: کیا یہ بت الٰہی فرامین کی اطاعت کرتے ہیں، عبادات کے ذریعہ خود بھی بارگاہ خداوندی سے قریب ہیں جو تمہیں خدا کا قرب دلائیں گے؟

بت پرست: نہیں نہ یہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور نہ ان کی پرستش کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ: کیا تم نے ان بتوں کو خود نہیں تراشا اور بنایا ہے؟

بت پرست: بے شک ہم نے انہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ: جب تم ان کے تراشنے اور بنانے والے ہو تو ان بتوں کو چاہئے کہ یہ تمہاری عبادت کریں نہ کہ تم ان کی اور جب ایک خدا تمہارے امور و وظائف کے مصالح اور مفاسد سے واقف ہے تو اسے چاہئے کہ تمہیں بت پرستی کا حکم دے حالانکہ خدا کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہیں آیا۔

جب رسولؐ کی گفتگو یہاں تک پہونچ گئی تو بت پرستوں میں اختلاف ہوگیا چنانچہ بعض نے کہا کہ خدا ان میں حلول کرگیا ہے لہذا ان کا احترام کیا جاتا ہے۔

بعض دوسرے بت پرستوں نے کہا کہ ہم نے ان بتوں کے ذریعہ مطیع اور فرمانبردار اشخاص کی شبیہ بنارکھی ہے جو بارگاہ خداوندی سے قریب ہیں چنانچہ ہم خدا کی تعظیم و تکریم کے لئے ان کی پرستش کرتے ہیں۔

بت پرستوں کے تیسرے گروہ نے کہا، جس وقت خدا نے جناب آدم کو خلق کیا تھا اس وقت فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کریں، ہم انسان اس سے زیادہ مستحق تھے کہ جناب آدم کا سجدہ کریں، لیکن چونکہ ہم اس وقت، موجود نہیں تھے اس لئے اس سے محروم ہوگئے اس وجہ سے ہم آج آدم کی شبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتے ہیں تا کہ محروم سجدہ کی تلافی ہوسکے اور جس طرح فرشتوں نے خدا کا قرب حاصل کیا تھا اس طرح ہم بھی اس کا قرب حاصل کرتے ہیں اور جس طرح آپ نے اپنے ہاتھوں سے محراب بنائی ہے اور کعبہ کے اطراف اور اس کے مقابل خدا کی تعظیم میں سجدہ کرتے ہیں، ہم بھی اسی طرح بتوں کے سامنے سر جھکا کر خدا کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان تینوں دستوں کو الگ الگ جواب دیئے۔ آپ نے پہلے گروہ کی طرف رخ کیا اور فرمایا جو تم یہ کہتے ہو کہ خدا ہیکل اور مجسمہ کی شکل میں ان بتوں کے اندر حلول کرگیا ہے اور مطیع اور پرہیزگار بندوں کی شبیہ بنا کر ان کی پرستش کرتے ہو تو تم نے اپنے اس بیان سے خدا کی تعریف مخلوقات کی طرح کردی، کیا تم اس کو بھی اپنی طرح محدود و حادث سمجھتے ہو؟ کیا خدا کسی محدودشی میں حلول کرسکتا ہے، اس بنا پر خدا اور دوسری چیزوں میں کیا فرق رہ گیا جو دوسروں میں حلول کرتی ہیں، جیسے رنگ بو ذائقہ، نرمی، سختی اور اذن وغیرہ میں اس بنیاد پر تم کہتے ہو کہ جس میں خدا نے حلول کیا ہے وہ محدود اور حادث ہے اور خود حلول ہونے والا محدود اور قدیم ہے جب کہ اصل اس کے خلاف ہونا چاہئے جو حلول کرے اسے حادث اور محدود ہونا چاہئے، اس طرح کیسے یہ ممکن ہے کہ جو خدا

کائنات کی تمام اشیا سے پہلے مستقل اور غنی تھا اور کوئی جگہ اور محل نہیں رکھتا تھا پھر کیسے کسی جگہ کا محتاج ہوگیا اور خود اس جگہ میں حلول کرگیا، خداوند عالم کے موجودات میں حلول کو جائز کرکے تم نے اپنے عقیدے کے مطابق اسے حادث و محدود کردیا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا قابل تغیر و زوال ہے اور اگر تم اس بات کے معتقد ہو کہ حلول کرنا، تغیر و زوال کا باعث نہیں ہوتا تو تمہیں چاہئے کہ حرکت، سکون اور مختلف رنگوں میں سیاہ سپید، لال، پیلے کو قابل تغیر نہ سمجھو، اب بتاؤ یہ درست ہے کہ ہر طرح کے عوارض اور حالات خدا پر عارض ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں تم خدا کو محدود اور حادث اور موجودات کی طرح توصیف کرتے ہو اور اسے تمام مخلوقات کی شبیہ جانتے ہو اور جب ہیکل اور مجسموں میں خدا کے حلول کا عقیدہ بے بنیاد ہو تو لامحالہ بت پرستی کا بھی عقیدہ غلط ثابت ہوگا۔

پہلا دستہ رسول اکرمؐ کی بات سے گہری سوچ میں پڑگیا یعنی اسلامی منطق نے اپنا اثر دکھانا شروع کردیا۔

پیغمبر اسلامؐ دوسرے دستہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم مجھے یہ بتاؤ کہ جب تم پرہیزگار بندوں کی شبیہوں کے سامنے سر جھکاتے ہو اور ان کے سامنے نماز پڑھتے ہو، سجدہ کرتے ہو یا ان کے سامنے سجدہ کے عنوان سے اپنی پیشانی خم کرتے ہو تو پھر خدا کے لئے کون سا طریقہ رکھ چھوڑا ہے اور اس کے علاوہ یہ بھی غور طلب ہے کہ سب سے زیادہ خضوع و خشوع کا کون سا طریقہ باقی رہ جاتا ہے جسے تم نے خدا کے لئے مخصوص کر رکھا ہو اور اگر یہ کہتے ہو کہ خدا کے سامنے بھی ہم سجدہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم خدا اور اس کے بندوں کو برابر سمجھتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا تمہاری نگاہ میں ان بتوں کی تعظیم کے برابر خدا کی تعظیم ہے؟ کیا تم ایک حاکم کو اور اس کے نوکر کو برابر کا احترام دو گے؟

بت پرست: بہرحال یہی ٹھہرے گا۔

پیغمبر اسلامؐ: اس بنا پر تم ان بتوں کی پرستش کرکے درحقیقت خداوند متعال کی عظمتوں کی توہین کرتے ہو۔

دوسرے گروہ کے لوگ بھی پیغمبر اسلام کی مدلل باتوں کے سبب پہلے والے دستے کی طرح مبہوت ہوگئے۔

اب پیغمبر نے تیسرے دستہ کی جانب رخ کیا اور فرمایا: تم نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے تشبیہ دی ہے اس بنا پر کہ بتوں کے سامنے سجدہ کرنا گویا خانۂ کعبہ یا آدم کو سجدہ کرنے جیسا ہے لیکن ان دونوں

چیزوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، یہ کسی بھی رخ سے قابل مقائسہ نہیں ہے، ہم اس بات کے معتقد ہیں کہ خدا ہمارا پروردگار ہے وہ جس طرح ہمیں اپنی عبادت کا حکم دے گا ہم اسی طرح اس کی عبادت کریں گے اور کسی بھی طرح ہم اس کے فرمان کی حد سے آگے نہ بڑھیں گے اور نہ ہی اپنی طرف سے اس کی عبادتوں کے طریقے ایجاد کریں گے کیونکہ ہم اپنے وظائف و فرائض کو خود سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے خدا نے بعض چیزوں کا ہم سے مطالبہ کیا ہے اور بعض چیزوں سے روکا ہے، اس نے ہمیں اپنے حکم کا پابند بنایا ہے چونکہ اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ عبادت کرتے وقت ہمارا چہرہ قبلہ رخ ہونا چاہئے لہذا ہم قبلہ رو رہتے ہیں اور خدا نے جناب آدم کا سجدہ کرنے کا جو حکم دیا تھا اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں تھا کہ تم ان کے مجسمہ کو بھی سجدہ کرنے لگو کیونکہ بہرحال آدم کا مجسمہ اور ہے، آدم کچھ اور، تمہیں اس حکم کی بنا پر قیاس نہیں کرنا چاہئے ممکن ہے خدا اس سے راضی نہ ہو، اس نے تمہیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔

اس کے بعد رسول نے فرمایا مثال کے طور پر اگر کوئی تمہیں کسی معین دن کسی گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے تو کیا تمہارے لئے جائز ہے کہ تم کسی غیر معین دن میں بھی بغیر اس کی اجازت کے اس کے گھر میں داخل ہو یا کسی شخص نے تمہیں اپنے کپڑوں اور غلاموں میں سے کسی ایک لباس یا ایک غلام کو ہدیہ کیا تو کیا تمہارے لئے جائز ہے کہ تم دوسرا کپڑا اور غلام یا دوسرا حیوان جو بالکل ہدیہ دیئے جانے والے کی طرح ہے، تصرف میں لے آؤ؟

بت پرست: نہیں ہمارے لئے یہ بالکل جائز نہ ہوگا کیونکہ اس نے پہلے کے لئے اجازت دی ہے نہ کہ دوسرے کے لئے۔

پیغمبر اکرمؐ: اچھا یہ بتاؤ کہ اس بات کا زیادہ حقدار خدا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت میں تصرف نہ کیا جائے یا دوسرے لوگ؟

بت پرستوں نے یک زبان ہو کر کہا، یقیناً خدا زیادہ اطاعت کا مستحق ہے اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت میں تصرف صحیح نہیں ہے۔

پیغمبر اکرمؐ: تو پھر تم کیوں خدا کی اجازت کے بغیر بتوں کا سجدہ کرتے ہو؟

بت پرستوں کا یہ گروہ بھی رسول کے پیغمبرانہ استدلال سے انگشت بدنداں رہ گیا، امام جعفر صادق علیہ السلام

فرماتے ہیں کہ قبل اس کے یہ نشست برخاست ہوتی سب کے سب مسلمان ہو گئے۔[۱]

اس واقعہ کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ عالم اسلام کے تئیں دردمند دل رکھنے والے مبلغین کرام، پیغمبر اسلامؐ کے طرز افہام وتفہیم سے تبلیغ کی سیکھ لیں اور بنا کسی مزاحمت اور طنز وتشنیع کے شفقت آمیز انداز میں مدلل و مستدل مذاکرات اور عملی وعلمی طریقہ سے دنیا کو دین سے آشنا کرائیں تاکہ فرزندان توحید کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکے اور اہتمام ظہور وارث اسلام میں بامعنی حصہ داری ہو سکے۔

دھیان رہے، ہندستان میں بالخصوص تبلیغ و ترویج دین اور نشر و اشاعت فلسفۂ توحید کے لئے پیغمبر اکرمؐ کی ذات اقدس خصوصی اسوہ ونمونہ کی حیثیت رکھتی ہے چونکہ پیغمبرؐ نے جس معاشرہ میں نعرۂ توحید بلند فرمایا اس معاشرہ میں اور ہندستان کے اکثریتی سماج میں بت پرستی سمیت بے شمار توہمات قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا باعمل صاحبان علم کو آگے آنا چاہئے اور روش تبلیغ بانی اسلام کے خطوط مستقیم پر چلتے ہوئے فلسفہ توحید اور دین اسلام کی ترویج و اشاعت کرنی چاہئے۔

۱- احتجاج طبرسی، ج ۱، ص ۴۴-۱۶

ثقافتی سرگرمیاں

حیدرآباد میں جشن مولود کعبہ

حیدرآباد (پریس نوٹ) کل ہند نہج البلاغہ سوسائٹی کے زیر اہتمام ۲۷ جولائی کو نہرو آڈیٹوریم مدینہ ایجوکیشن سینٹر میں مولائے کائنات باب العلم حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت با سعادت کے مبارک موقع پر ''جشن مولود کعبہ'' و رسم اجراء مولود کعبہ نیز (ہفت روزہ بانگ درا) کا شاندار اہتمام کیا گیا۔ قونصل جنرل ایران حال مقیم حیدرآباد عزت مآب جناب حسین روش، جسٹس سردار علی خاں سابق صدر قومی اقلیتی کمیشن، جناب خلیل الرحمٰن سابق رکن پارلیمنٹ اور ممتاز ادیب جناب منظورالامین سابق ڈائرکٹر جنرل دوردرشن نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ پروفیسر ڈاکٹر ایم ایم تقی خاں نے صدارت کی۔

سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ممتاز وسینیر صحافی و ادیب جناب کرار کاظمی مدیر اعلیٰ ہفت روزہ بانگ درا نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں شرکاء کا خیر مقدم کرتے ہوئے سوسائٹی کی پچھلی ۳۴ سالہ کارکردگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور سوسائٹی کی جانب سے ہندستان کی دو یونیورسٹیز عثمانیہ یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی، سری نگر میں نہج البلاغہ فیلو شپ کے قیام سے واقف کرایا۔ جلسہ کا آغاز نواب قاری اقبال علی خاں کی قرأت قرآن کریم اور منقبت علیؑ سے ہوا۔ کمسن طلبہ و طالبات حیدر فاطمہ، حسین عباس اور سراج فاطمہ نے مولائے کائنات کے حضور منقبت پیش کی۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی، میجر جنرل سید علی اختر زیدی، جناب تقی عسکری ولا، جناب انجنی کمار گوئل اور جناب کرار کاظمی نے بارگاہ مرتضوی میں منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

قونصل جنرل ایران آقای حسین روش نے اس موقع پر پچھلے ۴۸ سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے ہفت روزہ بانگ درا کے ''مولود کعبہ نمبر'' کی رسم اجرا انجام دی جس کو بطور تحفہ شرکاء جلسہ میں مفت تقسیم کیا گیا۔ آقای حسین روش نے اپنی تقریر میں کہا کہ انسانی تاریخ میں حضرت علی علیہ السلام ایک عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے کردار، عمل اور تعلیمات کے ذریعہ بنی نوع انسان کی ہدایت فرمائی ہے۔ حضرت علیؑ کی شجاعت، حکمرانی اور غزوات میں آپ کے نمایاں

کارناموں کے ساتھ ساتھ آپ کا تقویٰ، صبر، علم اور روحانی فیوضات نے آپ کو برتر و اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا اس لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایران میں حضرت علیؑ کی ولادت کا جشن بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے اور اس دن کو ''یوم پدر'' اور ''یوم شوہر'' کے طور پر مناتے ہیں۔

جسٹس سردار علی خاں نے کہا کہ امیرالمؤمنین حضرت سیدنا علیؑ شجاعت کا پیکر تھے، بدر کا معرکہ ہو کہ فتح خیبر، شمشیر حیدری نے دشمنان اسلام کو شکست فاش سے دوچار کردیا تھا۔ کعبۃ اللہ میں ولادت، حضور اکرمؐ کی آغوش میں تربیت اور فیض صحبت نے آپ میں وہ جوہر پیدا کئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ جسٹس سردار علی خاں نے کہا کہ آج دنیا میں طاغوتی طاقتیں ہر محاذ پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہیں، مسلمانوں کو کمزور کرنے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے سازشیں رچائی جارہی ہیں اس لئے آج حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہماری صفوں میں اتحاد، یگانگت اور محبت پیدا ہو۔ ہم معمولی باتوں پر آپس میں دست و گریباں نہ ہوں۔ شیعہ، سنی، مہدوی یا دیگر مسلکوں کے خانوں میں بٹ کر ہم خود کو کمزور اور محصور نہ کریں۔ در اصل یہی حضرت علیؑ کی تعلیمات ہیں جن پر ہمیں عمل پیرا ہونا ہوگا۔ سینیر کانگریسی قائد جناب خلیل الرحمٰن نے کہا کہ آج بھی مسلمانوں کی قربانیاں اور خدا کی راہ میں بہایا گیا خون اسلام کو غیرت و توقیر سے ہمکنار کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ ایران کے خلاف صیہونی طاقتوں کا ناپاک اتحاد ایران اور اسلام کو کمزور نہیں کرسکتا۔ سامراجی اور اسلام دشمن طاقتیں سمجھتی ہیں کہ ملت اسلامیہ کمزور ہے درحقیقت ہم کمزور نہیں بلکہ ہمارا صبر ہے جو ظلم و استبداد کو برداشت کررہا ہے لیکن اگر ہم ذوالفقار علیؑ کے ساتھ میدان عمل میں آجائیں تو پھر ساری طاقتیں نیست و نابود ہوجائینگی۔ جناب منظورالامین نے کہا کہ حضرت علی کی تعلیمات ہر دور میں ہدایت ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم سختی سے ان پر عمل پیرا ہوجائیں۔ پروفیسر ڈاکٹر تقی خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ بعض مغربی مستشرقین نے دعوی کیا تھا کہ مذہب اور حکومت اور مذہب اور مقبولیت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ لیکن حضرت علیؑ نے ثابت کردیا کہ مذہب اور حکومت ساتھ رہ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اسلامی اصولوں پر عمل کریں۔ انہوں نے نہج البلاغہ کو علم و حکمت اور معرفت کے خزینہ سے موسوم کیا۔ عابد صدیقی سابق نیوز ریڈر دور درشن نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جشن مولود کعبہ میں بشمول خواتین شرکاء کی بڑی تعداد موجود تھی۔

امیر خسرو دہلوی کے ہندوی کلام پر خصوصی خطبہ

۶ اپریل ۲۰۰۷ کو ایوان غالب میں نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کی طرف سے امیر خسرو پر ایک خصوصی خطبے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس جلسے کی صدارت جناب مرتضیٰ شفیعی شکیب صاحب (کلچرل کاؤنسلر اسلامک ریپبلک آف ایران، نئی دہلی) نے فرمائی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر ساہتیہ اکادمی نے ''امیر خسرو دہلوی کا ہندوی کلام'' پر خطبہ پیش کیا۔

جلسے کے آغاز میں پروفیسر شریف حسین قاسمی سکریٹری نیشنل امیر خسرو سوسائٹی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس سوسائٹی کا مختصر تعارف پیش کیا اور فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں امیر خسرو کے اعلیٰ مقام کا ذکر کیا۔ آپ نے کہا کہ خسرو پر حالاں کہ بہت تحقیقی کام انجام دیا جاچکا ہے جس کا آغاز وحیدمرزا کی خسرو کی زندگی اور علمی و ادبی کارناموں پر انگریزی اور اردو کتابوں کی اشاعت سے ہوتا ہے، تاہم ان کے کلام کے بعض پہلو ابھی تشنہ تحقیق و بیان ہیں۔ پروفیسر قاسمی نے اس سلسلے میں خسرو دہلوی کے ان قصاید کا خصوصی ذکر کیا جن میں خسرو نے دنیا، اور اس سے وابستگی کی وقتی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ خسرو، سات بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے لیکن ان کے اس نوعیت کے قصاید خود ان بادشاہوں کو دنیا کی بے ثباتی، یہاں کی رونق و چمک دمک کا بے وقعت ہونا، اس سے وابستگی کا مہمل تصور وغیرہ پر اپنے شدید خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کے کلام کا یہ پہلو ابھی مکمل طور پر واضح نہیں ہوسکا ہے اور اس پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر انجم صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا اور دونوں مہمانوں جناب مرتضیٰ شفیعی شکیب اور پروفیسر نارنگ صاحب کا گلدستوں سے استقبال کیا۔

پروفیسر نارنگ صاحب نے امیر خسرو کے ہندوی کلام سے مفصل اور تحقیقی بحث کی۔ یہ کلام جن قدیمی مآخذ میں درج ہے ان کا ذکر کیا اور خاص طور پر ہندستان سے باہر کے کتابخانوں میں خسرو کے جستہ جستہ ہندوی کلام کے نمونوں کے مآخذ کی وضاحت کی۔ آپ نے اس بات پر اصرار کیا کہ

ہمیں جب تک قطعی طور پر یہ معلوم نہ ہوجائے کہ خسرو سے منسوب ہندوی کلام کس کا ہے اس وقت تک اس کا خسرو سے انتساب نہ صرف درست ہے بلکہ یقینی ہے۔ ہم خسرو کے ہندوی کلام کو کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور اس پر کام کرنے والوں نے اس کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ خود خسرو کا ہندستان سے پیدائشی تعلق کا یہ کلام ثبوت ہے۔ پروفیسر نارنگ صاحب نے بہرحال اس بات پر اصرار کیا کہ ہمیں خسرو کے ہندوی کلام سے متعلق اپنی تحقیق جاری رکھنی چاہئے اور وہ وقت دور نہیں جب ہمیں کوئی نہ کوئی ایسا قدیم مآخذ ضرور ملے گا جس سے ہندوی کلام کا خسرو سے انتساب حتمی صورت اختیار کرے گا۔

جلسے کے صدر مرتضیٰ شفیعی شکیب صاحب نے اپنی عالمانہ تقریر میں خسرو کے فارسی کلام کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا اور فارسی ادب خاص طور پر فارسی شاعری میں خسرو کے نہایت بلند مقام کی تصدیق کی اور اس کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالی۔

آپ نے مزید فرمایا کہ خسرو اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے خصوصی تعلقات پر بھی روشنی ڈالی جانی چاہیے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا پر اگر نیشنل امیر خسرو سوسائٹی سیمنار منعقد کرے گی تو خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی پورا تعاون کرے گا۔

اس جلسے میں وحید مرزا صاحب کی امیر خسرو پر کتاب اور امیر خسرو سے متعلق سی ڈی اور کیسٹ کی جسے ڈاکٹر ظ انصاری مرحوم نے مرتب کیا تھا، رونمائی بھی عمل میں آئی۔

اس خطبے کے بعد موسیقی کا پروگرام منعقد ہوا جس میں دہلی کے معروف گلوکار استاد ضمیر احمد خاں نے حضرت امیر خسرو کا ہندوی کلام پیش کیا۔

کشمیر یونیورسٹی میں فارسی کا نواں دورۂ دانش افزائی

(ایک رپورٹ)

۲۳ اپریل ۲۰۰۷ء بروز دوشنبہ کشمیر یونیورسٹی (سری نگر ہندستان) کے گاندھی ہال میں فارسی بازآموزی کے خصوصی دروس کا افتتاح ہوا جس میں ۲۰۰ سے زائد اساتید و طلاب (زبان و ادبیات فارسی) نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز جناب برکت علی صاحب متعلم زبان فارسی کے ذریعے کی گئی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ کلام اللہ کی تلاوت کے فوراً بعد طلاّب زبان فارسی نے مدح پیغمبر اکرمؐ میں اشعار پیش کیے جس میں سے ایک شعر پیش خدمت ہے:

جہان روشن است از جمال محمدؐ
دلم تازہ گشت از وصال محمدؐ

''دنیا جمال محمدی سے روشن ہے اور میرا دل ان کے وصال سے تازہ ہے''۔

پروفیسر نیازمند (صدر شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی) نے جملہ مہمانوں بالخصوص آقای مرتضیٰ شفیعی شکیب صاحب (کلچرل کاؤنسلر ایران کلچر ہاؤس) کا شکریہ ادا کیا اور اس دورۂ بازآموزی کے انعقاد کے سلسلے میں کلچر ہاؤس کی معاونت کی قدردانی کی، اور کہا ''میں انتہائی خوش نصیب ہوں کہ اس یونیورسٹی میں فارسی کے دوسرے دورۂ بازآموزی کا انعقاد ہوتے دیکھ رہا ہوں، ہم جب بھی اس زبان کے سلسلے میں بات کریں ہمیں چاہئے کہ ہم اس کی سات سو سالہ تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے گفتگو کریں، یہ وہ زبان ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں وارد کشمیر ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے اثرات سارے کشمیر پر چھاگئے یہاں تک کہ اس نے یہاں کی رسمی زبان، سنسکرت کی جگہ لے لی۔ کشمیر میں اس کی کامیابی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ زبان تمدنی ہونے کے ساتھ ساتھ دینی بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے بیشتر دینی وعرفانی مواد اسی زبان میں ملتے ہیں۔ فارسی نے کشمیر و ہندستان میں اتنا نفوذ پیدا کیا کہ متعدد شعراء وعرفا ایران نے ایران سے ہندستان کی طرف مہاجرت کی نتیجتاً اہم اور بے شمار کتابیں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں''۔

انہوں نے کشمیر میں فارسی زبان کی آموزش کی نسبت کے سلسلے میں فرمایا'' فی الحال چھ ہزار سے زائد کشمیری طلاّب فارسی سیکھ رہے ہیں کیونکہ آج بھی بعض اسکولوں اور کالجوں میں دسویں کلاس اور اس کے بعد کے درجوں میں فارسی پڑھائی جاتی ہے''۔

آخر کلام میں انہوں نے پھر خانۂ فرہنگ کے تعاون کے لئے جناب شکیب صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد پروفیسر قمر غفار نے فرمایا'' یہ دورہ کلچرل کاؤنسلر کی سوجھ بوجھ اور ایرانی ذمہ داروں کی توجہ خاص کا نتیجہ ہے جو تحفظ و ترویج زبان فارسی کے لئے منعقد ہورہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ بتایا گیا کہ دو ایرانی استاد برائے فروغ زبان فارسی بھیجے جائیں گے یہ طلاّب و اساتید دونوں ہی کے لئے انتہائی ثمر بخش اور مفید ثابت ہوں گے یہ اشد ضروری قسم کا اٹھایا گیا خوش آیند قدم ہے ہم اس کا استقبال کرتے ہیں۔

ان کے بعد حکومت جموں کشمیر کے نمائندہ اور ایرانی مندوبین کے میزبان جناب محمد شفیع پنڈت نے ہند و ایران کے مشترکہ اقدار کے ترویج و ارتقا اور ایران کلچر ہاؤس کی کارگزاریوں پر اپنی خوشی اور تشکر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا'' ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ کشمیر اور یہاں کے لوگ انسانی تہذیب و ثقافت میں اہم مقام رکھتے ہیں کشمیر علوم و ثقافت کا مرکز رہا ہے، ایران و کشمیر کے تہذیبی رشتے ۲۵ سو سال پرانے ہیں۔ بادشاہ ہخامنشی کے دور میں یہ علاقہ اس کی حدود حکومت میں ہوا کرتا تھا''۔

علاوہ ازیں انہوں نے کشمیر میں زبان فارسی کا تاریخچہ پیش کرتے ہوئے کہا'' فارسی بہت کم وقت میں کشمیر میں رواج پاگئی اور قائم مقام سنسکرت ہوگئی نیز اس نے معاشرہ کے ہر شعبہ یعنی ادبیات و ثقافت، تمدن معیشت اور اقتصاد و سیاست میں اپنی جڑیں مضبوط کرلیں جیسے کہ یہ ہمیشہ سے یہاں کی زبان رہی ہو۔ یہ زبان اسلامی اور عرفانی مواد سے مالا مال ہونے کے سبب دینداروں میں مقبول ہوئی اگرچہ انگریزی حکومت کے دوران اس کی چمک پھیکی پڑگئی پھر بھی آج ہندستان کے تمدن دوست طبقہ کے دلوں میں اس کے لئے خصوصی جگہ ہے''۔

جناب شفیع پنڈت نے زبان فارسی کے تحفظ و توسعہ کے تناظر میں فرمایا کہ کشمیری مفکروں اور بزرگوں نے ہندستان کی تحریک آزادی کے دوران اس زبان سے خاصا استفادہ کیا اور اس کی خدمت کی چنانچہ آج بھی اساتید زبان فارسی اس کے ترویج و ارتقا کے لئے کوشاں ہیں۔

افتتاحی پروگرام کے مہمان خصوصی اور کلچرل کاؤنسلر آقای مرتضیٰ شفیعی شکیب نے اللہ کا نام لیتے ہوئے اور رسول و آل رسول پر درود بھیجتے ہوئے دوسری بار کشمیر کے دورۂ بازآموزی میں شرکت کرنے پر خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا ''ہم ایرانی کشمیر آنے کے بعد غریب الوطنی کا احساس نہیں کرتے اسے اپنی مادرگیتی کی طرح سمجھتے ہیں''۔

انہوں نے فرمایا ''عزیز بھائیو اور بہنو! میں آپ میں سے بیشتر کے چہرے پہچانتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے دوبارہ آپ کے دیدار کا موقع فراہم کیا، یوں بھی آپ کے چہرے ہمارے لئے نئے نہیں ہیں ہم آپ کو اپنوں میں سے جانتے ہیں کہنا چاہئے کہ ایران سبھی حضرات کا ہے''۔ جو دوستدار زبان و ادبیات ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے دینی و تمدنی مراکز پر دکھائی دینے والے فارسی اشعار کے نقوش کے سلسلے میں فرمایا کہ ''میں سری نگر کے مختلف مقامات مثلاً چشمہ شاہی، نشاط باغ وغیرہ گیا ہوں اور میں نے وہاں فارسی اشعار کندہ دیکھے۔ مثلاً مسجد حضرت بل میں (جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پیغمبرؐ اعظم کے سراقدس کا ایک بال یہاں محفوظ ہے) یہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں اس بال کے وارد کشمیر ہونے کی حکایت ہے:

محتاجان را بہ وقت حاجت طلبی　　　موئی مدد است یا رسول عربی
تاریخ ورود با یکی ہاتف　　　کشمیر مدینہ شد از موی نبی
(۱۱۱۱ھ۔ق۔)

محتاجوں کو وقت حاجت یا رسول اللہ آپ کے بال سے مدد ہے، جب تک آپ کا بال وارد کشمیر ہوا تو ایک ہاتف کی ندا آئی، نبی کے بال کے کشمیر آنے سے کشمیر مدینہ ہوگیا''۔

نیز اندرون مسجد پیغمبر کی مدح میں یہ شعر درج ہے:

خط سبز و لب لعل و رخ زیبا داری　　　حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضا داری

علاوہ بریں آپ نے بے روزگار فارغ التحصیل طلاب زبان فارسی کے سلسلے میں فرمایا ''اگر کوئی زبان فارسی کی تحصیلات کے بعد کوئی دوسری زبان رائج مثلاً انگریزی سیکھ لے ہرگز خالی نہ بیٹھے گا''۔

آخری گفتگو میں کلچرل کاؤنسلر نے اعلان کیا کہ ایران کلچر ہاؤس کی طرف سے شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی کو ایک ٹیلی ویژن اور اس کے لوازمات کے علاوہ تمام ایران چینل ہدیہ کیا جارہا ہے جو کہ طلاب کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ قابل ذکر یہ ہے کہ ایران کا چینل ۳ (جام جم) پچھلے کئی

سالوں سے دیکھا جارہا ہے۔

اختتامیہ کے طور پر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے پروگرام کے میزبان کی حیثیت سے کلچرل کاؤنسلر کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اس قسم کے دورہ سے دونوں ملک کے افراد کو اپنی مشترک اقدار کو سمجھنے کا موقع ملے گا اور فرہنگ و زبان فارسی کا احیا ہو سکے گا جسے ہمیشہ کشمیر اور ہندستان کی تہذیبی تاریخ کا اہم حصہ سمجھا گیا ہے۔

معرفی کتاب

(تازہ ترین کتابوں کا تعارف)

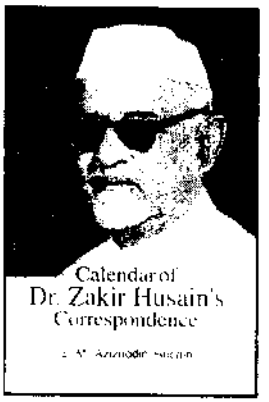

کتاب کا نام: Calendar of Dr. Zakir Husain's Correspondence

تصنیف : پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین

صفحات : XIV+۳۴۶

قیمت : ۸۰۰ روپے

ناشر : جامعہ آرکائیوز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد سجاد

ذاکر حسین (۱۹۶۹-۱۸۹۷) کی سوانح عمری پر اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں محمد مجیب، ضیاء الحسن فاروقی، رشید احمد صدیقی، راج موہن گاندھی، بی۔ شیخ علی، کے۔ آر۔ بی۔ سنگھ، سیدہ سیدین حمید، سعیدہ خورشید وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کی تقریروں کو بھی مرتب کر کے شائع کیا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود اب بھی بہت سے دستاویز کی تلاش اور ان کا حصول باقی ہے۔ عزیز الدین حسین نے بڑی عرق ریز محنت سے ذاکر حسین کے مکتوبات کی نہ صرف تلاش کی ہے بلکہ انہیں ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ اس اشاعت سے ذاکر حسین کی حیات و خدمات پر مزید روشنی پڑتی ہے آزاد ہندستان کے عملی مفکرین میں ذاکر حسین اپنی انسان دوستی اور منکسر المزاجی کی وجہ سے زیادہ اہم شخصیت بن جاتے ہیں۔

جیسا کہ اس کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ زیر تبصرہ کتاب میں ذاکر حسین کے مکتوبات کو مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں مختلف اداروں اور شخصیتوں کو ارسال کئے گئے مراسلے شامل ہیں۔ ۱۹۱۶ء سے لے کر ذاکر حسین کی زندگی کے آخری لمحوں تک کے تمام خطوط (انگریزی و اردو) کے حوالے اور

ان کے خلاصے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ شروع میں ایسے خطوط بھی شامل ہیں جن سے ذاکر حسین کے زمانۂ طالب علمی کے بارے میں جانکاریاں ملتی ہیں۔ یہ خطوط ایک نوع سے تعریفی خطوط یا Testimonials ہیں جن میں ایٹہ سے لے کر علی گڑھ تک کی ان کی تعلیمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے انہوں نے ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں سائنس میں داخلہ لیا تھا لیکن بعد کو ۱۹۱۶ میں آرٹس و سوشل سائنس کی طرف رجوع کرلیا۔ ان خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں بتدریج ارتقا ہوا۔ اپنی تقریری اور مذاکرانہ صلاحیت کی وجہ سے وہ علی گڑھ میں نہ صرف کافی مقبول ہوگئے تھے بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر رہنمائی کی بے پناہ صلاحیتیں بھی موجود رہی ہیں۔

ذاکر حسین اپنی ظرافت اور حاضر جوابی کی وجہ سے بھی کافی مقبول تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ لوگوں کا دل جیت لیتے تھے۔ ایسی تمام خوبیوں کی وجہ سے نہ صرف انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشکل ترین ادوار میں وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں بلکہ بعد میں بہار کے گورنر بھی بنے اور پھر جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور صدر کی بھی ذمہ داریاں بہ خوبی نبھائیں۔ ان تمام عظیم عہدوں پر رہتے ہوئے انہوں نے سبھی جگہوں پر بنیادی طور سے ایک معلم کی خوبیاں ہی دکھائیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں کچھ ایسے خطوط بھی ملتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظام حیدرآباد اور سنٹرل بینک آف انڈیا نے جامعہ ملیہ کو اس کے ابتدائی مشکل دور میں مالی امداد بہم پہنچائی۔ (صفحہ ۱۴ مراسلہ بتاریخ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء)

کچھ ایسے خطوط بھی ملتے ہیں جن میں ذاکر حسین نے نہ صرف شرح خواندگی میں تیز اضافے کی ضرورت پر زور دیا ہے بلکہ بھارت کے دیہاتوں میں بھی یونیورسٹیوں کے قائم کئے جانے کی ضرورت کو واضح کیا ہے۔ یوں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوآزاد ملک ہندستان کی مالی پریشانیوں کے پیش نظر ایسی تجاویز بے معنی تھیں لیکن آج ۲۱ ویں صدی میں ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ بھارت تو بنیادی طور سے دیہاتوں کا ملک ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تقسیم وطن کے بعد ایک بڑے بحران کا شکار ہوچکی تھی۔ لہذا ۱۹۴۸ سے لے کر ۱۹۵۶ تک انہیں خصوصی طور پر اس یونیورسٹی کی سربراہی سونپی گئی۔ انہوں نے ناشروں، طلبا

کے رہنماؤں، اساتذہ وغیرہ سے کئی مراسلے کئے۔ ان مراسلوں سے مسلم یونیورسٹی اور آزاد ہندستان کی تعلیم و سیاست کی تاریخ لکھنے میں بہت بڑی مدد ملے گی۔ انہوں نے مرکزی حکومت کے شعبۂ تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے مسلسل مراسلے کے ذریعہ یونیورسٹی کے لئے نہ صرف فنڈ حاصل کیا بلکہ کئی نئے شعبے قائم کئے۔ اس کے علاوہ پرانے شعبوں کو وسعت و توانائی بخشی۔ انہوں نے کئی ملکی و غیرملکی مندوبین کی علی گڑھ میں مہمان نوازی کی۔ اس کا مقصد صرف مالی امداد حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ علی گڑھ کیمپس کی تہذیبی و سیاسی زندگی کے سلسلے میں پھیلی بدگمانیوں کو دور کرنا تھا۔

ایک سوانح نگار بی۔ شیخ علی نے یہ لکھا ہے کہ ذاکر حسین بہار کے مقبول ترین گورنر ثابت ہوئے کیوں کہ نہ صرف انہیں گہرا تجربہ تھا، نہایت ہی ذہین، انسان دوست، ہر دل عزیز انسان تھے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی گہری دلچسپی تھی۔ صرف گندی سیاست سے خود کو دور رکھتے تھے۔ شیخ علی کی اس رائے کی تائید میں ایسے کئی خطوط ملتے ہیں جو زیر تبصرہ کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

مہاتما گاندھی کی مشہور ''بنیادی تعلیم'' (واردھا ۱۹۳۷) کی اسکیم کو ایک مخصوص شکل اور مقبولیت بھی ذاکر حسین کی وجہ سے ہی ملی۔ اس میں دست کاری و صنعت کاری کی بنیادی ٹریننگ بھی شامل تھی۔ اس کی وجہ سے اس اسکیم کو کافی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور مجموعی طور پر یہ اسکیم بہت کم کامیاب رہی۔ لیکن ذاکر حسین نے بہار کی گورنری سنبھالنے کے بعد اس اسکیم کے تحت اس صوبے میں ''بنیادی اسکولوں'' کے کئی ادارے قائم کروائے۔ ان کا یہ تجربہ بہار میں کافی کامیاب ثابت ہوا اور آج بھی ان اسکولوں کا انتظام صوبائی حکومت نے سنبھال رکھا ہے۔ دیگر سرکاری اسکولوں کی بہ نسبت ''بنیادی اسکولوں'' کو زیادہ افتخار حاصل رہا ہے۔

نہرو کے پنج سالہ منصوبوں میں بڑی صنعتوں کو زیادہ فوقیت حاصل تھی۔ اس اسکیم میں صوبۂ بہار کو نقصان ہو رہا تھا اور ہوا۔ گورنر ذاکر حسین نے اپنی دوراندیشی سے ان نقصانات کو بھانپ لیا اور ۱۹۵۷ میں انہوں نے نہایت ہی انکساری اور مصلحت کے ساتھ اپنی نااتفاقی کا نرم اظہار کیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ بنیادی ضرورتوں کے سامان بنانے والی صنعتوں کو ہی ترجیح دی جانی چاہیے۔

دانشوروں کا ایک طبقہ ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہے کہ مرکزی حکومت نے صوبۂ بہار کے خلاف امتیاز برتا ہے اور اسے ''انٹرنل کالونی'' بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ان شکایتوں کو دور کرنے کی غرض سے ۱۹۶۰ میں انہوں نے بھارت کے پلاننگ کمیشن سے اپیل کی کہ بہار کی ترقی میں وہ خصوصی دلچسپی لے تاکہ

متوازی علاقائی ترقی کا آئینی مقصد بروئے کار ہو سکے۔ (صفحہ ۵۳)

۱۹۰۵ء میں گوپال کرشن گوکھلے نے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ۱۴ سال تک کے بچوں کے لئے جبری مفت تعلیم کی مانگ کی تھی۔ ذاکر حسین نے آزادی کے بعد اس اہم مقصد کی یاددہانی بار بار کرائی۔

آزادی کے بعد اتر پردیش کے مقابلے صوبۂ بہار میں اردو کی بہتر صورتحال کی ایک بڑی وجہ ذاکر حسین کی کوشش بھی مانی جاتی ہے۔ انہوں نے گورنر کی حیثیت سے پٹنہ میں شعر و ادب کے فروغ کے لئے کئی اقدام کئے۔ انہوں نے اسی غرض سے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قائم شدہ ۱۹ ویں صدی کے اینگلو عربک اسکول کو پھر سے شروع کرنے کی کوشش کی۔ نیز انہوں نے پٹنہ میں اردو کی ایک ادبی نمائش کا اجرا بھی نومبر ۱۹۵۹ء میں کیا۔ قاضی عبدالودود کی انجمن ''ادارۂ تحقیقات اردو'' کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ ان کاوشوں کی تصدیق سید بدرالدین احمد کی آپ بیتی ''حقیقت تھی کہانی بھی'' سے بھی ہوتی ہے۔ اس نمائش میں مظفرپور سے ۱۸۶۸ء میں نکلنے والے پندرہ روزہ ''اخبارالاخبار'' کی بھی جانکاری ملی۔ اور اس سے قاضی عبدالودود کو یہ جانکاری ملی کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر مظفرپور (بہار) میں بھی تعلیمی ادارے قائم کئے گئے تھے۔ (ملاحظہ فرمائیں قاضی عبدالودود کا مضمون ''فکر و نظر'' علی گڑھ سہ ماہی، جولائی ۱۹۶۰ء)۔

قاضی عبدالودود کی ''ادارۂ تحقیقات اردو'' کی تحریک اور اس کے بعد عبدالمغنی اور غلام سرور جیسے رہنماؤں کی وجہ سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ اور اس کے نتیجے میں اہل زبان کو سرکاری نوکریوں کے مواقع بھی حاصل ہوئے۔

ذاکر حسین تہذیبی وراثتوں کی حفاظت کے لئے بھی ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے دسنہ (ضلع گیا، بہار) اور ایسے کئی گاؤں کا دورہ کیا۔ دسنہ کی لائبریری میں کئی مخطوطات غیر محفوظ حالت میں رکھے تھے۔ ذاکر حسین نے گاؤں والوں سے استدعا کر کے ان تمام مخطوطات کو پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں بھجوا دیا۔

ذاکر حسین کو نوجوانوں سے خطاب کرنے میں، ان سے گفتگو کرنے میں، نصیحتیں دینے میں کافی مزہ آتا تھا کیوں کہ یہی تو ملک کے مستقبل ہوتے ہیں۔ گورنر کی حیثیت سے انہوں نے پٹنہ کے سائنس کالج کی ادبی انجمن ''بزم سخن'' کی دعوت پر طلبا سے خطاب کرتے ہوئے ان کی تعریف یہ کہتے ہوئے کی کہ:

سائنس کے طلبا کو بھی ادبی ذوق رکھنا چاہیے کیوں کہ ان کے مطابق ادب سے ہی ذہن کو عمومی وسعت حاصل ہوتی ہے۔ (صفحہ ۵۳-۵۲)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ذاکر حسین بنیادی طور سے ایک معلم تھے۔ اور اسی لئے اساتذہ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کی گورنری کے عہد میں پٹنہ کے راج بھون میں ''اسٹڈی سرکل'' چلایا جاتا تھا۔ جس میں اساتذہ سے گفتگو، سیمنار، مذاکرے وغیرہ شامل تھے۔ ایک خطاب میں انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ سے واضح لفظوں میں کہا کہ ٹیچرس ایسوایشن صرف ایک ٹریڈ یونین نہیں ہوسکتی۔ جب بہار اسمبلی کے ایک ایسے بل کی تجویز کی جس سے اعلیٰ تعلیم کو سیاست اور افسرشاہی کا تابعدار بنانے کی کوشش ہورہی تھی، چانسلر و گورنر ذاکر حسین نے اس بل کی شد و مد سے مخالفت کی اور اس طرح یونیورسٹیوں کی خودمختاری محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔

زیرتبصرہ کتاب میں جہاں ہم یہ پاتے ہیں کہ ذاکر حسین کی ذاتی اور عوامی زندگی سے متعلق متعدد نادر خطوط یکجا کیے گئے ہیں وہیں ہم اس میں کچھ کمیاں بھی پاتے ہیں۔ اول تو یہ کہ تعارفی مضمون (introduction) میں مصنف عزیزالدین نے تھوڑا اختصار سے کام لیا ہے۔ اگر موجودہ تصانیف کی مدد سے ذاکر حسین کے حالات زندگی پر زیادہ روشنی ڈالتے ہوئے ان تصنیفات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا جاتا تو شاید یہ زیادہ بہتر بات ہوتی۔ جن اشخاص کا ان خطوط میں ذکر آیا ہے ان کے بارے میں ایک تفصیلی، جامع تعارف (annotation) کے ذریعہ کیا جاتا تو یہ کتاب اور بھی زیادہ مددگار ثابت ہوتی۔ اس کتاب میں مضامین و اشخاص کے اشاریہ (index) کی عدم موجودگی بھی محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء کے دوران کا کوئی بھی خط اس میں شامل نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ اس دوران ذاکر حسین جرمنی میں تھے اس لئے جامعہ آرکائیوز میں اس عہد کے خطوط دستیاب نہ ہوں گے۔

ان سب کے باوجود ''جامعہ آرکائیوز'' کے ڈائرکٹر پروفیسر عزیزالدین حسین نے ایسے "Calendars" شائع کر کے محققین کا کام بہت ہی آسان اور خوشگوار کر دیا ہے (اس سے قبل انہوں نے ڈاکٹر انصاری کا "Calendars" شائع کیا ہے۔) ایسے تاریخ نویس جو اردو نہیں جانتے انہیں بھی اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔ لہذا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس "Calendars" کی مدد سے ذاکر حسین کی زیادہ جامع، معلوماتی سوانح عمری لکھی جاسکے گی۔

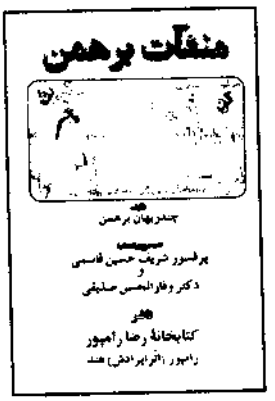

کتاب کا نام : منشآت برہمن

مؤلف : منشی چندر بھان برہمن

ترتیب وتحشیہ : پروفیسر شریف حسین قاسمی

و ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی

ناشر : رامپور رضا لائبریری، رامپور

قیمت : ۲۰۰ روپئے

ہندوستان میں فارسی میں انشا نویسی کی قدیم روایت رہی ہے۔ یہ ادبی روایت بھی فارسی زبان و ادب کی طرح ایران ہی سے ہندوستان منتقل ہوئی۔ ہندوستان میں پھر یہ روایت بہت پھلی پھولی۔

ضیاء الدین برنی نے اپنی منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ بغراخان نے اپنے لڑکے کیقباد (م: ۴۹۰) کو نصیحت کی تھی کہ وہ حکومت میں چار شعبوں پر خاص توجہ دے۔ یہ چار شعبے بغرا خان کے خیال میں حکومت کے چار ستون ہیں۔

پہلا: دیوان وزارت

دوسرا: دیوان رسالت

تیسرا: دیوان عرضداشت

چوتھا: دیوان انشاء

دیوان انشا کا ذمہ دار دبیرالممالک یا دبیرالخاص کہلاتا تھا اور اسے تاج الملوک یا عمدۃ الملوک کا خطاب حاصل تھا۔ دبیر خاص ہی حکومت کے گورنروں سے رابطہ کا ذریعہ تھا اور اہم خط و کتابت اسی کے دفتر سے عمل میں آتی تھی۔ دبیرالممالک کی حیثیت میں خلجیوں کے عہد میں قابل قدر اضافہ ہوا اور

ہندوستان میں یہ شعبہ مغلوں کی حکومت میں بھی اہمیت کا حامل رہا۔ اس شعبے میں جو تحریریں لکھی جاتی تھیں وہ موضوع کے اعتبار سے درج ذیل تھیں:

منشور، فرمان، فتح نامہ، عہد نامہ، مثال، مکتوب، تہنیت نامہ، تعزیت نامہ، رقعہ اور عرض۔

شاہ جہاں کے زمانے میں منشی چندر بھان برہمن نے اپنے خطوط کا ایک مجموعہ خود بادشاہ وقت کی فرمائش پر مرتب کیا جو منشآت برہمن کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مطبوعہ منشآت کی پیش گفتار میں جو ۲۹ مآخذ کی بنیاد پر لکھی گئی ہے، پروفیسر شریف حسین قاسمی نے برہمن کی زندگی اور علمی و ادبی کارناموں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ مرتب کے بقول برہمن ابن دھرم داس لاہور میں پیدا ہوا اور اسی تاریخی شہر کے ایک علاقے نیولا میں سکونت پذیر رہا۔ یہی علاقہ اب نولکھا کہلاتا ہے۔ برہمن فارسی کا وہ پہلا ہندو شاعر ہے جس کا دیوان ملتا ہے اور شائع ہو چکا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد برہمن نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو وہ سب سے پہلے شاہجہاں کے ایک معروف فاضل منصب دار ملا شکراللہ شیرازی ملقب بہ افضل خان سے وابستہ ہوا۔ افضل خان کی راہنمائی، قدردانی اور سرپرستی میں وہ پروان چڑھا۔ افضل خان اس پر بہت مہربان تھا۔ اس نے برہمن کی اپنے ایک شاگرد کی طرح تربیت کی اسے قلم و قلمدان عنایت کیا۔ خوش نویسی میں بھی برہمن کی تربیت کی۔ برہمن شاہجہاں اور اس کے لڑکے داراشکوہ اور دیگر منصب داروں سے بھی منشی کی حیثیت سے وابستہ رہا تھا اور آخر کار دیوان کل کے اعلیٰ عہدہ پر فائض ہوا۔

منشآت برہمن میں ۱۱۹ عرضداشتیں اور خطوط ہیں جو برہمن نے شاہجہاں، اورنگ زیب اور اپنے دور کے دیگر منصب داروں، دوستوں، شاگردوں اور اہل خاندان کو لکھے ہیں۔ ان میں بیشتر ذاتی خطوط ہیں اور برہمن کے خطوط کے مخاطبین سے قریبی اور بے تکلف تعلقات کا پتہ دیتے ہیں۔

یہ خطوط تاریخی، ادبی اور سیاسی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہاں کا دور علم و فضل کی گرم بازاری کا دور تھا۔ برہمن شاہجہاں کا ایک معتبر منشی تھا۔ دربار سے اسے رائے کا خطاب بھی ملا تھا۔ برہمن کے والد کا انتقال ہوا تو شاہجہاں نے شخصاً تعزیت کی۔ برہمن پر شاہجہاں کے اعتبار کا یہ عالم تھا کہ اس نے برہمن کو ۱۶۵۴ میں اپنے خاص سفیر کی حیثیت سے اودے پور بھیجا جہاں اس نے رانا راج سنگھ کو شاہجہاں کی اطاعت پر آمادہ کیا۔ برہمن نے منشآت کے علاوہ دیگر متعدد آثار یادگار چھوڑے ہیں جن کا مختصر مگر جامع تعارف قاسمی صاحب نے اپنے مقدمہ

میں کرایا ہے۔

منشآت میں شامل خطوط کے مطالب سے یہ اہم بات واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں ہندو، مسلمان علمی و سماجی ترقی کے لئے ایک دوسرے کی مدد و راہنمائی کرتے تھے۔ فارسی زبان و ادب کا بول بالا تھا۔ برہمن عرفان دوست شخص تھا وہ تہذیب نفس اور اخلاق حسنہ کو اہمیت دیتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو لکھا کہ اٹھنے بیٹھنے کے طریقے، حسن سلوک اور بدی کے بدلے نیکی زندگی کے بنیادی اصول ہیں۔ ان اخلاقی محاسن کے اکتساب کے لئے اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، گلستان و بوستان سعدی کا مطالعہ ضروری ہے۔ منشآت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے دور میں مذہب کی مکمل آزادی تھی۔ برہمن کو اپنی 'زناروداری' پر فخر تھا اور اس کو، اظہار کی آزادی تھی۔

منشآت سے بعض ایسی اطلاعات بھی حاصل ہوتی ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے بہ مشکل ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر روضۂ منورہ (شاید مراد تاج محل ہے) میں مجلس مولود کا ہر سال انعقاد ہوتا تھا۔ برہمن نے لکھا ہے کہ سترہ ذی قعدہ کی رات کو مجلس مولود منعقد ہوئی جس میں عمدۃ الملک وزیر خاں کے علاوہ دیگر منصبدار شریک ہوئے۔ علما، عرفا، حافظان قرآن اور مولود خواں بھی شریک مجلس رہے۔ چھ ہزار روپے اُن پر خرچ ہوئے۔ مستحقوں کی مالی امداد بھی کی گئی۔

پروفیسر قاسمی صاحب نے منشآت برہمن کو نہایت سلیقے اور علمی انداز میں مرتب کیا ہے۔ اسے مرتب کرنے میں قاسمی صاحب نے منشآت کے پانچ نسبتاً اہم مخطوطات سے استفادہ کیا ہے۔ اختلاف قرأت کی حاشیے میں نشاندہی کی ہے۔ اہم نکات کی صراحت بھی کی گئی ہے اور متن میں شامل اہم اشخاص و مقامات وغیرہ پر تعلیقات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

منشآت میں شامل کون سے خطوط برہمن کے دیگر آثار خاص طور پر چہارچمن میں بھی ملتے ہیں، ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ برہمن نے اپنے دور کے رواج کے مطابق اپنی نثر میں جا بجا اپنے اور دوسروں کے حسب حال اشعار نقل کئے ہیں۔ پروفیسر قاسمی نے ان کا استخراج کیا ہے۔ خود برہمن کے منظوم کلام کو اس کے مطبوعہ دیوان سے مقابلے کے بعد، اختلاف قرأت کو بھی حاشیے میں درج کیا ہے۔

جہاں یہ کتاب اپنے مشتملات کے لحاظ سے اہم ہے وہاں قاسمی صاحب کی ترتیب و تحشیے نے بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

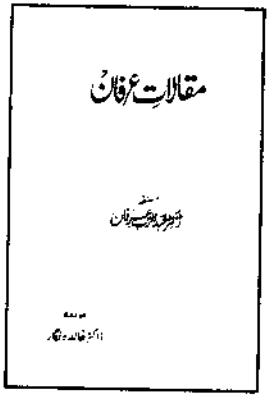

کتاب کا نام	:	مقالات عرفان
مصنف	:	ڈاکٹر عبدالرب عرفان
ترتیب	:	ڈاکٹر خالدہ نگار
ناشر	:	ڈاکٹر عشرت جاوید، نیا گودام، کامٹی
قیمت	:	۴۰۰ روپئے

ڈاکٹر عبدالرّب عرفان صاحب کے ۱۹ اردو، فارسی مقالات کو ان کی شاگرد ڈاکٹر خالدہ نگار نے ''مقالات عرفان'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرّب عرفان فارسی زبان و ادب کے ایک بڑے عالم تھے جنہوں نے خاموشی مگر خلوص سے اپنی پوری زندگی علمی و تحقیقی کاموں میں بسر کی۔ ان کے مقالات ہندستان کی بیشتر موقر علمی و ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے اس لئے ان کے نام سے تو صاحبان علم و ادب واقف تھے، لیکن کم ہی ہیں ایسے حضرات جنہوں نے انہیں دیکھا ہو۔ وہ جلسے جلوس کے آدمی تھے ہی نہیں، عرفان صاحب کامٹی، مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم پائی۔ ناگپور یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی۔ ''نعمت خان عالی: عہد، شخصیت اور کارنامے'' آپ کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا۔ عرفان صاحب مرحوم تعلیمی سطح پر ہمیشہ اپنے اساتذہ کے لئے قابل فخر رہے۔ آپ نے خطاطی کی مشق بھی کی تھی۔ ناگپور یونیورسٹی میں فارسی شعبے سے متعلق رہے اور ۳۰ اپریل ۲۰۰۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

عرفان صاحب نے بیشتر وقت فارسی ادب سے متعلق مآخذ کے مطالعے میں گذارا، اس لئے ان کے مقالات فارسی ادب کے میدان میں ان کے وسیع اور گہرے مطالعے کے غماز ہیں۔

مقالات عرفان میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

کلیات دواوین خسرو کا ایک قلمی نسخہ، چہار مقالہ میں ایک محل نظر نقطہ، راحت القلوب کا ایک غیر معروف مخطوطہ، اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں، ابوطالب کلیم کے چند قطعات تاریخ، اورنگ زیب کی ہجو سے مدح تک نعمت خان عالی کا ذہنی وفکری سفر، امیر خسرو کے چند غیر مطبوعہ مقطعات، ''فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر'' میں مشمولہ ابیات کے اسقام کا جائزہ، مثنوی رمزالریاحین پر ایک تعارفی مضمون کا جائزہ، عروضی رعایت: امیر خسرو کے چند غیر مطبوعہ مقطعات کا ضمیمہ، تاریخ گوئی کی روایت کا آغاز، بررسی برخی از رباعی بای جالب توجہ ابوسعید ابوالخیر، نسخہ ای خطی کہ درست شناختہ نشد، تدوین اور طبع موزوں، حافظ کی غزلوں میں ہجو و طنز کے موارد، بدرچاچ: سلطان محمد بن تغلق کے عہد کا ایک منفرد شاعر، خواجہ حافظ شیرازی اور محمد قلی قطب شاہ، فارسی شاعری میں تسکین اوسط کا رواج اور جواز، سلطان محمد قلی قطب شاہ کی فارسی شاعری یہ تمام مقالات مصنف مرحوم کے وسیع، گہرے اور مسلسل مطالعے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی علمی وتحقیقی بصارت کا پتہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ مقالات کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے، ہر مقالہ فارسی ادب کے ایک ایسے پہلو سے بحث کرتا ہے جو اہمیت کا حامل تو ہے ہی، مزید برآں جس پر کسی دوسرے عالم نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔

مقالات کے اس مجموعے میں شامل چند مقالات کا اجمالی تعارف پیش ہے:

'کلیات دواوین امیر خسرو کا ایک قلمی نسخہ' مجموعے کا پہلا مقالہ ہے۔ یہ نسخہ انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری، کامٹی (ناگپور) میں محفوظ ہے۔ عرفان صاحب نے اس نسخے کے ظاہر و باطن کا تعارف کرایا ہے۔ یہ نسخہ جہانگیر کے دور میں کتابت ہوا تھا، اس لئے قدامت کے لحاظ سے بھی یہ ایک اہم نسخہ ہے۔ خسرو کے دواوین کی ترتیب وتصحیح کا کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک ناگزیر ماٰخذ ہے۔

'چہار مقالے میں ایک محل نظر لفظ' کے عنوان سے مصنف نے نظامی عروضی سمرقندی کی معرکۃ الآرا کتاب چہارمقالے کے مقالۂ اول کی ایک حکایت میں ایک مقام پر لفظ 'التصاف' ہے۔ چہار مقالہ ایران کے کئی معروف اساتذہ، ادبی ناقد اور محققین نے مختلف اوقات میں مرتب اور شائع کیا ہے۔ ان میں ایران کے سب سے معروف محقق علامہ قزوینی بھی شامل ہیں۔ ان سب کے مرتبہ متن میں لفظ 'انصاف' ہی درج ہے، لیکن عرفان صاحب نے عبارت کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر یہ محسوس کیا ہے کہ یہ لفظ 'التصاف' ہے 'انصاف' نہیں۔

نعمت خان عالی، اس کے دور اور اس کے کارناموں سے عرفان صاحب کا خاص تعلق ہے چوں کہ اورنگ زیب کے دور کے اسی اہم ادبی اور علمی شخص کی زندگی اور کارناموں پر عرفان صاحب نے تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ زیرِ نظر تبصرہ مجموعۂ مقالات میں عرفان صاحب کے تین مقالات نعمت خان عالی اور اس کے آثار پر ہیں۔ ایک مضمون میں عالی کی ایک مثنوی راحت القلوب کے کتابخانۂ سالار جنگ کے خطی نسخے کا تعارف کرایا گیا ہے، دوسرے میں نعمت خان عالی کی تاریخ گوئی میں مہارت اور اس کے بعض اہم قطعات تاریخ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون خاصہ کی چیز ہے۔ اس میں نعمت خان عالی کی اورنگ زیب کی ہجو سے مدح تک کے ذہنی سفر کا تاریخی سطح پر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں ایک اہم تاریخی حقیقت کا انکشاف اور اس پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں عرفان صاحب نے نعمت خان عالی کے اورنگ زیب کی ہجو کرنے کے اسباب اور پھر اس سے تائب ہوکر بادشاہ کی مدح سرائی کی طرف رجحان کے عوامل پر ناقدانہ اور تاریخی نظر ڈالی ہے۔ اس مقالے سے عالی کی بے باکی، بے ریائی، بے غرضی پر روشنی پڑتی ہے، اسی کے ساتھ اورنگ زیب کی مردم شناسی، رواداری، حلم و بردباری، صبر و تحمل، اغماض و چشم پوشی اور امتیازی عالی ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے۔

''فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر'' اور ''رمز الریاحین کا تعارف'' اصل میں وہ دو مضامین ہیں جو معارف، اعظم گڑھ میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں بعض تسامحات کا عرفان صاحب نے دو مضامین میں جائزہ لیا ہے اور صحیح صورت حال کا تعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ توجہ طلب اور قابل ستایش بات یہ ہے کہ اپنی تنقید میں عرفان صاحب نے سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور طرف مقابل کی دل شکنی سے احتراز کیا ہے کہ یہی علمی رویہ ہے۔

عرفان صاحب کو فارسی میں تاریخ گوئی کے فن سے بھی تعلق خاطر تھا۔ وہ خود بھی برمحل تاریخی قطعات کہتے تھے۔ ان کے ہمکار پروفیسر سید عبدالرحیم صاحب مرحوم، کالج کے پرنسپل ہوئے تو عرفان صاحب انہیں مبارک باد دینے ان کے کمرے میں گئے اور کہا: ''پرنسپل ڈاکٹر سید عبدالرحیم'' آپ کے پرنسپل بننے کی تاریخ ہے۔ تاریخ گوئی سے اسی فطری لگاؤ اور مناسبت کی وجہ سے تاریخ گوئی اور قطعات تاریخ سے متعلق ان کے مقالات اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین سے تاریخ گوئی کے فن کی تاریخ وغیرہ پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

بررسی برخی از رباعی های جالب توجہ ابوسعید ابوالخیر اور نسخہ ای خطی کہ درست شناختہ نشد عرفان

صاحب کے دو فارسی مضامین ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مرحوم کو اپنے مافی الضمیر کو اردو کی طرح فارسی میں بھی پیش کرنے پر قدرت حاصل تھی اور فارسی بھی جدید۔

''فارسی میں تسکین اوسط کا رواج اور جواز'' نہایت علمی مقالہ ہے۔ اس میں فارسی کے شعری اوزان کے ایک نازک اور پیچیدہ پہلو کو فنی طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ مقالہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف کو اس دشوار فن پر بھی قدرت حاصل تھی۔

مجموعے میں شامل دوسرے مقالات بھی اس طرح فارسی زبان و ادب کے کسی نہ کسی اہم ادبی اور علمی پہلو سے بحث اور مصنف کے تبحر علمی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

beings especially the Arabs known for killing their own daughters with the fear of property distribution.

Causes of Islamic Wars - by: Allama Syed Muhammad Sadiq

This is a well known fact that Islam persued its divine goal and object for guiding the humanity towards the right path of Almighty i.e. a complete submission of will to the commandment of God. The Prophet (P.B.U.H.) was subjected to inhuman torturing, which he tolerated but never indulged in offensive or revengeful acts. After his sad demise, various Islamic groups actively engaged themselves in such methods of Islamic publicity, which were not in accordance with the tenets and principles of Islam. The enemies of Islam, by making best use of this deviation, related the victories of Islam with sword and deliberately ignored the spiritual values of this divine message. The writer has successfully presented a brief study of Islamic wars.

Letters of the Prophet - by: Molavi Muhammad Baqir

The Prophet of Islam Hazrat Muhammad (P.B.U.H.) made all possible efforts to convey the divine message of Islam. He had to face a lot of oppressive activities performed by the enemies of Islam but continued his divine mission of inviting the people towards the right path of Islam by obeying Him, not His creations. For this purpose he wrote letters to the heads of non-Islamic states. The writer of this article presented a detailed and critical study of those letters.

Character and Personality of the Holy Prophet - by: Prof. Shah Mohammad Wasim

The top ranking scholars from all over the world have paid glorious tributes to the Prophet of Islam by writing remarkable books and articles. Even Almighty praised the character, moral behaviour and exalted personality of Hazrat Muhammad (P.B.U.H.) The enemies of Islam tried to do some mischief against Islam and Muslims by publishing some carricatures and cartoons. Even the leader of the Catholic world indulged himself in such shameful activities but all these efforts proved of no avail. The human world is fully aware of the fact that Prophet Muhammad's character and personality was admired not only by top ranking orientalists but also by Almighty Allah in holy Quran and by Hazrat Ali (A.S.) in his remarkable sermons compiled as Nahjul Balagah.

Miracles of the Holy Prophet in the light of Modern Sciences - by: Dr. Syed Mahmoodul Hasan Rizvi

Modern age is the age of scientific and technological development all over the globe. Due to large scale of progress in the information technology, the world has now been converted into global village. The second impact of this development may be felt in view of the growing debate and discussions on various religious beliefs. People have started evaluating even their religious beliefs by reasoning and logic. The writer has given a brief study of theProphet's miracles.

Abstract of few articles

Conquest of Mecca - by: Prof. Ehtesham Husain

The construction of Ka'ba (The House of God) in Mecca by Hazrat Ibrahim and Hazrat Ismail (A.S.) added to the glory of this pious city, as this event speaks of a turning point in human civilization because the founder of this pious building had not only broken the stone and wooden idols but also invited the people towards monotheism, when majority of them were worshipping sun and moon. This is something very surprising that after centuries together the House of God was converted into a centre of idols again. The Prophet of Islam fought against the evil forces and again emerged victorious over Mecca without any clashes and bloodshed.

Ethical and Political Aspects of Peace Treaty of Hudaibiyeh - by:Allama Zeeshan Haider Jawadi

The Prophet of Islam (P.B.U.H.) decided to pay visit to Mecca as a part of Umrah ceremony. He was accompanied by 1400 followers of Islam. The enemies of Islam did not allow them to enter Mecca, as they were of the view that Muslims will attack them. The Prophet by making use of his political and ethical capabilities, made them to believe that Muslims do not intend to fight a war and made them ready to sign Hudaibiyeh Peace Agreement, which in fact was a no war pact for a period of ten years.

A Political Review on the Prophet's Character - by: Mirza Jafar Husain

The Political Science, during the last 14 centuries of its development, has presented various methods and techniques to evaluate the performance of a State or Government but the performance of Islam can not be evaluated on the basis of those principles as Islam advocates rule of Almighty over the mankind by persuing the Divine law. Islam came to forge unity among the people and not cause separation. Islam advocates for brotherhood among the world people, which can be achieved not by sword but by the good character and exemplary behaviour and the Prophet was a model of the exalted Islamic behaviour.

The Prophet in the Rough and Rocky Path of Nationalism by:Maulana Syed Ghulam Askari

The Prophet of Islam Hazrat Muhammad (P.B.U.H.) was assigned with the most difficult task of guiding the Arab folk towards the path of salvation. In fact, Arabs were not one nation but were scattered in groups and tribes and every group or tribe was a separate nation. They all were habitual of indulging themselves in inhuman acts. The Prophet as a divine messenger had to liberate them first from their barbaric and criminal acts and at the second stage make them ready to embrace the selfless teachings of Islam, which was contrary to the selfish nature of human

Editorial :

The Valuable legacy of Holy Prophet (P.B.U.H.)

The Prophet of Islam (P.B.U.H.) started the mission of Islamic propagation by declaring "monotheism" as the basic principle of this divine religion at a time when polytheism was prevailing among the people of the period as individuals, families and tribes had incarved the idols of their choice. This finally used to result in bloody clashes and prolonged disputes among the people. In fact, the Prophet had to face difficulties and hardships, as he openly condemned the act of polytheism, which, according to him, is like moving a black ant on black stone rock. During his life, he made all possible efforts to popularize Islam by his valuable sacrifices.

In the last paragraph of this editorial, Dr. Abdul Hamid Ziaie, the Chief Editor while expressing thanks and admiring the efforts of his predecessor Mr. Mohammad Husain Mozaffari announced some basic changes to be made in the next edition of Rah-e-Islam. He further requests to the scholars to send their articles for the next edition of this magazine which is dedicated to the memory of Maulana Jalaluddin Rumi in order to have a glance at religion through Culture, Civilization, Arts and Aesthetics and finally through Gnosticism and Mysticism.

RAH-E-ISLAM

A Quarterly Research Journal of Islamic and Cultural Studies

No. 205, July - September, 2007. R. N. I. No. 4914788

Merciful Prophet Hazrat Muhammad Mustafa (P.B.U.H)

Chief Editor

Dr. Syed Abdul Hamid Ziaei

Culture House of the Islamic Republic of Iran

18, Tilak Marg, New Delhi - 110001

Phone : 23383232. 33, 34 fax: 23387547

newdelhi@icro.ir

http://newdelhi.icro.ir